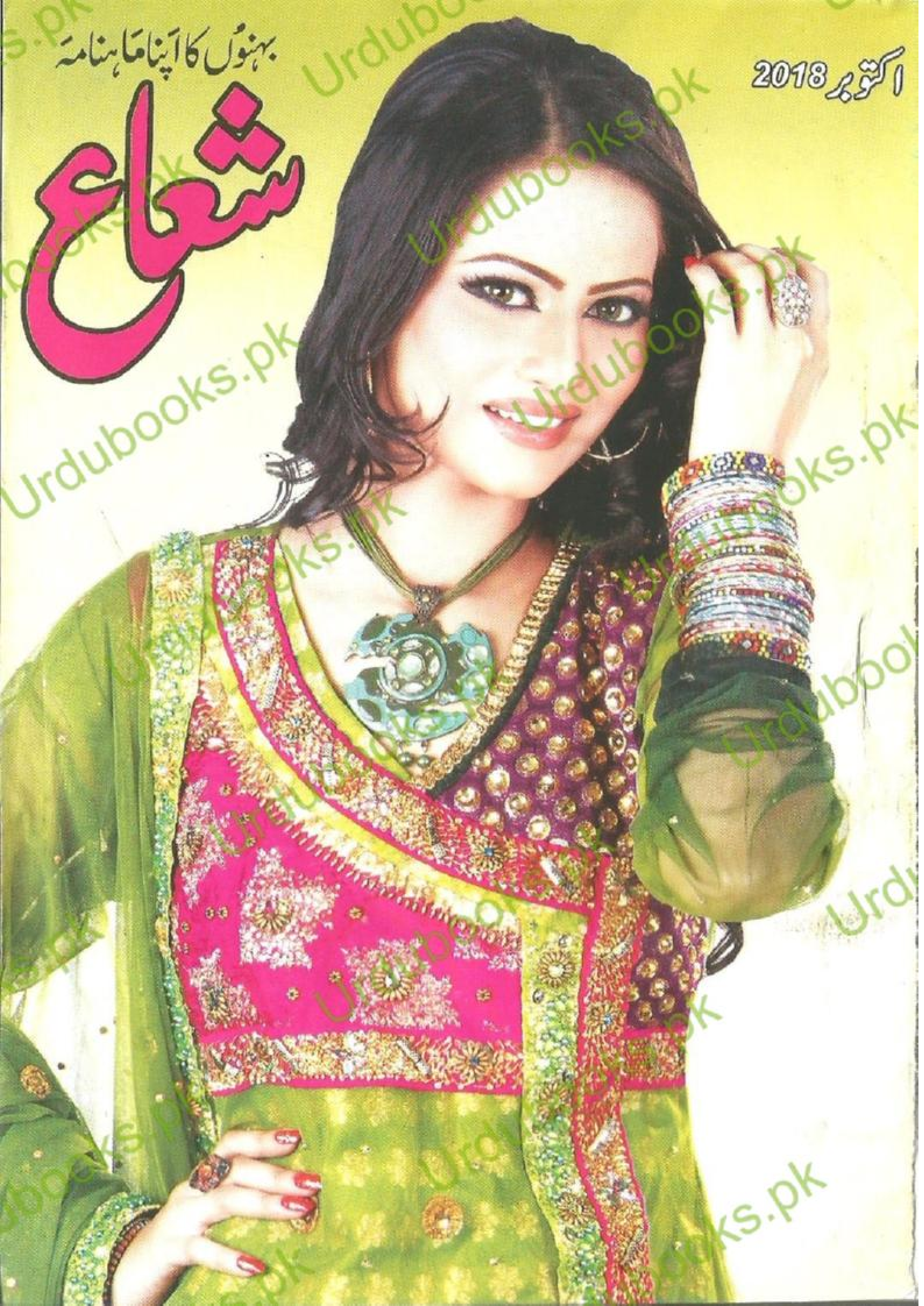

Urdubooks.pk

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37- اردو بازار کراچی

بانی و مدیرِ اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیرِ منتظم — آذر ریاض

مدیرۂ اعزازی — امت الصبور

فلم ٹیلی وژن — شاہین رشید

اشتہارات — خالدہ جیلانی

قانونی مشیر — نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

MEMBER
APNS
CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

5

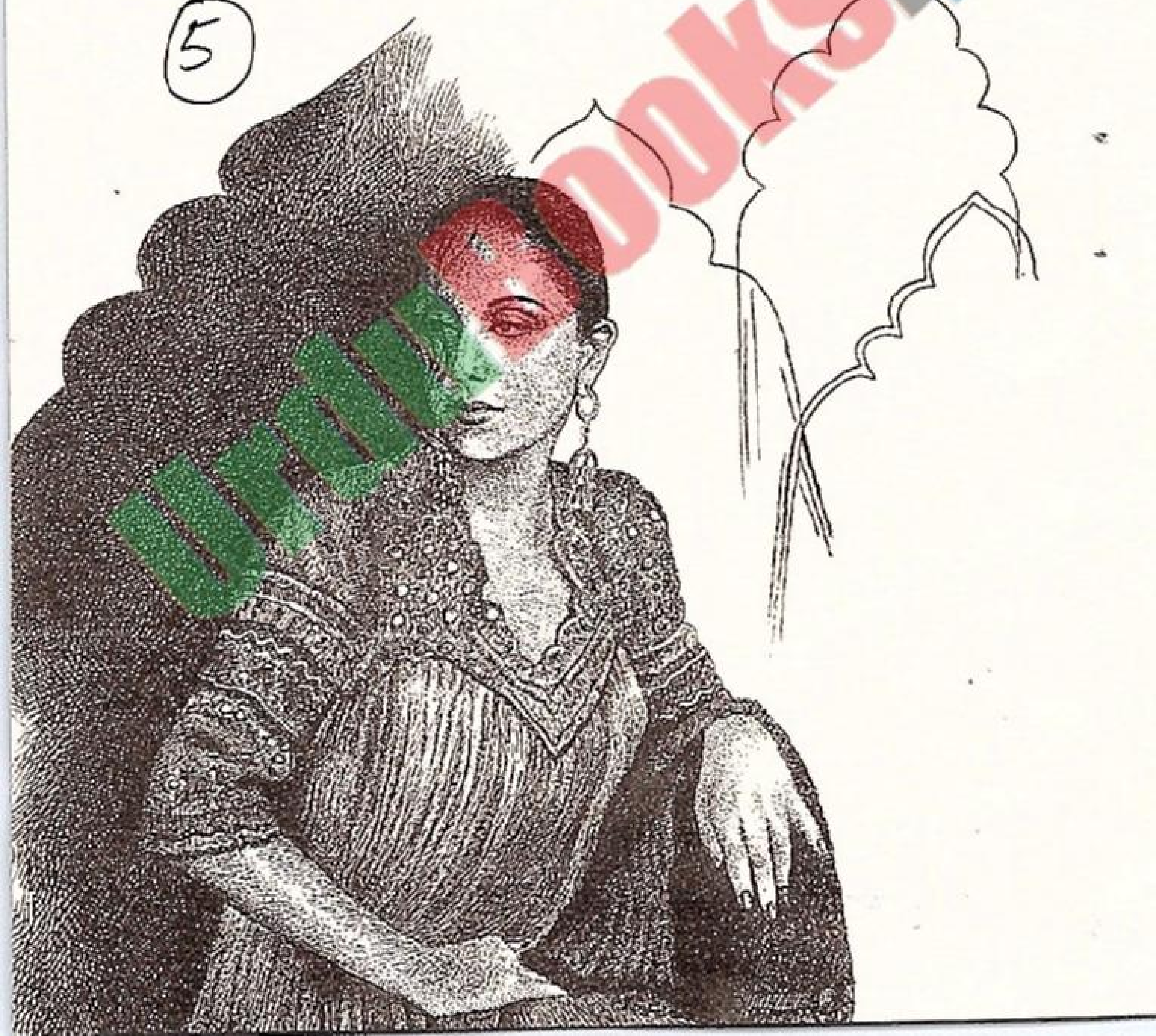

urdubooks.pk

پہلی شعاع	رضیہ جمیل	8
حمد	نعمان فاروق	9
نعت	خورشید اقبال حیدر	9
نبی کی باتیں	ادارہ	10

انٹرویو

فواد خان	شاہین رشید	22
دستک	شاہین رشید	15
جب تجھ سے ناتا	ارم احمد	19

ناول

شام کی حویلی میں	رخسانہ نگار عدنان	200
شہرزاد	صائمہ اکرم	36

مکمل ناول

موچینگ	سحر ساجد	144
دوسری اور آخری محبت	سدرۃ المنتہیٰ	100

ناولٹ

شہلا اشکور	عاصمہ حسین	82
حاصل لاحاصل	ثمرہ بخاری	187

افسانے

یار دل دار	افشین نعیم	70
چور دروازہ	کشف بلوچ	222
بدلتے رشتے	عندلیب زہرا	78
جانا کہاں	فرح حسین	137
رنگ دے میرے	فریحہ عبدالرشید	233
آشیانہ	سویرا فلک	230

نظمیں غزلیں

غزل	شکیب جلالی	240
غزل	علی اکبر عباس	241
غزل	سلیم کوثر	240
غزل	بشیر احمد بشیر	241

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے
subscriptions@khawateendigest.com

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جا سکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔

UrduBooks.pk

7

مستقل سلسلے

خط آپ کے	رضیہ جمیل	26
مسکراہٹیں	ادارہ	242
آئینہ خانے میں	واصفہ سہیل	248
بالوں سے خوشبو آئے	شگفتہ جاہ	244
کھلتا کسی پہ	خالدہ جیلانی	247
تاریخ کے جھروکے	امت الصبور	252
موسم کے پکوان	خالدہ جیلانی	256
خوبصورت تمنے	ادارہ	258

اکتوبر 2018
جلد 33 شمارہ 2
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

UrduBooks.pk

پہلی شعاع

شعاع اکتوبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

قوموں کی زندگی میں عورت کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ ایک عفت مآب اعلا اخلاق و کردار کی حامل عورت گھر کو جنت بنا دیتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں عورت کو ہمیشہ کمتر اور کمزور سمجھا گیا۔ اُن خواتین کی صلاحیتوں کو تو پھر بھی تسلیم کیا جاتا ہے جو گھر سے باہر نکل کر مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں۔ خود کو منوا رہی ہیں لیکن بدقسمتی سے گھر کی چار دیواری میں رہنے والی، گھر اور بچوں کو سنبھالنے والی عورت کی صلاحیتوں کو، اس کے کام کو آج بھی تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اسے وہ عزت و توقیر نہیں ملتی جس کی وہ مستحق ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ گھر کی چار دیواری میں رہنے والی عورت کسی بھی لحاظ سے کمتر اور کمزور نہیں ہے۔ وہ اپنے باپ، بھائی اور شوہر کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ گھر کی چار دیواری میں رہنے والی عام سی خواتین نے ضرورت پڑنے پر بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ انہوں نے مردوں کے دوش بدوش جنگوں میں بھی حصہ لیا اور اپنی عقل و دانش کی بدولت بھی شوہر کی بہترین مشیر و مددگار ثابت ہوئیں۔

کلثوم نواز شریف گھر کی چار دیواری میں رہنے والی مشرقی روایات کی حامل گھریلو خاتون تھیں۔ ایک روایتی مشرقی عورت کی طرح وہ اپنے شوہر کی پوری تابعدار تھیں لیکن جب ان کے شوہر پر افتاد آئی۔ انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو وہ میدان عمل میں نظر آئیں۔ اس وقت جب سب ان کے شوہر کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ وہ اپنے شوہر کے لیے گھر سے نکلیں اور جرأت و بہادری کی تاریخ رقم کی۔ اور جب ان کے شوہر ابتلاء و مصیبت سے نکلے تو انہوں نے پھر پس پشت رہ کر گھر اور بچوں کی ذمہ داریاں سنبھال لیں لیکن انہوں نے ثابت کر دیا کہ اپنی حدود میں رہتے ہوئے بھی ایک خاتون خانہ بہت کچھ کر سکتی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ گھر سے باہر نکل کر مردوں والے کام کر کے اپنی صلاحیتوں کو منوایا جائے۔

عورت کا اوّلین فرض گھر سنبھالنا اور بچوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ اولاد کی پہلی تربیت گاہ ماں کی آغوش ہوتی ہے اور اچھی مائیں ہی اچھی قوم کو جنم دیتی ہیں۔ ایک خاتون خانہ یہ فریضہ اسی وقت بحسن و خوبی انجام دے سکتی ہے جب اس کو وہ عزت، احترام اور مقام دیا جائے جس کی وہ مستحق ہے۔ اس کی صلاحیتوں اور کام کو تسلیم کیا جائے۔

اس شمارے میں،

- سحر ساجد کا مکمل ناول ۔ موچنگ،
- سدرۃ المنتہیٰ کا مکمل ناول ۔ دوسری اور آخری محبت،
- ثمرہ بخاری اور عاصمہ فرمین کے ناولٹ،
- افشین نعیم، عندلیب زہرا، فرح حسین، کشف بلوچ، سویرا فلک اور فریحہ عبدالرشید کے افسانے،
- رخسانہ نگار عدنان اور صائمہ اکرم کے ناول،
- مشہور ٹی وی فنکار فواد خان سے ملاقات،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا، آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔ ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

ہے نرغۂ اعدا میں کہ تنہا بھی بہت ہے
دل کو تری رحمت پہ بھروسا بھی بہت ہے

ہے غیر کی چاہت کا ٹھکانا بھی دلوں میں
اور ان کو ترے عشق کا دعویٰ بھی بہت ہے

دے ان کو مگر کوئی بشارت ہی کا موسم
دکھ جن کے مقدر میں لکھا بھی بہت ہے

کیوں کر وہ سمجھ پائیں ترے حسن کو یارب
دل جن کا ہوس گرد سے میلا بھی بہت ہے

رک جائے قلم حرفِ ثنا پر مرا آ کر
ہر چند سخن کا یہ سلیقہ بھی بہت ہے

منزل کا پتا دے مجھے اک عمر سے میں نے
بے فیض سفر درد کا جھیلا بھی بہت ہے

بخشش کے یہ لائق نہیں تو پھر بھی کرم کر
نعمان اکیلا بھی ہے پیاسا بھی بہت ہے

نعمان فاروق

سارے موسم زمیں آسماں کے لیے
آپؐ کی رحمتیں دو جہاں کے لیے

آپؐ کی ذات ہے شرطِ باغ و بہار
زندگی کے ہر اک گلستاں کے لیے

آپؐ کے نام کا ہے سہارا بہت
اس سفر میں ہر اک امتحاں کے لیے

آج بھی آپؐ کے علم کی رہبری
ہے ضروری ہر اک امتحاں کے لیے

آپؐ کی ذات کا ہے سہارا ہمیں
آپؐ کی ہے اماں بے اماں کے لیے

آپؐ کی رحمتیں موجزن ہیں سدا
اس زمیں کے لیے آسماں کے لیے

خورشید اقبال حیدر

پیارے نبی کی پیاری باتیں

تین گرہیں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"شیطان تم میں سے ہر ایک کی گدی پر، جب وہ سوتا ہے، تین گرہیں لگا دیتا ہے۔ ہر گرہ پر وہ منتر پڑھتا (افسوں پھونکتا) ہے: تیرے لیے رات بہت لمبی ہے، بس خوب سو۔ اگر وہ بیدار ہو کر اللہ کا ذکر کرتا ہے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے۔ پھر اگر وہ وضو بھی کرے تو ایک گرہ اور کھل جاتی ہے۔ پھر اگر اس نے نماز بھی پڑھی تو تمام گرہیں کھل جاتی ہیں اور وہ صبح اس حال میں کرتا ہے کہ وہ ہشاش بشاش اور پاکیزہ نفس ہوتا ہے، ورنہ اس کی صبح اس حال میں ہوتی ہے کہ وہ خبیث النفس اور سست ہوتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

یہ گرہ لگانا بھی حقیقتاً ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے جادوگر اپنا عمل سحر کرتا ہے۔ شیطان اپنے اس عمل سے رات کو اللہ کی عبادت کے لیے اٹھنے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔

بہرحال شیطان انسان کو اللہ کی عبادت سے روکنے کے لیے اپنا جتن کرتا ہے، جو شخص رات کو اٹھ کر اللہ کی عبادت کرتا ہے تو وہ شیطان کی چال کو ناکام بنا دیتا ہے، بصورت دیگر شیطان انسان کو اپنے دام میں پھنسا لیتا ہے۔

سلامتی کے ساتھ

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے لوگو! سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ اور رات کو نماز پڑھو جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں، (اس طرح) تم جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل:

1- اس میں ان لوگوں کے لیے بشارت ہے جو ذوق و شوق سے مذکورہ کام کرتے ہیں۔

2- جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہونے کا مطلب ہے کہ جہنم کی سزا بھگتے بغیر ہی ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے جنت میں داخل فرما دے گا۔ واللہ اعلم۔

فضیلت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"رمضان کے بعد سب سے زیادہ فضیلت والے روزے، اللہ کے مہینے محرم کے روزے ہیں۔ اور فرض نماز کے بعد سب سے زیادہ فضیلت والی نماز، رات کی نماز ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل: محرم کے مہینے کی اضافت اللہ کی طرف کی گئی ہے۔ جس سے اس ماہ محرم کا شرف و امتیاز واضح ہے۔ اس میں نفلی روزوں میں سب سے افضل روزوں اور نفلی نمازوں میں سب سے افضل نماز کا بیان ہے۔

رات کی نماز

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"رات کی نماز دو دو رکعت ہے، چنانچہ جب

UrduBooks.pk

تجھے صبح صادق کا اندیشہ ہو تو ایک رکعت کے ساتھ وتر (طاق) بنا لے (ایک رکعت وتر پڑھ لے۔" (بخاری ومسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کو دو دو رکعت ادا فرماتے اور ایک رکعت وتر پڑھتے۔ (بخاری ومسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مہینے میں تو اس طرح روزہ رکھنا چھوڑ دیتے کہ ہم گمان کرتے کہ اس مہینے میں آپ روزہ رکھیں گے ہی نہیں، اور کبھی ایسے روزہ رکھتے کہ ہم گمان کرتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس مہینے میں کوئی روزہ چھوڑیں گے ہی نہیں۔ اور (اسی طرح آپ کا حال یہ تھا کہ) اگر تم چاہتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کے وقت نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں تو تم (پڑھتے ہوئے) دیکھ لیتے۔ اور اگر تم چاہتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سویا ہوا دیکھیں تو (سویا ہوا) دیکھ لیتے۔" (بخاری)

فائدہ: مطلب یہ ہے کہ نفلی روزے ہوں یا رات کی نفلی نماز (قیام اللیل) ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایک مستقل معمول نہیں تھا، کسی مہینے ایسا ہوتا کہ آپ روزہ نہ رکھتے حتیٰ کہ مہینہ ختم ہونے کے قریب ہو جاتا، تو آخر میں آپ روزے رکھنا شروع کر دیتے۔ اور کبھی مسلسل روزہ رکھتے حتیٰ کہ گمان ہوتا کہ پورا مہینہ ہی آپ روزے رکھیں گے مگر آپ روزہ ترک فرما دیتے۔

اسی طرح تہجد کی نماز میں آپ کا معلوم تھا، کبھی آپ اسے رات کے پہلے حصے میں، کبھی دوسرے حصے میں اور کبھی آخری، تیسرے حصے میں پڑھتے۔ اس طرح آپ کو رات کے ہر حصے میں نماز پڑھتے ہوئے بھی اور سوتے ہوئے بھی پایا گیا۔

گیارہ رکعات

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گیارہ رکعت پڑھا کرتے تھے۔ اس سے حضرت عائشہ کی مراد رات کی نماز ہے۔ اپنا سر اٹھانے سے پہلے اتنا (لمبا) سجدہ کرتے کہ جتنی دیر میں تم میں سے ایک آدمی پچاس آیتیں پڑھ لے۔ اور فجر کی نماز سے پہلے دو رکعت پڑھتے، پھر اپنی دائیں کروٹ لیٹ جاتے، یہاں تک کہ آپ کے پاس نماز کی منادی کرنے والا آتا۔ (بخاری)

فائدہ: اس میں فجر کی دو سنتیں پڑھنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں کروٹ پر لیٹنے کے علاوہ نماز تہجد میں لمبے سجدے کرنے کا بیان ہے کیونکہ اس حالت میں انسان اللہ کے بہت قریب ہوتا ہے۔ نیز اس حالت میں غایت خشوع کا بھی اظہار ہے جو اللہ کو بہت پسند ہے۔ علاوہ ازیں سجدے میں دعا کی قبولیت کا امکان بھی زیادہ ہے۔

تہجد

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں (تہجد) گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔ (پہلے) چار رکعت پڑھتے، پس نہ پوچھو کہ وہ کتنی حسین اور کتنی لمبی ہوتی تھیں۔ پھر چار رکعت پڑھتے، پس ان کے حسن اور لمبائی کے بارے میں مت پوچھو۔ پھر تین رکعت (وتر) پڑھتے۔

میں نے کہا: "اے اللہ کے رسول! کیا وتر پڑھنے سے پہلے آپ سوتے ہیں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے عائشہ! تحقیق میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن میرا دل نہیں سوتا۔" (بخاری ومسلم)

فوائد ومسائل:

1- دل نہیں سوتا کا مطلب ہے کہ دل بیدار رہتا تھا، اس لیے آپ کا وضو بھی نہیں ٹوٹتا تھا۔ اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہے۔

2- اس حدیث میں نماز کو اس کے آداب و شرائط کے مطابق خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کرنے کی تاکید ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ

UrduBooks.pk

یہی ہے۔ سنت کے مطابق اطمینان وسکون کے ساتھ نماز پڑھنا ہی نماز کا حسن ہے۔

3۔ جس شخص کو اپنی بابت آخر شب میں اٹھنے کا یقین ہو تو اسے چاہیے کہ نماز وتر عشا کے ساتھ نہ پڑھے بلکہ تہجد کے آخر میں پڑھے، بصورت دیگر عشاء کی نماز کے ساتھ ہی پڑھ لے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کے پہلے حصے میں سو جاتے تھے اور رات کے آخری حصے میں اٹھتے اور نماز پڑھتے۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ: اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثریتی معمول کا بیان ہے اور یہی آخر شب تہجد کا سب سے بہتر وقت ہے۔ تاہم آپ نے رات کے ابتدائی اور درمیانی حصے میں بھی قیام کیا ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں۔

میں نے ایک رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم برابر کھڑے رہے یہاں تک کہ میں نے ایک برے کام کا ارادہ کیا۔"

ان سے پوچھا گیا:

"آپ نے کس چیز کا ارادہ کیا تھا؟"

انہوں نے جواب دیا: "میں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ میں بیٹھ جاؤں اور آپ کو چھوڑ دوں۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ رات کا قیام خوب لمبا ہو، یعنی قرات، رکوع، قومہ، سجدہ ہر رکن طویل اور نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ ہو۔

2۔ نفلی نماز باجماعت جائز ہے۔

3۔ زیادہ طوالت کی صورت میں بعض علماء کے نزدیک مقتدی کا امام کی اقتدا سے الگ ہونا جائز ہے۔ لیکن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے برے کام سے تعبیر کیا ہے، اس لیے اس کا جواز محل نظر ہے، تاہم احادیث میں ائمہ حضرات کو مقتدیوں کا خیال رکھنے کی تاکید کی گئی ہے جن سے اس کا جواز نکل سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

طویل قیام

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

کہ میں نے ایک رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ نے سورۃ بقرہ پڑھنی شروع کر دی۔ میں نے (دل میں) کہا:

سو آیتوں پر آپ رکوع فرمائیں گے۔ لیکن آپ نے تلاوت جاری رکھی۔ میں نے خیال کیا کہ آپ یہ سورت پوری رکعت، یعنی نماز کی دو رکعتوں میں ختم فرمائیں گے۔ لیکن آپ نے تلاوت جاری رکھی۔ پھر میں نے خیال کیا کہ آپ اس کے ساتھ (سورۃ ختم کر کے) رکوع کریں گے۔ لیکن آپ نے سورۃ نساء پڑھنی شروع کر دی اور وہ ساری پڑھ لی۔

پھر آپ نے سورۃ آل عمران کی تلاوت شروع فرما دی اور وہ بھی ساری پڑھ گئے۔ آپ ٹھہر ٹھہر کر تلاوت فرماتے۔ جب آپ ایسی آیت کے پاس سے گزرتے جس میں تسبیح کا ذکر ہوتا تو آپ (اللہ کی) تسبیح کرتے۔ اور جب کسی سوال والی آیت کے پاس سے گزرتے تو اللہ سے سوال کرتے۔ اور جب کسی پناہ مانگنے والی آیت سے گزرتے تو پناہ طلب کرتے۔

پھر آپ نے رکوع کیا اور پڑھتے رہے۔ سبحان ربی العظیم۔ آپ کا رکوع بھی آپ کے قیام کے برابر تھا۔ پھر آپ نے (رکوع سے سر اٹھایا اور) فرمایا: سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد۔ پھر آپ دیر تک کھڑے رہے، تقریباً اتنا جتنا آپ نے رکوع فرمایا تھا۔ پھر آپ نے سجدہ کیا اور (اس میں) فرمایا: سبحان ربی الاعلیٰ۔ اور آپ کا سجدہ بھی آپ کے قیام کے برابر تھا۔ (مسلم)

فوائد و مسائل:

اس سے لمبے قیام کی خوبی، نفل نماز میں جماعت

UrduBooks.pk

کا تلاوت میں سورتوں کی تقدیم وتاخیر کا جواز ثابت ہوتا ہے جس کے بعض لوگ قائل نہیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا:

''کون سی نماز افضل ہے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لمبے قیام والی نماز۔'' (مسلم)

قنوت: سے مراد قیام ہے۔

فائدہ: معلوم ہوا کہ نماز کے تمام ارکان (رکوع، سجدہ وغیرہ) لمبا ہوگا، قرآن اتنا ہی زیادہ پڑھا جائے گا، اور قرآن چونکہ افضل ذکر ہے، اس لیے طول قیام بھی افضل ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ کو سب سے زیادہ محبوب نماز حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز ہے۔ اور اللہ کو سب سے زیادہ محبوب روزہ حضرت داؤد کا روزہ ہے۔ وہ آدھی رات سوتے تھے، اس کے تیسرے حصے میں عبادت کے لیے اٹھ جاتے اور اس کے چھٹے حصے میں (پھر) سو جاتے۔ اور ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن چھوڑ دیتے (روزہ نہ رکھتے۔)''

(بخاری ومسلم)

فوائد ومسائل:

1- اس میں چونکہ اپنے آپ پر سختی کرنے سے روکا گیا ہے، حتی کہ عبادات میں بھی افراط وتعمق سے منع کیا گیا ہے، اس لیے ساری ساری رات جاگ کر عبادت کرنا یا ہمیشہ روزہ رکھنا بھی اسلام میں ممنوع اور ناپسندیدہ ہے۔

2- خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ بھی اعتدال کا بہترین نمونہ ہے۔ بنابریں اس حدیث میں حضرت داؤد علیہ السلام کے روزے اور نماز کو عنداللہ سب سے زیادہ محبوب قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس میں بھی وہ میانہ روی ہے جس کے اپنانے کی اسلام نے تاکید کی ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

''رات میں ایک گھڑی (لمحہ) ہے۔ جس مسلمان آدمی کو وہ میسر آجائے، وہ اس میں دنیا اور آخرت کے معاملے میں کسی بھلائی کا سوال کرے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور عطا فرما دیتا ہے۔ اور یہ گھڑی ہر رات کو ہوتی ہے۔'' (مسلم)

فوائد ومسائل: یہ گھڑی بھی جمعے کی گھڑی کی طرح اگرچہ غیر متعین ہے، تاہم یہ بھی بالعموم رات کی آخری گھڑیوں میں ہوتی ہے کیونکہ عبادت کا افضل وقت وہی ہے۔ اس کے ابہام میں بھی لیلۃ القدر کی طرح حکمت یہی ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ وقت اللہ کی عبادت، اس کے ذکر اور اس سے دعا ومناجات میں گزارے۔

رجل مسلم (مسلمان آدمی) سے مراد مرد اور عورت دونوں ہیں۔

دو رکعت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی شخص رات کو (عبادت کے لیے) کھڑا ہو تو وہ نماز کا آغاز دو مختصر رکعتوں سے کرے۔'' (مسلم)

قضا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درد یا کسی اور وجہ سے رات کی نماز چھوٹ جاتی تو آپ دن کو بارہ رکعتیں ادا فرماتے۔ (مسلم)

فوائد ومسائل: اس سے مراد نفل نماز ہے نہ کہ فرض۔ اس سے معلوم ہوا کہ سنتوں کی قضا درست ہے بشرطیکہ انسان اپنا معمول نہ بنائے۔

قضا

UrduBooks.pk

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص اپنے مقررہ وظیفے یا اسی قسم کی کسی چیز سے سو یا رہ جائے، پس وہ اسے فجر اور ظہر کی نماز کے درمیان پڑھ لے تو اس کے لیے لکھا جاتا ہے گویا کہ اس نے وہ رات ہی کو پڑھا ہے۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل: یہاں اس سے وہ وظیفہ مراد ہے جو انسان اپنے طور پر مقرر کر لیتا ہے، مثلاً: میں رات کو تہجد کی آٹھ رکعت پڑھا کروں گا، ہر روز ایک پارہ قرآن مجید کا پڑھوں گا یا اتنی اتنی بار اللہ کا فلاں ذکر کروں گا۔ وعلی ھذا القیاس۔

1- پھر وہ اپنے عزم کے مطابق امکانی حد تک عمل کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن اگر کسی وقت اس پر نیند کا غلبہ ہو جائے اور وہ اپنا وظیفہ پورا نہ کر سکے تو بعد میں وظیفہ پورا کر لے، اللہ کے ہاں اسے اس طرح لکھا جائے گا کہ گویا اس نے اپنے وقت ہی پر اسے پورا کیا۔

2- اس سے نفلی اعمال خیر کی قضا کا استحباب معلوم ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو رات کو اٹھ کر اللہ کی عبادت کرے اور نماز پڑھے اور اپنی بیوی کو بھی بیدار کرے، اگر وہ انکار کرے تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اللہ تعالیٰ اس عورت پر رحم فرمائے جو رات کو اٹھ کر عبادت کرے اور نماز پڑھے اور اپنے خاوند کو بھی جگائے، اگر وہ انکار کرے تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔'' (اسے ابوداود نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فائدہ: اس میں نیک میاں بیوی کا کردار بیان کیا گیا ہے، وہ نیکی اور اطاعت کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

<u>گھر والے</u>

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب آدمی رات کو اپنے گھر والوں کو بیدار کرے اور دونوں نماز پڑھیں، یا (راوی کو شک ہے) بیک وقت دو رکعتیں پڑھیں تو ان دونوں کو ذاکرین اور ذاکرات (بہت زیادہ ذکر کرنے والوں) میں لکھ دیا جاتا ہے۔'' (اسے ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: جمیعاً سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ دونوں میاں بیوی جماعت سے نفلی نماز پڑھیں۔ لیکن جمیعاً کا مطلب یہ نہیں ہے، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ دونوں نے بیک وقت نفلی نمازیں پڑھیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جماعت کے ساتھ ہی پڑھیں۔

والذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات۔ (الاحزاب 35:33) سورہ احزاب کی آیت ہے جس میں نیک مردوں اور نیک عورتوں کی صفات کا اور ان کی فضیلت اور اجر و ثواب کا ذکر ہے۔

<u>اونگھ آنا</u>

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تم میں سے کسی شخص کو نماز میں اونگھ آئے تو اسے چاہیے کہ وہ سو جائے، یہاں تک کہ اس سے اس کی نیند چلی جائے، کیونکہ جب تم میں سے کوئی اونگھتا ہوا نماز پڑھتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ استغفار کرنے کے بجائے وہ اپنے آپ کو گالی دینے لگے۔'' (بخاری و مسلم)

UrduBooks.pk

دستک دستک
دستک

شاہین رشید

مہوش حیات

"کیا حال ہیں جی؟ آج کل تو تمہارا استارہ عروج پر ہے...... کیسا لگ رہا ہے؟"

"جی...... اللہ کا شکر ہے اور اللہ کا بہت احسان ہے کہ جب سے اس فیلڈ میں آئی ہوں آگے ہی آگے گئی ہوں۔ یہ آپ سب کی محبت کا نتیجہ ہے...... اور کیسا لگ رہا ہے تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

"لوڈ ویڈنگ کا رزلٹ بہت اچھا آیا...... وجہ کیا ہوسکتی ہے۔ اداکاری، مناظر یا اسکرپٹ؟"

"میرے خیال میں سب کچھ...... اسکرپٹ جان دار ہو تو اداکاری کرنے میں مزہ آتا ہے۔ اس میں میرا کردار بہت اچھا اور چیلنجنگ تھا...... آپ کو بتاؤں کہ میرے کردار کے کئی شیڈز تھے اور مجھے ایسے ہی کردار اچھے لگتے ہیں جن میں کچھ کرنے کو ہو، اور آپ نے مناظر کی بات کی تو جس گاؤں میں ہم نے فلم شوٹ کی وہ بہت خوب صورت ہے۔ حسین مناظر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔"

"مہوش آپ کا کردار ایک پنجابی لڑکی کا ہے۔ اردو آپ کی مادری زبان ہے۔ پنجابی بولنے میں مشکل ہوئی؟"

"آپ یقین جانیے کہ میری اپنی بھی خواہش تھی کہ میں پنجابی لڑکی کا کردار ادا کروں اور اللہ تعالیٰ نے میری یہ خواہش پوری کی...... مجھے پنجابی زبان نہیں آتی مگر سمجھ لیتی ہوں۔ مگر اپنے اس کردار میں تو مجھے بولنا بھی تھا کہیں کہیں۔ مگر لہجہ پنجابی رکھنا تھا، لہٰذا میں نے لہجہ بنانے کے لیے کافی محنت کی اور پھر بنا لیا لہجہ......"

"پنجابی لڑکیاں اتنی دھان پان نہیں ہوتیں اور تم تو خاصی سلم اور اسمارٹ ہو؟"

"اب میں نے دیکھا ہے کہ پنجابی لڑکیاں بھی بہت اسمارٹ اور دبلی پتلی ہیں اور بہت پرکشش بھی ہوتی ہیں پنجابی لڑکیاں اور جب میں نے گاؤں کی لڑکی کا روپ دھارا۔ مطلب ناک میں "کیل" ڈالی، لمبا پراندہ باندھا۔ شلوار قمیض پہنا۔ ہلکا ہلکا میک اپ اور آنکھوں میں کاجل، تو مجھے اپنا روپ بہت بھایا۔ خاص طور پر چوڑیوں کی چھن چھن بہت اچھی لگتی تھی۔ گاؤں کی لڑکیوں کی شخصیت بہت جادوئی ہوتی ہے۔"

"کھیت کھلیانوں میں شوٹ کرنا کیسا لگا؟"

"بہت اچھا...... بہت مزہ آیا...... خاص طور پر کھیتوں میں ڈانس کرنے کا اپنا ہی مزہ تھا...... اور جو لوگ کبھی پنجاب نہیں گئے وہ اس فلم کو دیکھنے کے بعد یقیناً پنجاب کا رخ ضرور کریں گے کیونکہ ہمارے پنجاب کے گاؤں اور کھیت بہت خوبصورت ہیں۔ سب کچھ اوریجنل ہے۔ کھانا پینا۔ تازہ ہوا۔ ہریالی۔ لہلہاتے کھیت...... سچ میں بہت مزہ آیا۔"

"اوریجنل یعنی اصلی اور دیسی کھانے؟"

"جی...... جی...... بالکل...... دیسی انڈے...... اصلی دودھ، خالص مزے دار مکھن، گھر میں بھاگتی دوڑتی مرغیاں اور لذیذ کھانا، بہت مزہ آیا...... میرا تو وزن اچھا خاصا بڑھ گیا تھا۔ پھر اپنے اوپر جبر کیا اور وزن کم کیا۔"

"پنجاب کے اور خاص طور پر لاہور کے پکوان نہ کھائے تو پھر کچھ بھی نہ کھایا؟"

"ارے نہیں...... کھانے خوب کھائے...... کیونکہ واقعی لاہور کے کھانے نہ کھائے تو کچھ بھی نہ

UrduBooks.PK

کھایا۔ میں نے اس پوری فلم میں بہت زیادہ انجوائے کیا......اور کام کر کے بہت اچھا لگا۔"

"فلم کامیاب ہوئی، شہرت بھی خوب ملی، اب ڈراموں کو خیر باد کہہ دوگی؟"

"ارے نہیں......ڈرامے سے ابتداء کی اسے کیسے چھوڑ سکتی ہوں......بس اچھے اسکرپٹ کی منتظر ہوں۔ آج اچھا اسکرپٹ مل جائے آج سائن کردوں۔"

"آپ نے جو فلمیں فہد مصطفیٰ کے ساتھ کیں، وہ کامیاب ہوئیں......وجہ؟"

"وجہ یہ ہے کہ لوگ ہمیں پسند کرتے ہیں اور ہماری کیمسٹری ایک دوسرے سے بہت ملتی ہے۔ میں نے ہمایوں سعید کے ساتھ بھی کام کیا ہے اور کامیابی حاصل کی ہے۔"

"انڈیا سے آفرز تو آئی ہوں گی؟"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے، آفرز بہت ہیں لیکن سچ پوچھیں تو میں اپنے ملک کے ڈراموں اور فلموں میں اتنی مصروف ہوں کہ مجھے باہر کہیں جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہمیں اپنے ملک کی فلموں کو پروموٹ کرنا چاہیے۔"

"کیا آپ کو "بے نظیر بھٹو شہید" کے کردار کی بھی آفر ہوئی ہے یا ہوئی تھی؟"

"جی ہاں......ہوئی ہے اور یہ ایک مشکل کردار ہے۔ اس لیے آج کل اس پر کام کر رہی ہوں۔ ان کی شخصیت کا مطالعہ کر رہی ہوں......بس اللہ مجھے کامیاب کرے۔

"ان شاء اللہ ضرور کامیاب کرے گا۔"

زارا نور عباس

"کیا حال ہیں۔ زندگی کیسی گزر رہی ہے؟"

"جی......حال ٹھیک ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ زندگی بہترین گزر رہی ہے۔"

"شادی کے بعد لڑکیاں نام بدل لیتی ہیں۔ آپ نے نہیں بدلا؟"

"میرے خیال میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور فیلڈ میں چونکہ اس نام سے مشہور ہوں تو پھر یہی نام رہنے دیا۔"

"لمحے" سیریل آن ایئر ہے۔ کیا رسپانس مل رہا ہے؟"

"الحمدللہ بہت اچھا...... ہم کے ڈرامے تو ویسے بھی لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔"

"جوڑی وہی ہے جو "خاموشی" میں تھی؟"

"جی وہی ہے......اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بس کام اچھا ہونا چاہیے اور اس میں بلال اور میرا کردار یکسر چیلنج ہے۔ اور ہمیں بہت رسپانس مل رہا ہے۔"

"فلم کے لیے کچھ جلدی آفر نہیں آگئی کیا؟"

"دیکھ لیں......یہ تو نصیب کی بات ہے۔ مگر یہ بتادوں کہ میرا کوئی لیڈنگ رول نہیں ہے۔ بلکہ میرا سپورٹنگ رول ہے اور چونکہ ابھی ابتداء ہے......تو میں نے یہ رول اس لیے لیا کہ کیا میں فلم کے تقاضوں کو پورا کرلوں گی......اگر میری پرفارمنس اور بڑی اسکرین پر لوگوں نے مجھے پسند کیا تو پھر ان شاء اللہ بڑا رول کروں گی۔ اور ہوسکتا ہے کہ اس فلم کے بعد

UrduBooks.pk

مجھے لیڈنگ رول کی آفر آجائے۔"

"لیڈنگ رول میں کون ہے؟"

"ماہرہ خان اور شہریار منور ہیں۔"

"ڈرامہ کون سا انڈر پروڈکشن ہے...... آپ کو جلدی جلدی آفرز قبول نہیں کرنی چاہئیں کیا؟"

"میرا نہیں خیال کہ ہر وقت اسکرین پر رہنے سے شہرت میں بہت زیادہ اضافہ ہوتا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اچھا اور منفرد کام کرنے سے شہرت میں اضافہ ہوتا ہے اور اچھے اور منفرد کردار بہت مشکل سے ملتے ہیں...... اور میں بھی منفرد کردار کی ہی منتظر رہتی ہوں۔ بڑے صحیح کہتے ہیں کہ کم کام کرو مگر بہت اچھا کرو۔"

"اب تک تین سیریل آن ایئر آچکے ہیں۔ کس کا کردار بہترین لگا؟"

"لمحے تو چل رہا ہے۔ دھڑکن اور خاموشی ختم ہو چکے ہیں، سب میں کردار بہت اچھے تھے اس لیے کیے۔ مگر "ارسلہ" کا کردار میرے لیے ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوا۔ اس کے دوران اور اس کے بعد آفرز کی لائن لگ گئی...... مگر آپ کو بتایا کہ میں اس معاملے میں بہت چوزی ہوں۔"

"اپنے بارے میں کچھ بتاؤ؟"

"جی بتاتی ہوں اور یہ بھی بتاؤں کہ ایک سیریل جو انڈر پروڈکشن ہے اس کا نام "قائد" ہے اور سید جبران مرکزی رول کر رہے ہیں میرے ساتھ...... اب آپ کو بتاؤں کہ میں تین بھائیوں اور اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہوں یعنی بھائیوں کی اکلوتی بہن اور والدین کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی ہوں۔ میرے والدین نے شہزادی بنا کر میری پرورش کی ہے۔ اور میں 22 مئی 1990 کو کراچی میں پیدا ہوئی۔"

"تعلیم؟"

"جی...... میں نے بیکن یونیورسٹی سے فلم، تھیٹر اور ٹی وی میں "بی اے" کیا ہے۔ امریکہ سے فلم

میکنگ میں ڈپلومہ کیا ہے۔"

"اور وہ برانڈ؟"

"جی...... ہمارے برانڈ کا نام "زارا نور عباس کلوتھنگ" ہے اور میں جن ڈراموں میں کام کرتی ہوں اس میں اپنے ہی ڈیزائن کیے ہوئے ڈریسز پہنتی ہوں۔ اور ہمارے گھر میں سب سلائی کڑھائی میں ماہر ہیں۔ اور گھر والوں کو دیکھ کر ہی مجھے بھی شوق ہوا۔"

"ذاتی طور پر کس کردار کو کرنے کا خواب دیکھتی ہیں؟"

"چونکہ میرے والدین نے مجھے شہزادی کی طرح پالا ہے تو اپنے والدین کی تو میں شہزادی ہوں ہی...... میرا دل چاہتا ہوں کہ میں رول بھی شہزادی اور مہارانیوں والے کروں۔"

"اور گھریلو زندگی کیسی گزر رہی ہے۔ اور میاں صاحب کو تمہارے کام کرنے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

"اللہ کا بڑا کرم ہے۔ اور اسد تو خود اس فیلڈ میں ہیں تو بھلا مجھے کیوں منع کریں گے۔ ان کی اجازت سے ہی میں کام کر رہی ہوں۔"

UrduBooks.pk

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ارم احمد

س: شادی کب ہوئی؟

ج: میری شادی جنوری 2009ء میں ہوئی۔

س: شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟

ج: پہلا جملہ "آؤ نماز پڑھیں اور شکر ادا کریں اللہ کا۔"

س: شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلی آئی؟

ج: تبدیلی تو زیادہ نہیں آئی بس کچھ ذمہ داریاں پڑ گئیں کندھوں پر، اگلے دن ہی کام سنبھالا کیونکہ ان کے گھر میں کوئی تھا نہیں کرنے والا۔ والدہ ضعیف تھیں۔ بستر پر تھیں اس لیے۔

س: کیا میکے اور سسرال کے کھانے کے ذائقے مختلف محسوس ہوئے؟

ج: کھانے پکانے میں تو زیادہ فرق نہیں بس یہ لوگ تیل زیادہ اور مسالا کم رکھتے تھے اور ہم لوگ تیز مسالا کھاتے تھے۔ پکاتی میں تھی سسرال میں تو مسالا بھی اپنی مرضی سے استعمال کرتی تھی۔ ماحول بھی تقریباً ایک جیسا ہی تھا۔ بس میں گھومنے پھرنے کی شوقین جبکہ یہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ ہم اپنی عید کی شاپنگ چاند رات کو کرتے تھے جبکہ یہاں پر حکم کہ رمضان سے پہلے سب لے آؤ۔

س: سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی، کن پر تنقید ہوئی؟

ج: تنقید تو بہت سی باتوں پر ہوئی اور تعریف بس اتنی کہ آج کل کی لڑکیوں کی طرح نہیں ہے مطلب فیشن ایبل اور بس اپنے اوپر توجہ دینے والی۔ تیز طرار۔

س: کیا سسرال میں آپ کو وہ مقام ملا جس کی آپ مستحق تھیں؟

ج: نہیں، مجھے وہ مقام نہیں ملا جو میرا حق تھا مگر پھر بھی اتنا کم نہیں تھا اپنے گھر میں مطلب یہاں سسرال میں میرا سکہ ہی چلتا تھا اور چلتا بھی ہے لیکن یہ لوگ مجھے اپنے رشتہ داروں سے نہیں ملواتے تھے کیونکہ وہ بہت امیر اور پڑھے لکھے ہیں اور میں نے بس آٹھ جماعت پڑھی ہیں اور زیادہ خوب صورت اور سلیقہ مند بھی نہیں ہوں، پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے بقول میرے سسرال والوں کے ورنہ اپنے گھر تو امی کی طرف زیادہ تر شاپنگ میں کرتی تھی جو سب کو پسند آتی تھی۔ خیر سوچ اپنی اپنی۔

س: سسرال میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے؟

ج: کوئی اہمیت نہیں دی جاتی سسرال میں۔ گھریلو امور مجھے خود ہی نمٹانا ہوتے ہیں نہ مجھے کوئی بتاتا ہے اور نہ میں پوچھتی ہوں مطلب پکانے کے ماسی کے ـــــ پڑوسیوں کے معاملات وغیرہ۔

س: سسرال سے وابستہ توقعات پوری ہوئیں؟

ج: توقع کوئی رکھی ہی نہیں تھی لیکن پھر بھی کافی عزت ملی منہ پر تو آج بھی کرتے ہیں، پیچھے تو پتا نہیں کیا کیا کہا گیا ہے۔

س: سسرال میں پہلے بچے کی پیدائش بڑا امتحان ہوتی ہے۔ آپ کو کتنی دشواری کا سامنا کرنا پڑا؟

ج: پہلا بچہ واقعی میں امتحان ہوتا ہے خاص طور پر جب کوئی بتانے والا نہ ہو تو لیکن بس گزر گیا وہ وقت بھی۔ مجھے بچے کو بالکل بھی سنبھالنا نہیں آتا تھا تو میرے سسرال والوں نے ــ اور میکے والوں نے بھی کوئی ٹپ، کوئی مشورہ نہیں دیا کہ ایسے کرو یا ویسے کرو۔ بلکہ مجھے آپ یقین نہیں کریں گی یہ سب محلے کی ایک عورت نے سکھایا کہ کیسے بچے کو نہلاتے ہیں، کیسے تیار کرتے ہیں، کپڑے بدلنا وغیرہ۔

UrduBooks.pk
Monthly Shuaa October 2018

اس پر بھی میری ساس شور کرتی تھیں کہ غیر عورت سے بچے کا کام کرا رہی ہے۔ میرا بچہ آپریشن سے ہوا تھا بڑے آپریشن سے، ڈاکٹر نے تین مہینہ بیڈ ریسٹ کا کہا جو کہ میں نے تین دن بڑی مشکل سے کیا وہ بھی ہاسپٹل میں جب تک تھی۔ تین دن بعد گھر آئی اور صبح ناشتا بنایا اپنا بھی اور باقی سب کا بھی۔ کیونکہ باہر کا افورڈ نہیں کر سکتے تھے اور گھر میں کوئی اور بنانے والا نہیں تھا۔ میرے علاوہ۔

س: جوائنٹ سسٹم بہتر ہے یا علیحدہ رہنا؟''

ج: جوائنٹ سسٹم تب ہی اچھا لگتا ہے جب اتفاق ہو خلوص ہو اور محبت بھی ورنہ تو اکیلے رہنا ہی ٹھیک ہے۔ آپ کتنی محبت سے چلتے رہو گے آپ کی ٹانگ کھینچنے میں لگا رہے تو آپ کہاں رہ سکتی ہیں ایسے ماحول میں۔

س: آپ نے سسرال کے ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کی، کس حد تک کامیاب ہوئیں؟

ج: میں نے سسرال کا ماحول چینج کرنے کی بہت کوشش کی لیکن زیادہ کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ عادتیں پختہ ہو چکی تھیں ان لوگوں کی، مطلب میری ساس کی عادت تھی۔ غیبت کی، چغل خوری کی، جھوٹ بولنے کی حالانکہ کافی ضعیف تھیں لیکن اس عمر میں بھی لڑائی جھگڑے میں ماہر......

تقریباً 85 سال عمر تھی ان کی ڈاکٹر نے ہر چیز کا پرہیز بتایا تھا۔ تیز مسالوں کا، تیل گھی بڑے گوشت کا لیکن کبھی کیا نہیں انہوں نے 'نتیجتاً' آئے دن طبیعت خراب 'موشن' الٹی سے سارے کپڑے خراب پورا گھر گندا۔ موشن اتنے ہوتے تھے کہ باتھ روم تک جاتے جاتے سارا گھر بھر جاتا تھا اور بدبو علیحدہ۔ پھر کئی دن کھانا نہیں کھا سکتی تھیں لیکن جہاں طبیعت سنبھلی وہاں پھر وہی حال ان کا۔

مجھے میری جٹھانی جو کہ الگ رہتی ہے، کہتی کہ ان کو کھانا تقریباً ابلا ہوا دو، نہ تیل ڈالو نہ ہی مرچیں وغیرہ۔ میں بناتی تو ساس کو پسند نہ آتا، وہ میری

ماہنامہ کرن

اکتوبر 2018ء کا شمارہ شائع ہو گیا

"کرن کا دسترخوان"

اب ہر ماہ کرن کے ساتھ مفت حاصل کریں

- اداکار ''نعمان اعجاز'' سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ ''حبہ عزیز'' کہتی ہیں میری بھی سنیے،
- آواز کی دنیا سے ''اشعر آغا'' اس ماہ مہمان ہیں،
- اس ماہ ''الفت زہرہ ہراج'' کے ''مقابل ہے آئینہ''،
- ''شب نم کی سحر'' رخ چوہدری کا سلسلہ وار ناول،
- ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نگہت عبداللہ کا سلسلہ وار ناول،
- ''لذت غم عشق'' صائمہ قریشی کے مکمل ناول کا دل پذیر اختتام،
- ''زندگی تم ہی ہو'' نفیسہ سعید کا مکمل ناول،
- ''موراپیا'' بشریٰ ماہا کا مکمل ناول،
- ''غم ہے یا خوشی ہے تو'' تنزیلہ ریاض کا ناولٹ آخری مراحل میں،
- ''پھلجڑیاں'' منشا محسن علی کا ناولٹ،
- قرۃ العین خرم ہاشمی، میمونہ صدف، سدرہ حیات اور عمارہ خان کے افسانے اور مستقل سلسلے،

UrduBooks.pk

جٹھانی کو فون کرتیں۔ کچھ اچھا بھیجو بنا کر۔ اس نے اچھا نہیں پکایا۔ اور وہ خوب گھی تیل ڈال کر پکا کر بھیجتی۔ میری ساس خوش ہو کر کھاتیں اور میرا بنایا ہوا میرے شوہر کو دکھاتیں کہ تمہاری بیوی اچھا نہیں پکاتی۔ مجھے تو بڑی بہو کے ہاتھ کا اچھا لگتا ہے۔ دل جلتا تھا میرا، میری جٹھانی کی سیاست دیکھ دیکھ کر۔ لیکن کچھ کہہ نہیں سکتی تھی کہ میرے میاں کی اجازت نہیں تھی۔

محلے میں جاتیں تو میری برائی، خاندان میں میری برائی، رشتہ داروں میں میری برائی، سب مجھے ایسا ہی سمجھتے جیسا وہ بتاتیں۔ یہ تو اب محلے والوں کو پتا لگ رہا ہے کہ کون صحیح تھا اور کون غلط۔

میں غیر تھی اور میاں نے پسند کر کے شادی کی تھی تو اس لیے میری اچھائی بھی میری ساس کو برائی لگتی تھی۔ کافی ٹائم تو تقریباً پانچ سال میں برداشت کرتی رہی لیکن پھر میں نے بھی ان کو جواب دینا شروع کر دیا پلٹ کر، کہاں تک کوئی برداشت کرے گا۔ گھر کا خرچا سارا میرے میاں اٹھاتے تھے، بہنوں کا، ان کی دوائی وغیرہ کا، بھائیوں کا، میرا، بچوں کا، سب کا۔ میری ساس کے جو پیسے آتے تھے کبھی عید یا بڑی عید پر سب بچے ان کو پانچ پانچ ہزار دیتے تھے جو تقریباً بیس پچیس ہزار بن جاتے تھے لیکن کبھی میری ساس کو توفیق نہیں ہوئی کہ میرے بچوں کو کچھ دے دیں۔ الٹا اس پیسے سے چپس، نمکو، دہی، بڑے پائے، غرض وہ سب جو وہ گھر میں نہیں بنوا سکتی تھیں باہر سے منگوا کر کھاتیں اور پھر طبیعت خراب۔ سو کی چیز منگا کر کھائی پانچ ہزار خرچ کرنے پڑ گئے میرے میاں کو تنگ آ کر میں نے ان کے پیسے چھپا دیے کہ نہ ہوں گے نہ کچھ منگائیں گی الٹا سیدھا لیکن وہ باز نہ آئیں۔

اپنے پاس پیسے نہ ہوتے تو محلے والوں سے مانگ لیتیں کہ بہو بیٹا مجھے کچھ نہیں دیتے۔ مجھے سو روپے دے دو، پچاس دے دو، بعد میں ہمیں پتا چلتا تو پوچھیں مت کتنی شرمندگی ہوتی تھی ہمیں۔ ہم ان سے کہتے کہ آپ کو جو چاہیے ہمیں بتاؤ، ہم منگا دیں گے۔

لیکن پتا نہیں کیا سوچ تھی ان کی کہ مانگنے میں زیادہ مزا آتا تھا۔ گھر کا پسند نہیں آتا تھا بنا ہوا تو بجائے مجھے بولنے کے محلے میں چلی جاتیں پیالہ لے کر۔

”میری بہو نے کھانا اچھا نہیں بنایا۔ مجھے کچھ دو کھانے کو۔“

محلے والے ہمیں برا بھلا کہتے کہ بوڑھی ماں کو بنا کر نہیں دیتے۔ اچھا کھانا منگوا کر نہیں دیتے۔ میں کم نمک مرچ اور کم تیل ڈال کر ان کا کھانا بناتی، سوچتی پرہیزی کھائیں گی تو ان کی طبیعت بھی صحیح رہے گی اور ہم بھی سکون سے رہیں گے۔ مطلب نہ دوائی کا خرچا اتنا ہوگا اور نہ کسی اور چیز کا۔ لیکن ان کو اچھا لگتا تھا ہمیں پریشان کر کے، پریشان دیکھ کر۔ پتا نہیں کیسی ماں تھیں۔ اولاد کو عاجز کر رکھا تھا انہوں نے۔ پانچ سال میں نے برداشت کیا۔ میرے بنائے ہوئے کھانے انہیں پسند نہ آتے حالانکہ محلے والے تعریف کرتے۔ میرا کیا ہوا کوئی کام انہیں اچھا نہ لگتا، خود کرنے کھڑی ہو جاتیں پھر مجھے غصہ آتا اور میں ان کے کھانے میں جو وہ خود اپنے لیے بناتیں اس میں کبھی مٹھی بھر کر نمک ڈال دیتی۔ کبھی کچا تیل ڈال دیتی پکانے کا اور کبھی پانی ملا دیتی۔

وہ کہتیں ”ابھی تو میں نے چکھا تھا۔ صحیح تھا اب ایسا کیوں لگ رہا ہے عجیب سا۔“

پھر وہ میرا بنا ہوا کھانا کھاتیں لیکن سچی بات بتاؤں اس وقت تو مجھے یہ فکر رہتی تھی کہ ان کو نیچا کیسے دکھاؤں۔ کھانا خراب کرتی ان کا پھر میاں سے بولتی کہ ”دیکھو ان کو چکر آتے ہیں۔ کچن میں کام کیسے کریں گی؟ گر گئیں تو کون سنبھالے گا۔“

میاں ان کو سمجھاتے نہیں مانتیں تو گھر میں پھر خوب جھگڑا ہوتا۔ جیت میری ہوتی۔ کھانے کا شعبہ پھر میرے پاس، ان کو ذلیل کروا کر مجھے بڑا مزا آتا۔

لیکن پتا ہے جب ان کا انتقال ہوا تو سب سے زیادہ روئی بھی میں اور میں نے دل سے ان کو یاد بھی کیا لیکن میرا پچھتانا، رونا انہیں یاد کرنا کوئی بھی چیز

UrduBooks.pk

انہیں واپس نہیں لاسکتی۔

میں بس یہ چاہتی ہوں کہ کسی طرح وہ وقت واپس آجائے، میں ان سے معافی مانگ لوں گی کچھ بھی کہیں، کچھ بھی کریں، میں سب برداشت کرلوں گی۔ لیکن افسوس اب وہ وقت واپس نہیں آسکتا۔ میں رات کو سو نہیں پاتی ہوں۔ ہر وقت ڈپریشن رہتا ہے۔

اب یہ ہی افسوس کہ مجھے کیا ملا یہ سب کرکے؟ کم از کم وہ مجھ سے ناراض ہو کر تو نہ جاتیں۔ مجھے کسی نے نہیں بتایا نہ کسی نے سمجھایا کہ یہ سب مت کرو یہ غلط ہے۔ مجھے پتا بھی تھا لیکن اس وقت پتا نہیں کس چیز کا غرور تھا جو میں نے یہ سب کیا۔ میری سب بہنوں سے التجا ہے خدارا کچھ بھی ہو جائے۔ کبھی کوئی ایسا کام مت کرنا کہ اپنے آپ سے نظریں ملانے میں شرمندگی ہو۔

آخر میں شعاع والوں سے کہوں گی کہ میرا سلسلہ ضرور شامل کریں تاکہ سب کو پتا لگ جائے کہ صرف ساسیں ہی ظالم نہیں ہوتیں کبھی کبھی بہویں بھی جینا حرام کردیتی ہیں۔ سسرال والوں کا۔

آپ بہنوں سے گزارش ہے کہ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ مجھے معاف کردے آمین ...... ثم آمین۔

اور کسی بہن کو پتا ہو کہ وہ پیسے جو میں اپنی ساس کے چھپا دیتی تھی۔ ان کو کیسے استعمال کروں کہ ثواب میری ساس کو ملے۔ ضرور بتایئے گا۔

"ارم بہن! اس رقم کو کسی نیک کام میں استعمال کریں۔ کسی طالب علم کی ماہانہ فیس اپنے ذمے لے لیں۔ کسی ایسی جگہ جہاں پانی نہ ملتا ہو، وہاں کنواں کھدوا دیں۔ کسی مسجد میں نمازیوں کے لیے پنکھے لگوا دیں۔

آپ رقم کے حساب سے فیصلہ کریں۔ جو کرسکتی ہوں وہ کریں۔ اپنی ساس کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ ان کے نام پر صدقہ کریں۔ ان شاء اللہ اس سے آپ کی کوتاہیوں کی تلافی ہو جائے گی۔

☆

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

Emale: id@khawateendigest.com

اکتوبر 2018 کے شمارے کی ایک جھلک

سلطان محمد فاتح

ملت اسلامیہ کے لازوال کردار "سلطان محمد فاتح" کے کارہائے نمایاں کی سبق آموز داستان

محترمہ شاہدہ لطیف کی سلسلہ وار کہانی تاریخ کے جھروکے سے

سیکریٹ ایجنٹ

تلاش معاش کے سلسلے میں پردیس آنے والے ایک ایسے شخص کی ... "سیکریٹ ایجنٹ" بننے کا موقع مل گیا، ایک نرالے جاسوس کے کارناموں سے بھرپور

صابر علی ہاشمی کی ہنستی مسکراتی تحریر،

خوشی

ایک گڑیا کی کہانی جسے بڑوں کے ہاتھوں میں دے دیا گیا ہے

کرشن جی کے قلم کا تازیانہ،

گمشدہ

لوگوں میں خون کی گردش کو تیز کردینے والے جرم و سراغ رسانی کے ہنگامہ خیز پرلطف اور پرتجسس واقعات

راجپوت اقبال احمد کی سنسنی خیزی،

مقید خاک

پراسرار سرزمین سے وابستہ حیرت انگیز واقعات کی بازگشت

ایک شخص کی آپ بیتی

ضوباریہ ساحر کے سلسلے کی آخری کڑی،

اس کے علاوہ دیس بدیس کی رومینس، سسپنس اور تجسس سے بھرپور 9 مشہور و معروف مصنفین کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

اکتوبر 2018 کا تازہ شمارہ آج ہی خرید لیں

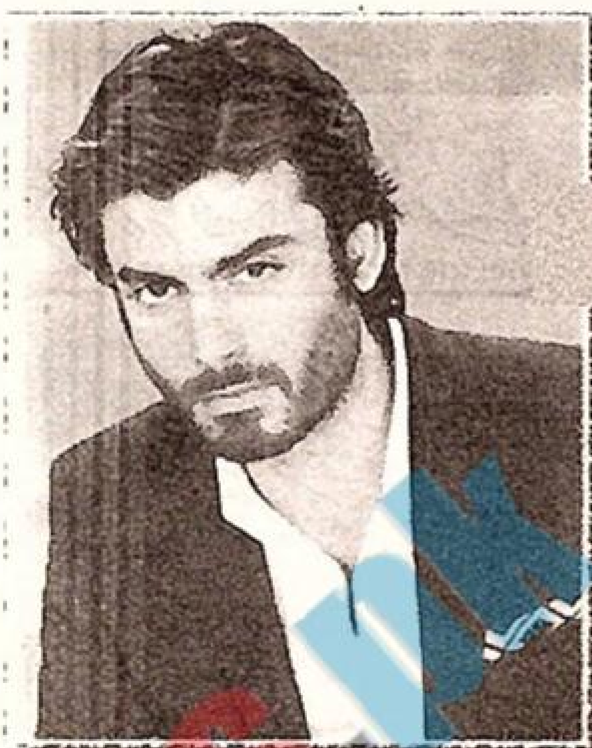

فواد خان سے ملاقات

شاہین رشید

کون نہیں جانتا کہ ''فواد خان'' کو شہرت کس ڈرامے نے دی۔ نہ وہ سیریل ابھی تک لوگوں کے ذہنوں سے اترا اور نہ ہی اس کے اداکار۔ اور یہ وہ واحد سیریل ہے جس کے ہر فنکار نے نہ صرف عالمگیر شہرت حاصل کی بلکہ ان کی فنی زندگی کے راستے بھی ہموار ہوئے جبکہ وہ اس سیریل سے پہلے بھی اداکاری کے میدان میں اپنے آپ کو منوانے کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔

جی...... ''ہم سفر'' نے ہی فواد خان، ماہرہ خان اور نور حسن کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچایا۔ اور آج یہ فلم اور ٹی وی انڈسٹری پر راج کر رہے ہیں۔

''کیسے مزاج ہیں؟''

''الحمد للہ۔''

''مصروفیات؟''

''ماشاء اللہ بہت زیادہ۔''

''آپ تو انڈیا کو پیارے ہو گئے ہیں؟''

''ارے نہیں...... جس ملک نے نام دیا اس کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ اچھا اسکرپٹ ہو تو حاضر ہے بندہ۔''

''آپ یہ بات تو تسلیم کریں گے کہ ''ہم سفر'' نے آپ کے لیے ترقی کی راہیں ہموار کیں؟''

''بے شک...... اور ابھی بھی زیادہ تر لوگ مجھے اس سیریل کے حوالے سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔''

''آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ لوگوں کے زیادہ قریب نہیں ہوتے۔ غرور ہے یا سوشل پرابلم؟''

''آپ نے بالکل ٹھیک کہا کہ میرے بارے میں مشہور ہے کہ میں لوگوں میں زیادہ گھلتا ملتا نہیں ہوں۔ اس کی وجہ غرور نہیں ہے اور اللہ نہ کرے مجھ میں غرور آئے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ایک تو میں زیادہ سوشل نہیں ہوں۔ دوسرا یہ کہ تھوڑا کم گو ہوں۔ میری طبیعت میں خاموشی ہے بس اس لیے لوگوں کو ایسا لگتا ہے کہ میں مغرور ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ وہ دن نہ لائے کہ مجھ میں غرور آئے۔''

''پھر تو کوئی آپ سے کسی بھی ٹاپک پر بحث ومباحثہ بھی نہیں کرتا ہوگا؟''

''نہیں...... کیونکہ مجھے بحث ومباحثہ پسند ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ پھر کئی ایسی باتیں نکل آتی ہیں جو ایک دوسرے کے لیے دل آزاری کا باعث بنتی ہیں۔ اس لیے میں تو پرہیز ہی کرتا ہوں کسی بھی قسم کی لمبی گفتگو سے۔ میں اپنے خیالات کو اور اپنی رائے اور پسند ناپسند کو اپنے تک ہی محدود رکھنا چاہتا ہوں۔''

UrduBooks.pk

"ذہین لوگوں کی یہی باتیں ہوتی ہیں؟"
"نہیں...... نہیں...... میں اپنے آپ کو بالکل بھی ذہین نہیں سمجھتا۔ میں تو بس ایک عام سا انسان ہوں اور خاموش طبیعت کا انسان ہوں۔"
"انڈین فلموں میں کام کرنے کا تجربہ کیسا رہا؟"
"بہت اچھا تجربہ رہا۔ بہت پروفیشنل لوگ ہیں۔ بہت آرگنائزڈ لوگ ہیں اس لیے کام کرنے کا مزہ بھی آتا ہے۔"
"آپ کی تو پہلی ہی فلم نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے، کیوں ایسا ہی ہے نا؟"
"جی...... اللہ کا بڑا کرم ہے...... میری فلم "خوبصورت" تھی "سونم کپور" کے ساتھ...... اللہ کا بڑا کرم ہے کہ وہ کامیاب ہوئی اور مجھے مزید آفرز آئیں۔"
"شاید سال میں ایک فلم کرتے ہیں آپ؟"
"اور کرنی بھی چاہیے...... کیونکہ ایک فلم میں کام کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ بندہ پوری توجہ اور لگن کے ساتھ کام کرے۔ تب ہی تو اچھا رزلٹ آتا ہے۔"
"آپ ہیرو ہیں مگر ایک فلم میں معاون سپورٹنگ رول کیا۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ یا آپ نے ہامی کیوں بھری؟"
"اس فلم کا نام "اے دل ہے مشکل" تھا اور چونکہ کردار بہت اچھا تھا تو میں نے کرلیا اور آپ یقین کریں کہ میرے سپورٹنگ رول کو بہت پسند کیا گیا۔ اس کے ہدایت "کرن جوہر" تھے۔ ایک فلم "کپور اینڈ سنز" بھی کافی پسند کی گئی تھی۔"
"کب سے وابستہ ہیں اس فیلڈ سے؟"
"میں نے اپنی فنی زندگی کا آغاز 2000 سے کیا ایک میوزیکل بینڈ "ای پی" سے تب میں گلوکاری کرتا تھا۔ اور پھر میں...."
"بات کاٹ رہی ہوں...... گلوکاری کو کیوں

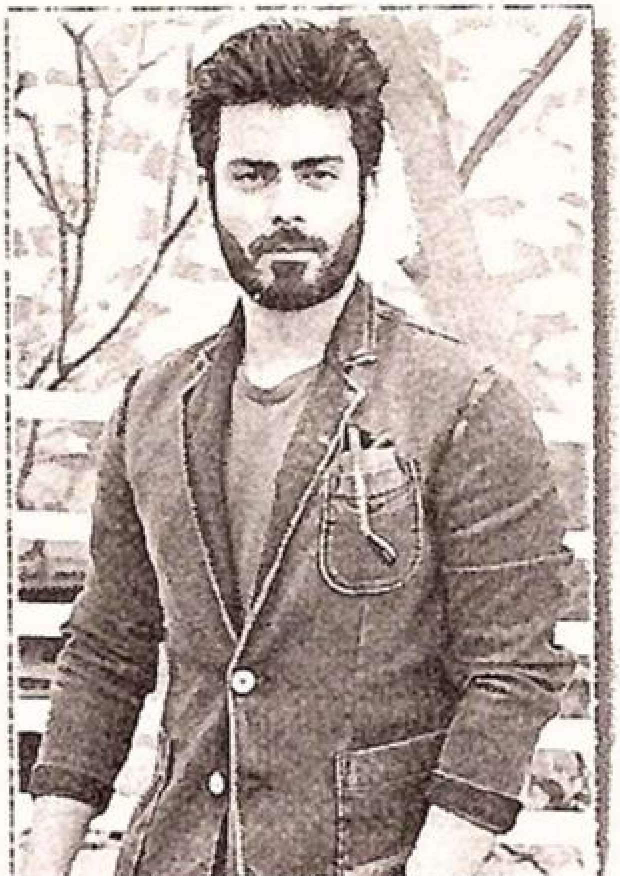

خیر باد کہہ دیا آپ نے؟"
"بس مصروفیات ہی اتنی زیادہ ہو گئیں کہ گلوکاری پس منظر میں چلی گئی۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ میں سب کچھ بھول گیا ہوں۔ ان شاء اللہ اس سلسلے کو پھر جاری کروں گا۔"
"2000 میں کیریئر کا آغاز کیا پھر اداکاری کی شروعات کب سے ہوئی؟"
"2001ء میں اداکاری کی شروعات ہوئی۔ اور ابتداء ایک مزاحیہ سیریل سے ہوئی۔ اور اس کے بعد پھر اچھا خاصا گیپ آگیا اور 2007 میں فلم "خدا کے لیے" سے دوبارہ آغاز کیا۔"
"گیپ کیوں آیا، اور مزاحیہ ڈرامے کا کیا نام تھا۔"
"ظاہر ہے سمپل سی بات کہ کوئی اچھا اسکرپٹ ہی نہیں آرہا تھا ہاتھ میں اور مزاحیہ ڈرامے کا نام "جٹ اینڈ بونڈ تھا۔"
"آپ نے کہا کہ آپ جلد ہی دوبارہ گلوکاری کا سلسلہ شروع کریں گے تو میرے خیال میں یہ

UrduBooks.PK

سلسلہ تو شروع ہو چکا ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"ہنستے ہوئے...... جی بالکل...... ایک شو میں اپنی گلوکاری کا آغاز کر چکا ہوں...... دیکھیے کہ کیا رزلٹ آتا ہے۔"

"2007 کے بعد آپ کا ستارہ بلندیوں کی طرف جانا شروع ہوا؟"

"جی بالکل...... 2012 میں ہم سفر کیا۔

زندگی گلزار کیا 2013 میں۔ اس سے قبل "داستان" اور "بے حد" میں بھی بہت پسند کیا گیا۔ لیکن 2011-2012 ہم سفر کے بعد تو قسمت کے دروازے کھل گئے اور پھر میرے حصے میں کئی سپرہٹ فلمیں آئیں۔ اور آج جو کچھ ہوں سب کے سامنے ہوں۔"

"کمرشل، ماڈلنگ، گلوکاری، ریمپ ماڈلنگ، اداکاری اور جانے کیا کیا...... تو سب کے لیے ٹائم مل جاتا ہے؟"

"الحمدللہ...... کام سے کام رکھتا ہوں، ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ کوشش کرتا ہوں کہ وقت پر آؤں۔ سو اللہ کا کرم ہے کہ سب کاموں کے لیے وقت نکل آتا ہے...... اور پھر یہ ہماری فیلڈ ہے اس سے ہم نے کمانا کھانا ہے۔ اگر اس کو ٹائم نہیں دوں گا تو پھر کس کو دوں گا۔"

"لیٹ آتے ہوں گے تو بیگم تو ناراض ہوتی ہوں گی؟"

"نہیں...... اسے معلوم ہے میری مصروفیات کا اور بچے ہیں نا اس کا دل بہلانے کے لیے...... اللہ کا شکر ہے کہ گھریلو زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے اور تب ہی تو میں اچھے موڈ کے ساتھ سارے کام کر لیتا ہوں۔"

"کتنے سال ہو گئے شادی کو اور کیا آپ کی شادی آپ کی پسند سے ہوئی؟"

"جی...... بالکل...... میری بیگم...... "صدف" میری پسند ہیں اور 2005 میں ہماری شادی ہوئی اور میرے ماشاءاللہ سے دو بچے ہیں۔ ایک بیٹا ہے جس کا نام آیان ہے اور ایک بیٹی ہے جس کا نام علینہ ہے۔ بیٹا ماشاءاللہ بڑا ہے اور بیٹی چھوٹی ہے۔"

"ماشاءاللہ...... کافی ایوارڈ بھی آپ کو مل چکے ہیں اس کے بارے میں بھی بتائیے؟"

"جی الحمدللہ کافی ایوارڈز میرے کریڈٹ میں ہیں۔ مثلاً تین لکس اسٹائل ایوارڈز اور چھ "ہم ایوارڈز" حاصل کر چکا ہوں۔ اس طرح بہترین سنیما آئیکون کے اعزاز سے بھی مجھے نوازا گیا۔ انڈیا میں "فریش فیس" اور بہترین اداکار کا ایوارڈ بھی حاصل کر چکا ہوں۔ بس اللہ کا کرم ہے کافی ایوارڈ سے نوازا گیا ہوں۔"

"کچھ اپنے بارے میں بھی بتائیے کہ کب کہاں پیدا ہوئے آپ؟"

"میرے والدین نے میرا نام "فواد افضل خان" رکھا۔ مگر چونکہ اتنا لمبا نام کوئی لیتا نہیں اس لیے "فواد خان" ہی لوگوں نے کہنا شروع کیا۔ پیار کے بھی بہت نام ہیں اور لسٹ لمبی ہے اس لیے نہیں

UrduBooks.pk

بتاؤں گا۔ اور ہاں جی ...... میں 29 نومبر 1981 کو کراچی میں پیدا ہوا۔ اور ستارہ قوس ہے۔ والد صاحب سرکاری جاب میں تھے تو ملک سے باہر کافی عرصہ رہے۔ اور نیشنل یونیورسٹی آف کمپیوٹر اینڈ انجینئرنگ سائنسز سے بیچلر کی ڈگری حاصل کی۔

"اداکاری کا شوق کس کو دیکھ کر ہوا؟"

"کسی کو نہیں ...... بس خود ہی شوق ہوا اور اسکول کالج اور پھر یونیورسٹی میں ہونے والی غیر نصابی سرگرمیوں خاص طور پر ڈرامہ فیسٹیول میں حصہ لیا کرتا تھا تو بس ...... پھر میوزیکل بینڈ بنایا ...... اور آگے بڑھتا گیا۔"

"کھانے پینے سے لگاؤ؟"

"لگاؤ بہت ہے ...... مگر چونکہ شوگر کا مریض ہوں تو گوشت سے پرہیز کرتا ہوں اور زیادہ تر سبزیوں کا استعمال کرتا ہوں۔ خاص طور پر مجھے "کریلے" اور "سرسوں کا ساگ" بہت پسند ہے اور یہ عموماً سردیوں میں ہی ملتا ہے۔"

"جذباتی ہیں؟"

"بہت زیادہ ...... بہت زیادہ جذباتی ہوں۔ چھوٹی چھوٹی بات دل پر لے لیتا ہوں ...... اور اس بات کا بہت خیال رکھتا ہوں کہ میری وجہ سے کسی کا دل نہ دکھے اور میں اتنا زیادہ حساس ہوں کہ کسی کا دکھ دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور کسی کی تکلیف کو برداشت کرنا میرے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔"

"ٹپ ٹاپ سے رہنا پسند یا رف لف؟"

"نہ میں گھر کو گندا برداشت کر سکتا ہوں اور نہ ہی میں خود گندا رہ سکتا ہوں۔ مجھے میرے دوست یار کہتے ہیں کہ یار اتنی بھی کیا نفاست پسندی ...... بس کیا کروں کہ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے فواد خان سے اجازت چاہی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

بساطِ دل بھی عجب ہے
افشاں آفریدی
قیمت -/400 روپے

فصلِ غم کا گوشوارہ
رضیہ جمیل

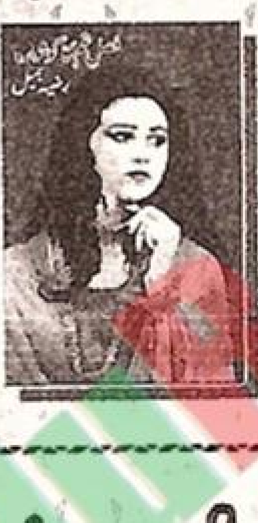

قیمت -/300 روپے

گُلِ کوہسار
فرح بخاری
قیمت -/400 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لیے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

رضیہ جمیل

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع ۔ 37 ۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خطوط اور ان کے جواب کے ساتھ حاضر ہیں۔

آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو بے حساب رزق، خوشیاں اور آسانیاں عطا فرمائے، آمین۔

اب آتے ہیں آپ کے خطوط کی طرف۔

پہلا خط جڑانوالہ سے آمنہ میر کا ہے، لکھتی ہیں
میں اسٹوریز آف منتھ کی بات کروں گی' بھئی۔
مئی کے شمارے میں 'تو مکین شہر جمال' کا بہت خوب صورت کہانی تھی۔ جون میں پریم بوٹی ایمل نے بہت شان دار لکھا۔ بن پاکھی میں سندر بن کی سیر کر کے مزا آیا۔ جولائی کا ٹائٹل بہت پیارا تھا اور ''تیری اک نگاہ کے اسیر'' صلہ پر پیار آیا۔
اگست: کیا مجھے بتانے کی ضرورت ہے کہ ''راہ نور'' کتنی اچھی کہانی تھی۔ سمیرا پہلے یارم پھر رب البشر، عشق آمد و سن، راہ نورد شوق، ٹیولپ اور اب راہ نور۔ اوہ سمیرا آئی لو یو۔
ستمبر: ٹائٹل پیارا تھا پر کبھی پوری ماڈل بھی دے دیا کریں پلیز۔ سب سے پہلے خواب شیشے کا پڑھا۔ تکبر، انا اور پھر محبت سے گندھی کہانی اپنے اختتام کو پہنچی۔ مجھے تو قسط وار کہانی پڑھتے ہوئے اس کے کرداروں سے بھی پیار ہو جاتا ہے سو یاد آئیں گے۔
''تمہاری ماں'' مکافات عمل ایک اٹل حقیقت ہے رب تعالیٰ سے توبہ کے طلب گار ہوتے رہنا چاہیے۔ شہزاد، درشہوار آخر کتنا ذلیل ہو گی تم اور اب ہادی کی جان چھوڑ دو۔
مٹھی میں جگنو اور قصہ اک شہزادی کا امیزنگ۔
رب کی بستی ناٹ بیڈ۔
''گردش ایام'' بے حد خوب صورت اور دل کو چھو لینے والی جب مہر کو اس کے پاپا نے پیٹرول اور ماچس پکڑائی تو دل دہل گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور جب اس نے کنویں میں چھلانگ لگائی تو دل آنکھوں کے راستے چھلک گیا۔ میری بھابھی! اف میرے خیال میں تو یہ فینٹسی تھی، مانا اچھی بھابیاں بھی ہوتی ہیں پر اتنی اچھی؟
''شام کی حویلی میں'' ابھی تو کرداروں کا تعارف ہی تھا سو تبصرہ ادھار رہا۔

☆ پیاری آمنہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ لفافے میں پیسے رکھ کر ٹی سی ایس کر سکتی ہیں۔ پیسے لفافے میں اچھی طرح کاغذ میں لپیٹ کر رکھیں۔ آپ کو ناول بھجوا دیے جائیں گے۔ اپنا صحیح ایڈریس ضرور لکھیں۔ اگر ایڈریس درست نہ ہوا تو ناول آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ مزید تفصیلات کے لیے آپ اس نمبر پر فون کرلیں 021-32735021

حمنیٰ اقبال منڈی فیض آباد سے لکھتی ہیں
شعاع پر بات کرنے لگے تو باتیں کبھی ختم نہ

ہوں۔ بہت کمال، بہت بہترین، بہت اعلیٰ۔ ہم سب کو شعاع بہت پسند ہے۔ میری آپی کی تو اس میں جان ہے۔ آپی کے گھر ہاں 30 جولائی کو بیٹی پیدا ہوئی اور آپی نے 5 اگست تک شعاع پڑھ لیا مکمل، سب منع کرتے رہے۔ وہ منگواتی ہیں اور ہم سب پڑھتے ہیں۔ شعاع کے ذریعے میں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں آپی آپ کا بہت شکریہ۔

☆ پیاری حمنی! شعاع کی پسندیدگی کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی آپی کو ماں بننے پر مبارک باد۔ شعاع سے ان کی محبت کے لیے شکریہ۔

ثناشا انصاری نے لکھا ہے

خواب شیشے کا بہت خوب صورتی سے اختتام کو پہنچا۔ شہزاد کی ساری اقساط پچھلے ماہ ہی ایک ساتھ پڑھیں مزا آ گیا۔ مکمل ناول ''گردش ایام'' بہت پسند آیا۔ افسانوں میں ''یار دل دار'' یہ سلسلہ مجھے بے حد پسند ہے۔ پلیز اسے جاری رکھیے گا۔ سمیرا حمید کی تحریر ''راہ نور'' کی تعریف کروں گی، جس کا ایمان سلامت ہے اس کا سب سلامت ہے۔ سمیرا جی یہ جملہ تو دل میں کھب ہی گیا میرے۔

☆ پیاری ثناشا! سمیرا حمید اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔

آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں گئیں، آپ اپنا فون نمبر بتا دیں۔ ہم آپ کو فون کر کے ان کے بارے میں بتا دیں گے۔

انیلا طالب گوجرانوالہ سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

''یار دل دار'' پڑھ کے اچھا لگا۔ ''گردش ایام'' میں شبینہ کا کردار بہت پسند آیا۔ رائٹر ہیروئن ویسے بھی دل میں اتر جاتی ہے، خود جو اسی قبیلے سے تعلق ہے اسی لیے شاید...... ناولٹ میں منشا محسن علی ویل ڈن۔ بہت اچھا لکھتی ہیں منشا۔ دلکش پلاٹ اور بہترین ایکسپریشن کی بدولت میری روح کے بہت قریب ہیں یہ۔ اس کے بعد ''مٹھی میں جگنو'' پڑھا، عفت سحر کے ناول کی آخری قسط نے ساری تشنگی مٹا دی باقی سب ہی سلسلے پسند آئے۔

☆ پیاری انیلا! آپ کا پچھلا خط لیٹ ملا۔ اس لیے شائع نہ ہو سکا۔ آپ کی کہانیاں قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے اچھی تحریر کوئی بھی رائٹر لکھے اس کی تعریف بنتی ہے۔ نئی پرانی کی بات نہیں ہے، جو آج پرانی رائٹر ہیں، کبھی وہ بھی نئی تھیں۔ قارئین کی پسندیدگی اور حوصلہ افزائی نے انہیں یہ مقام دیا ہے۔

فرحت انصاری نے ملتان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

اگست کا شمارہ ہمیشہ کی طرح بہترین تھا۔ مکمل ناول میں گردش ایام بے حد پسند آیا تھا۔ ناولٹ اور افسانے سب ہی اچھے تھے۔ عفت سحر پاشا نے صحیح اینڈ کیا ہے۔ رخسانہ عدنان کے ناول کی پہلی قسط ہے مگر ان کی ہر تحریر ہی اچھی ہوتی ہے، سو پوری امید ہے کہ ان کا یہ ناول بھی شان دار ہوگا اور بے پناہ مقبولیت کے باعث جلد ہی ٹی وی پر بھی آن ایئر ہوگا۔

☆ پیاری فرحت! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

آپ کی کہانیاں زیر غور ہیں، یعنی اسٹاف کے کچھ ارکان کو پسند آئی ہیں اور کچھ کا خیال ہے۔ ان میں کچھ کمی ہے، ہم آپ کو فون کر کے ان کے بارے میں تفصیل سے بتا دیں گے۔

زینب نور نے جہانیاں سے لکھا ہے

آج جو ایک سال بعد خط لکھنے میں کامیاب ٹھہری ہوں، تو اس کا سہرا میرے بڑے بہنوئی کے سر جاتا ہے (اللہ پاک ان کو سدا قائم و دائم رکھے، آمین)۔

اگر بات تبصرے کی کریں تو جناب کیا تبصرہ کریں؟ ہمیں تو پرچا ایک ماہ لیٹ موصول ہوتا ہے کیونکہ بڑی بہن خریدتی ہیں تو ملتان سے جہانیاں تک پہنچنے میں پورا ایک ماہ لگ جاتا ہے۔

UrduBooks.pk

میں اور میری تینوں بہنوں (راشدہ دلبر، کوثر ناز، عابدہ سحر) کی فیورٹ رائٹرز وہی ہیں جو ہر قاریہ کی دل عزیز ہیں۔ "شہرزاد" اور "خواب شیشے کا" بے انتہا اچھی تحریریں ہیں۔ "بن پاکھی" فرح بخاری کی بہت اچھی لگی۔ اگست کے شمارے میں فاخرہ جبیں کا افسانہ زبردست رہا۔

نمرہ احمد، عمیرہ احمد اور سمیرا حمید کے علاوہ فرزانہ کھرل، ایمل رضا اور سائرہ رضا کی تحریریں دل کو چھو جانے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور فرزانہ کھرل تو لگتا ہے "حالم" کے ایڈم بن محمد کی طرح دل سے لکھتی ہیں۔

☆ پیاری زینب! ہمیں احساس ہے کہ ہماری قارئین کے لیے پرچے کا حصول، تبصرہ کرنا اور خط پوسٹ کروانا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ آپ ہمیں خط ضرور لکھیں اور تمام کہانیوں پر تبصرہ بھی کریں۔ ہم آپ کا خط آئندہ ماہ کے شمارے میں شامل کرلیں گے۔ بالفرض خط شامل نہ بھی ہوسکا تو آپ کی رائے سے تو آگاہ ہوجائیں گے۔

ثناء ذوالفقار، نورے والی رحیم یار خان سے شرکت کررہی ہیں، لکھا ہے

سرورق بس ٹھیک ہی تھا۔ حمد و نعت ﷺ پڑھنے کے بعد دستک میں آمنہ شیخ اور احسن خان کو پڑھا۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا" ب۔ق۔ر۔ نے بہت اچھا اور خوش گوار ناتا لکھا۔ شعاع کے ساتھ ساتھ سلسلہ بہت اچھا ہوتا ہے، اسے ہر ماہ لازمی دیا کریں۔ اس دفعہ بھی ناظمہ زیدی اور ریحانہ چوہدری نے بہت اچھا تعارف لکھا۔

رخسانہ نگار کا نیا ناول "شام کی حویلی میں" نام بہت منفرد ہے۔ ناول کے شروع میں ہی میرا فیورٹ کلام لکھا تھا۔ زینب اور کشف پہلے ایسے لگ رہا تھا کہ شاید یہ بہنیں ہیں، سونیا کا رویہ کچھ عجیب سا ہے۔ ضرور اس کے ماضی میں بھی کوئی کہانی ہوگی۔

"شہرزاد" میں شکر ہے، سعد نے بچالیا ورنہ بادی کے ماں باپ تو اس کی شادی کروا کر ہی رہتے۔ مونیکا اور ذوالکفل والا قصہ بھی جلدی کھول دیں۔

"خواب شیشے کا" بہت اچھا ناول اختتام پذیر ہوا۔ عفت سحر طاہر نے سب کرداروں کے ساتھ انصاف کیا اور اینڈ بھی بہت اچھا تھا۔ "قصہ ایک شہزادی کا" شہزادی (شاہ تاج) کچھ زیادہ ہی مغرور اور نک چڑھی تھی لیکن اینڈ میں شکر ہے اسے عقل آگئی۔ "رب کی بستی" منشاء محسن نے ہمیشہ کی طرح اچھا لکھا۔ منشا محسن میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ پلیز بیلا جیسا کوئی اور ناول لکھیں۔

"میری بھابھی" میں بھابھی رنگ کی ضرور کالی تھیں لیکن دل کی بڑی چٹی تھیں۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔

مکمل ناول میں "مٹھی میں جگنو" بالکل بھی پسند نہ آیا۔ وہی پرانی کہانی تھی۔ "گردش ایام" اچھا ناول تھا، شبینہ کی شادی عباد سے ہونی چاہیے تھی۔

☆ پیاری ثناء! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہوں۔ آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔ آپ کی فرمائش پر ان شاء اللہ آئندہ ماہ جلد کی حفاظت کے بارے میں دیں گے۔

فریحہ عبدالرشید نے گوجرانوالہ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

زوولوجی میں ماسٹرز کررہی ہوں اور رائٹر بننا میرا بچپن کا خواب ہے۔ میں کلاس پنجم میں تھی، جب سے پڑھنا شروع کیا۔ 22 سالہ اس زندگی میں جو کچھ بھی سیکھا ہے، تو یہ ان ناولز کا ہی مرہون منت ہے، رشتوں کو نبھانا، صبر و تحمل، غلط فہمیوں سے دور رہنا۔ فضول قسم کی توقعات لگانے سے پرے رہنا۔ یہ ساری سمجھوری اور شعور ان ہی میگزینز کا دیا ہوا تو ہے اور سب سے بڑا کہ میرے اندر چھپے، ایک لکھاری کے ٹیلنٹ کو۔ مزید نکھار ان ہی ناولز کے مطالعے نے دیا ہے۔ میں گزشتہ آٹھ سال سے لکھ رہی ہوں، کئی ایک ناولز ہیں جو کہ میں نے لکھے ہیں لیکن وقتاً فوقتاً مجھے محسوس ہوا کہ میرے لکھنے میں اتنی پختگی نہیں تھی میں نے مزید لکھا...... اور پھر مزید لکھا...... پھر مزید لکھتی چلی گئی۔

UrduBooks.PK

☆ پیاری فریحہ! آپ نے ہمارے پرچے پڑھ کر سیکھا اور زندگی میں مثبت رویوں کو اپنایا، یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی سب سے اچھی بات یہ لگی کہ آپ نے اپنی تحریروں کو خود پرکھا اور بار بار لکھا اور جب تک مطمئن نہیں ہوئیں انہیں آگے نہیں بڑھایا۔

آپ میں صلاحیت ہے اور ان شاء اللہ آگے بڑھیں گی۔ آپ کی تحریر منتخب ہوچکی ہے، اس ماہ یا آئندہ ماہ شائع ہوگی۔

افق ارین نے کرک کے پی کے سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

سب سے پہلے تو "خواب شیشے کا" پڑھا۔ عفت سحر کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ اب بس غائب مت ہوجایئے گا۔ آپ کی اگلی تحریر کا انتظار رہے گا پھر دوڑ لگادی "شہرزاد" کی طرف۔ صائمہ اکرم جس طرح آپ اس کہانی کو لے کر چل رہی ہیں، جی چاہتا ہے ہاتھ چوم لوں آپ کے۔ افسانے، ناولٹ، ناول سب ہی بہت اچھے لگے مزا آگیا لیکن اسٹوری آف دی منتھ "مٹھی میں جگنو" سحر ملک! کمال لکھا آپ نے۔ سائرہ رضا، ثمرہ بخاری، فرحت اشتیاق ہم آپ کے منتظر ہیں اور نبیلہ عزیز کہاں گم ہوگئی ہیں۔

☆ پیاری افق! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ شعاع آپ کو پسند آیا۔ بہت شکریہ۔ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

آپ اپنی تحریر بھجوا سکتی ہیں لیکن ہمارا مشورہ ہے کہ فی الحال آپ مطالعہ کریں۔

مسرت الطاف احمد کراچی سے لکھتی ہیں

ہر بار کی طرح اس بار بھی شعاع نے بہت ہی انتظار کروایا۔

سرورق میں ماڈل گرل کا انداز اور خاص طور پر ہاتھ میں پہنی رنگ نے کافی متاثر کیا۔ اس بار سلسلے وار ناولز بازی لے گئے، مکمل ناولز اور ناولٹ بس قابل قبول ہی رہے۔ "خواب شیشے کا" آخری قسط سپرڈ پر رہی، اس تحریر نے پہلی قسط سے آخری تک ہمیں اپنے حصار میں قید رکھا، درشہوار کی ایسی کی تیسی اپنے خواہشات نفس کی وجہ سے خود تو بے چین ہے ہی اور اپنے ساتھ ساتھ ہادی اور اس کی فیملی کو بھی بے سکون کردیا ہے۔ "شام کی حویلی میں" پہلی قسط قابل تعریف لگی، زینب اور کشف کی زندگی کافی تھکا دینے والی لگی۔ زینب کا کردار پسند آیا۔ "گردش ایام" اسٹارٹ تو بہت زبردست تھا، تحریر کافی سبق آموز اور حقیقت کے قریب تر محسوس ہوئی۔ آج کل ہمارے معاشرے میں عورت نے خود کو پردے سے نکال کر اور خود کو سارے زمانے کے سامنے ظاہر کرکے اپنے عورت ہونے کی نفی کی ہے۔ کباب میں ہڈی۔ "رب کی بستی" انٹرسٹنگ تحریر تھی۔ سب سے زیادہ وہ سین بہت پسند آیا جب امید سبزی فروش، نائی ذاکر اور درزی سے انٹرویوز لیتی ہے۔ ان کے تبصروں نے تحریر میں ایک جان ڈال دی، بہت مزا آیا۔ "مٹھی میں جگنو" یہ تحریر پسند کی سند حاصل نہیں کرسکی۔ وہاب کا کردار دبو، کمزور اور بزدل سا لگا۔ بغیر کسی وجہ کے مالا سے لاتعلق رہا اور دل ہی دل میں اس سے محبت بھی کرتا رہا یہ کیسی محبت ہے، اپنا مائنڈ بھی یوز ہی نہیں کیا، تائی نجمہ کے دباؤ میں آکر ماہ رخ سے شادی بھی کرلی۔ خیر وہ مالا بھی اچانک سے اینکر پرسن ملیحہ بن گئی، یہ تحریر بالکل پسند نہیں آئی، کافی ڈرامائی لگا فلمی سا۔

"افسانوں میں نمبر ون اور ہر شمارے کی جان فشین نعیم کا افسانہ "یار دل دار" مائی موسٹ فیورٹ تحریر رہا۔ باقی کے افسانے بھی اچھے رہے۔

☆ پیاری مسرت! تبصرہ حسب معمول، حسب روایت دلچسپ، جامع ہے۔ ہر کہانی کے بارے میں بھرپور انداز میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ مٹھی میں جگنو آپ کو پسند نہیں آیا لیکن کیا وہاب جیسے دبو اور کانوں کے کچے مرد نہیں پائے جاتے؟ آپ کے مشاہدے میں بے شک نہ آئے ہوں لیکن ہم نے دیکھے ہیں۔ کہانی میں البتہ کہیں مبالغہ ضرور تھا۔

تبسم بشیر حسین ڈنگہ سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

بس اب یہ میرا آخری خط ہے۔ ہم سید پٹھان زبان کے پکے ہیں۔ ٹائٹل شان دار تھا بہت خوب

UrduBooks.pk

صورت۔ پہلی شعاع زرم زرم شگفتہ ...... حمد و نعت سبحان اللہ۔ خطوط اس بار سب نے ایک سے بڑھ کر ایک لکھا۔ عروج یوسف نے کیا زبردست خط لکھا، پر تیسرے سوال کا جواب کیا ہے؟ ملائکہ کوثر کا دکھ جان کر بہت دل دکھا۔ ملائکہ کو داد دیتی ہوں جس نے اتنی پریشانیوں کے باوجود شعاع کے لیے خط لکھا۔ افسانوں میں ''یار دل دار'' دیکھ کر دل خوش ہوگیا تو اس بار بھی بچ گئے خالو سے۔ ''میری بھابھی'' عطیہ خالد کو دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ کوئی بتلاؤ شازیہ کا افسانہ حقیقت کے قریب تر لگا۔ دل والا، جمیل تو بڑے دل والا نکلا۔ شعاع کو چار چاند ہماری پیاری منشا محسن علی نے لگا دیے۔ ''رب کی بستی'' ایک بہت خوب صورت تحریر ان کی ساری تحریریں میرے دل پر نقش ہیں۔ قصہ ایک شہزادی کا نارمل رہی۔ اچھا لکھا سمیرا سرفراز نے۔ ''جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے'' اس دفعہ قدرے خوش گوار تھا ورنہ وہی رونا پیٹنا۔ اگر ہمارے ساتھ برا ہوتا ہے تو ہم نے بھی برا کیا ہوگا۔ ''شام کی حویلی میں'' چند اقساط ہو جائیں پھر پڑھوں گی۔ شعاع کے ساتھ ساتھ ناظمہ زیدی، ریحانہ چوہدری کے جوابات زبردست رہے۔ اس سے پہلے کہ ہم گر جائیں، سونے میں ہی بھلائی ہے۔ ایک رات میں ہی شعاع پڑھ بھی ڈالا۔ تبصرہ لکھ بھی دیا۔ شائع کر دیا نہ کرو آپ کی مرضی، ہم دیکھنے چلے خواب جو آنکھیں کھلنے کے بعد نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے ہیں؟

☆ پیاری تبسم! سونے والے خوابوں کی تعبیر کبھی ملتی ہے کبھی نہیں۔ جو خواب جاگتے میں دیکھے جاتے ہیں اور جن کو پورا کرنے کے لیے محنت اور کوشش کی جاتی ہے وہی خواب تعبیر بھی پاتے ہیں۔ سیدانی جی! آپ کا غصہ سر آنکھوں پر، لیکن غصہ کرنے سے پہلے یہ تو معلوم کر لیتیں کہ آپ کے خط ہمیں ملے بھی ہیں یا نہیں۔ ہمیں آپ کا کوئی خط ملا ہی نہیں تو جواب بھلا کیسے دیتے؟

تبصرہ بہرحال بہت خوب ہے۔

''ناتا جوڑا ہے'' کے سلسلے میں قارئین اپنے تجربات لکھتی ہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کا عکس ہے، ہمارے ہاں بہوؤں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے۔ وہ جب ساس بنتی ہیں تو وہی دہراتی ہیں اور یہ سلسلہ نہ جانے کب سے چلتا آ رہا ہے۔ عورت ہی عورت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ اگر کہیں کسی عورت کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے تو اس کے پیچھے بھی یقیناً عورت ہی ہوگی۔

عائشہ اکبر ڈھلو نے بھکر یوالی سے لکھا ہے

مجھے بہت شوق ہے کہ میں بھی شعاع کا حصہ بنوں اور میرا بھی نام شعاع میں آئے میرے دل میں سوراخ ہے تو اب میرا آپریشن ہے دل کی سرجری ہونی ہے۔ پتا نہیں زندگی ملے یا نہ ملے تو میں پلیز ایک بار دیکھنا چاہتی ہوں کہ میرا خط بھی شائع کر دیں۔

☆ پیاری عائشہ! آپ کے اشعار اور خط شعاع میں شامل ہیں۔ آپ کا نام شعاع میں شامل ہو یا نہ ہو، آپ شعاع کا حصہ ہیں۔ شعاع پڑھنے والی ہر قاری بہن شعاع کا حصہ ہے۔

عائشہ! ناامیدی کی باتیں نہیں کرتے، اب تو دل کی سرجری کوئی مسئلہ ہی نہیں رہی ہے۔ ان شاء اللہ آپ ٹھیک ہو جائیں گی اور تین ماہ بعد ہمیں خط لکھیں گی۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کے ساتھ طویل زندگی عطا فرمائے۔

قارئین سے بھی التماس ہے کہ عائشہ کی کامیاب سرجری کے لیے دعا کریں۔

ارم کمال نے فیصل آباد سے
شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

مجھے یقین ہے کہ خط لکھوں یا نہ لکھوں آپ کے دل میں ضرور رہتی ہوں، محبتوں میں ایسا مان تو ہوتا ہی ہے۔

ستمبر کا شمارہ 5 تاریخ کو ملا، ٹائٹل کلرفل، ماڈل دلکش۔ ''خواب شیشے کا'' کا اختتام ہوا اور اینڈ نے دل کو خوشیوں سے بھر دیا۔ ''شہزاد'' سوپر ڈوپر جا رہا ہے۔ شہوار بد سے بدترین ہوتی جا رہی ہے، اس طرح زور زبردستی محبت ملتی ہے بھلا۔ ''مٹھی میں جگنو'' سحر ملک کی لازوال تحریر رہی۔ نعیمہ ناز نے ''گردش ایام'' لکھ کر دل لوٹ لیا۔ ویل ڈن نعیمہ! ''قصہ ایک شہزادی کا'' میں شاہ تاج نے انا کو توڑ کر پیار کا جام حاصل کر لیا۔ ''میری

بھابھی" پڑھ کر دل بوند بوند رویا، ایسی بھابھیوں کو ہزار توپوں کی سلامی دینی چاہیے۔ نیا سلسلے وار ناول "شام کی حویلی میں" رخسانہ نگار عدنان کا نام ہی زبردست اور بہترین تحریروں کا آئینہ دار ہے۔ سائرہ رضا کہاں غائب ہیں، ان کا "خالی آسمان" اپنی ساری جزئیات کے ساتھ یاد ہے۔

☆ ارم! آپ کا یقین بالکل درست ہے، ہم نے آپ کی کمی محسوس کی تھی۔ لیکن جو قارئین ہر ماہ شرکت کرتی ہیں، وہ غائب ہو جائیں تو ہم یہ سوچ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ ان کی شادی ہو گئی ہے اور وہ نئی زندگی کی رنگینیوں میں گم ہیں۔

سائرہ رضا آج کل چینل پر ڈرامے لکھ رہی ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ میں بھی ان کا دو اقساط پر مشتمل ناول شائع ہوا ہے، پچھلے ماہ پہلی قسط آئی تھی۔ اس ماہ دوسری اور آخری قسط شامل ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ اور یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ اتنے عرصے میں غیر حاضری کی وجہ کیا تھی؟

حمیرا لطیف حور نے رائے ونڈ سے لکھا ہے

شعاع پانچ تاریخ کو ملا۔ رانیہ خان ٹائٹل پر براجمان بہت اچھی لگ رہی تھی۔ آنکھوں نے تو سحر میں ہی جکڑ لیا۔ مرے پر سو درے رخسانہ جی کا نام۔ ٹائٹل تو پیارا لگنا ہی تھا نا۔ شعاع کی تو تمام رائٹرز کمال کی ہیں۔ پھر دوڑے "شہزاد" پر۔ سعد کو تو فرشتہ بنا کر بھیجا ہے صائمہ جی نے۔ اور در شہوار...... بددعا تو ہم کسی کو دیتے نہیں جی اس لیے زندہ ہی رہے وہ، لیکن اپنی گھٹیا حرکتیں چھوڑ دے۔ "شام کی حویلی میں" اسٹارٹ تو اچھا ہے، آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ "گردش ایام" جب شبینہ نے انکار کیا تو میری تو یقین مانیں جان نکلنے والی تھی۔ "خواب شیشے کا" کی طرف۔ عفت جی ناول ختم ہونے (اور اتنا اچھا اینڈ کرنے پر) مبارک باد۔ مٹھائی کب کھلا رہی ہیں پھر؟

☆ پیاری حمیرا! اس بار تو ہم آپ کی فرمائش پوری نہ کر سکے۔ آئندہ ماہ کوشش کریں گے۔ ہم تو کوشش کر سکتے ہیں، باقی ماڈل اور فوٹو گرافر کی مرضی ہے وہ ہماری کہاں سنتے ہیں۔

مرے پر سو درے والا محاورہ یہاں غلط استعمال کیا ہے آپ نے۔ جب ایک سے زیادہ اچھی چیزیں مل جائیں تو کہتے ہیں چپڑی اور دو دو۔

عفت جی نے اتنا اچھا ناول لکھا آپ کے لیے، مٹھائی تو آپ کو کھلانا چاہیے انہیں۔

خدیجہ مسکان ہراج اور فاطمہ رانی داؤد
والا تلمبہ سے شریک محفل ہیں

بات کا آغاز کرتے ہیں حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جن کو پڑھ کر ہمیشہ دل کو سرور ملتا ہے۔

اب بات کرتے ہیں اپنے پسندیدہ ناولوں کے بارے میں۔ سب سے پہلے ہم عفت صاحبہ کا ناول "خواب شیشے کا" سے فیض حاصل کرتے ہیں جو ہمیں بہت پسند ہے۔ فرح بخاری کا ناول "بن پاکھی" بہت اچھا لگا۔ یہ تحریر تو آپ کی سب تحریروں سے انمول اور انوکھی تھی۔ ویسے مدیرہ صاحبہ راز کی بات ہے ہمیں کسی نے یاد تو نہیں کیا ہوگا نہ یقیناً "خیر کوئی گل نی" یاد تو انہیں کیا جاتا ہے جو بھول گئے ہوں، ہیں نا بھئی۔

☆ خدیجہ اور مسکان! "کسی" کا تو ہمیں پتا نہیں لیکن ہم نے آپ کو ضرور یاد کیا تھا اور اس بار آپ کا خط بہت پھیکا سا لگا۔ صرف دو تحریروں پر تبصرہ، آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

روزینہ نعیم، یاسمین ساجد کھیالی
گوجرانوالہ سے لکھتی ہیں

انتظار کر کر کے ہی ہمت ختم اور غصہ ہضم۔ ٹائٹل میں لڑکی بہت پیاری لگی اور اس کی انگوٹھی کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ شکر ہے کہ دستک میں کچھ نیا پڑھنے کو ملا۔ آمنہ شیخ سے ملاقات اچھی رہی۔ احسن خان کے تو سب ڈرامے ہی لاجواب ہوتے ہیں۔ اڈاری میں کردار تو بہت منحوس تھا پر ایکٹنگ لاجواب تھی۔

شیف ذاکر سے تو ملاقات کر کے مزا دوبالا ہو گیا۔ بہت اچھے لگتے ہیں یہ مجھے ان کے بولنے کا اسٹائل تو بہت

ہی لاجواب پر غصے کے بھی بہت تیز ہیں۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے، ب۔ف۔ رکیا سچ میں اسلام میں جوائنٹ فیملی کا کوئی تصور نہیں، ذرا سا بھی نہیں۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ دو سال ہوگئے۔ اپنی امی کا حال احوال لکھ کر بھیجا تھا میں نے اس سلسلے میں ابھی تک شائع نہیں ہوا۔

''شام کی حویلی میں'' ابھی تو پہلی قسط اور اتنے کردار۔ ابھی تو بس تعارف تھا آگے جا کر پتا چلے گا کیا تھا حویلی میں۔

کشف تو بہت بدتمیز لگ رہی تھی جب پھیری والوں کو بددعائیں دے رہی تھی۔ عطیہ خالد ویل ڈن بہت اچھا افسانہ لکھا۔ ''میری بھابھی'' کوئی کوئی ہی ہوتا ہے دنیا میں جو اپنی نند کے لیے ایسا کرے۔ ہمارے حصے میں تو وہی روایتی بھابھی آئی۔ بیسٹ جملہ ''ہم نے اس سے سب لے کر پھر اسے اپنایا تھا''۔ ''قصہ ایک شہزادی کا'' بہت لائٹ سی اچھی اسٹوری۔

عفت سحر طاہر ویل ڈن، بہت اچھی کہانی لکھی آپ نے۔ جو ہیپی اینڈنگ کے ساتھ اختتام کو پہنچی۔

صائمہ جی آپ کے تو کیا ہی کہنے ہیں، میں بھی تو ہاتھ چوم لوں۔ درشہوار بہت بری لگتی ہے۔ ہم زاد کا یہ جملہ کہ ''میری ہی ذمہ داریوں میں اضافہ کرنا'' کمال تھا اور پلیز ہم زاد ہی سوٹ کرتا ہے اسے۔ حمزہ نہیں اس لیے ہم زاد ہی لکھا کریں۔

روزینہ اور یاسمین! ہماری بہت ساری قارئین پرچا لیٹ ملنے پر ہم سے خفا ہیں لیکن ہم بھی کیا کریں، ہم پوری کوشش کرتے ہیں کہ پرچا جلد آجائے لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ آڑے آجاتی ہے۔ آپ دعا کریں کہ ہم پرچا جلد لانے میں کامیاب ہوجائیں۔

اسلام میں جوائنٹ فیملی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ آپ خود سوچیں، جب دیور، جیٹھ اور کزن سے پردہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو پھر جوائنٹ فیملی سسٹم میں کیسے رہا جاسکتا ہے۔

جوائنٹ فیملی سسٹم ہندوازم سے آیا ہے، چونکہ ہم ایک طویل عرصہ ہندوؤں کے ساتھ رہے ہیں اس لیے ہم نے ان کے کچھ رسم ورواج اپنا لیے ہیں۔

فرحانہ مہناز گوجرہ سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

گوشت کی خوشبو گھر سے ختم ہوئی تو اب حلیم۔ حلوہ۔ دال والے سفید چاول پکنے کو تیار ہیں۔ مہینہ بدلا اور کھانے کی چیزیں اور احساسات بھی بدل گئے۔ یہ دس دن بہت ہی افسردہ پرملال گزرتے ہیں، ہمارے پیارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسوں اور اہل بیت کی یاد میں۔

اب اس ماہ کے شمارے کی طرف، فوزیہ ثمر کی طرح میں بھی یہ ہی کہنا چاہتی ہوں کہ ہمارا ساتھ یہاں تک ہی تھا عفت جی سے۔ ایسے لگ رہا ہے کہ کوئی بہت ہی پیارا مہمان رخصت ہوا گھر سے۔ گردش ایام بھی بے حد پسند آیا۔ مہر جہاں نے اپنی ردا کی پاسداری کے لیے جان دے دی۔ سمیرا سرفراز نے بھی شہزادی کا قصہ بیان کیا، اچھا لگا۔ بیٹیاں ایسے ہی اپنے قریبی رشتوں کے بارے میں حساس ہوتی ہیں، اب وہ اپنے منہ سے تو نہیں کہتیں، شادی کا بس والدین کو سمجھانا پڑتا ہے۔ افسانے بھی پسند آئے لیکن یار دل دار مزہ دے گیا۔ بچے حیرانی سے مجھے ہنستا ہوا دیکھ رہے تھے۔

☆ فرحانہ! ایسا دل تو نعمت ہوتا ہے۔ جو دوسروں کی خوشی اور غم کو محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خوش رہیں۔ عفت جی سے تعلق ختم نہیں ہوا، ان شاء اللہ وہ جلد آپ کے لیے نیا ناول لکھیں گی۔ اس ماہ خواتین ڈائجسٹ میں بھی ان کا ناولٹ شامل ہے۔

میرپور خاص سے ماہم حمید نے لکھا ہے

بہت ماہ بعد بے پناہ، مصروفیت میں سے ٹائم نکالنا ہی پڑا۔ صرف اور صرف ''خواب شیشے کا'' کی تعریف میں کچھ کہنے کے لیے۔ بے حد اچھی کہانی تھی جو اپنے بہترین اختتام کو پہنچی۔ شہزاد بھی بہت شاندار کہانی ہے، بالکل ویسی جیسی صائمہ جی سے امید تھی۔ درشہوار جیسی لڑکیاں نہ اس دنیا میں فلاح پاتی ہیں نہ اُس دنیا میں۔ خودغرضی کی آخری انتہا کو چھو رہی ہے وہ اس ٹائم۔

''شام کی حویلی میں'' فی الحال پڑھی نہیں، دو تین

UrduBooks.PK

اقساط اور آ جائیں پھر پڑھ کر تبصرہ کرنے کی کوشش کروں گی۔ باقی سلسلے خط جلدی لکھنے کے باعث پڑھ نہیں پائی۔

☆ پیاری ماہم! آپ تو ہماری ان قارئین میں سے ہیں جو ہر ماہ باقاعدگی سے شرکت کرتی رہی ہیں۔ اب کافی عرصے بعد آپ نے شرکت کی۔ کہاں غائب تھیں آپ؟

''شام کی حویلی میں'' رخسانہ نگار کا ناول ہے۔ دو تین قسطیں آنے کا انتظار نہ کریں اور پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

ایشال چوہدری نے نیو مری سے لکھا ہے

اتنا عرصہ غیر حاضر رہنے کی وجہ خاصی نامعقول ہے اگر آپ کے گوش گزار کر دیں تو آپ ہمارا خط ہی نہیں بلکہ ہمیں بھی ردی کی ٹوکری کے حوالے کر دیں۔ واللہ ہم اتنی بڑی سزا کے مستحق ہرگز نہیں ہیں کیونکہ ہم اپنے ہونے والے بے نام ونشاں ''ان'' کو وقت سے پہلے بیوہ نہیں کرنا چاہتے، ہاہاہا۔ اب تبصرہ بھی کر لوں جس کے لیے خط لکھا ہے۔ مہوش افتخار نے اینڈ جلدی کر دیا لیکن ناول زبردست تھا، گڈ۔ ''خواب شیشے کا'' کا اینڈ کچھ اسی طرح کا ذہن میں تھا۔ اچھا ناول تھا عفت سحر کا شکریہ۔

''بن پاکھی'' واؤ یار امیزنگ اسٹوری سندر بن، بنگلہ دیش اور انڈیا کے جنگلات اور پھر ٹائیگر اور سانپ۔ فرح بخاری دیٹس ناٹ فیئر۔ آپ کتنی خود غرض ہو تنہا اکیلے ہی سیر کر ڈالی اور ہمیں ہوا بھی نہ لگنے دی۔ مجھے نہیں پتا اس فنتاسٹک ناول کی ٹریٹ چاہیے، آپ جلدی سے سندر بن کی ٹرپ ارینج کرو۔ مجھے ٹائیگر اور سانپ دیکھنے کا بے حد شوق ہے۔ شعاع سسٹرز ریڈی رہیے جس نے جانا ہے ''اپنے خرچے پر'' سوائے میرے، ہاہاہا۔ اپنی بات الگ ہے فرح بخاری بہن لوگ ہے، (کیا واقعی سندر بن کا جنگل ہے یا تصوراتی دنیا تھی)۔ افشین نعیم کی سیریز بھی اچھی ہے (یار دل دار)۔

☆ پیاری ایشال! آپ کا خط شامل اشاعت ہے، ہم ہرگز آپ کے ''نامعلوم ہوتے والے'' کو ''بیوہ'' نہیں ہونے دینا چاہتے (ایک تصحیح کر دیں کہ مرد بیوہ نہیں ہوتے بلکہ ان کے لیے بیوہ کی جگہ رنڈوا استعمال کیا جاتا ہے)۔

فرح بخاری نے اتنا اچھا ناول لکھا اور آپ انہیں یہ سزا دے رہی ہیں کہ وہ آپ کو سندر بن کی ٹرپ ارینج کر کے دیں۔ وہ بھی اپنے خرچ پر؟ ویسے بھی انہوں نے تو آپ کو گھر بیٹھے سندر بن کی سیر کرا دی ہے۔ اب سندر بن جا کر کیا کریں گی آپ؟ سندر بن واقعی جنگل ہے۔ بنگلہ دیش جو کبھی مشرقی پاکستان تھا اسے ہم نے اپنی غلطیوں سے گنوا دیا۔

فائزہ بھٹی پتوکی سے شریک محفل ہیں

اس دفعہ شعاع نے انتظار کے معاملے میں ظالم سنگ دل محبوب کی سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ پلیز اس بارے میں کچھ سوچیے۔

فہرست میں رخسانہ نگار کو دیکھا اور پھر اگلے ہی صفحے پر آپ بھی ان کے ناول کے بارے میں خوش خبری سنا رہی تھیں۔ کہانی کا تو مجھے ابھی کچھ پتا نہیں مگر نام ''شام کی حویلی میں'' نے میرا جی خوش کر دیا۔ حد درجے پسند آیا یہ نام۔ کہانی بھی اچھی لگ رہی ہے۔

''شہرزاد'' در شہوار تم نے قسم کھا رکھی ہے کہ ہادی کو جیل بھجوا کر رہو گی۔ کچھ خدا کا خوف کرو تم۔ ہادی کا رویہ تمہارے ساتھ بالکل ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا

''مٹھی میں جگنو'' بی سحر ملک کا نام پڑھ کر پہلے تو سوچا یہ بنت سحر تو نہیں جنہوں نے بنت کا بی کر لیا ہو۔ کہانی طویل اور اچھی تھی مزہ آیا پڑھ کر۔

''گردش ایام'' اچھا لکھا نعیمہ ناز نے۔ عباد زیادہ پاور فل شخصیت کا حامل تھا۔ اگر شبینہ اس کا مقدر بنتی تو زیادہ اچھا لگتا۔

منشاء محسن علی تو ''بیلا'' کے بعد سے مجھے بالکل نہیں بھولتیں۔ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ آج کل نئی لکھنے والیاں جنہوں نے لکھا تو ہے مگر بہت زیادہ نہیں۔ بہت اچھا لکھ رہی ہیں، جیسا کہ منشاء محسن، نازیہ رزاق، فرزانہ کھرل، وغیرہ۔

خط آپ کے اس دفعہ بڑا روشن روشن لگا۔

ایک اور بات ہم نے سنا ہے کہ نایاب جیلانی ہماری پسندیدہ رائٹر، ان کے خاوند کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ

UrduBooks.pk

خالق حقیقی سے جاملے ہیں۔

☆ پیاری فائزہ! نایاب جیلانی کے بارے میں یہ خبر ہم نے بھی سنی تھی۔ تصدیق کے لیے نایاب کو فون کیا تو ان کا فون بند جارہا تھا۔ اس خبر میں کوئی صداقت ہوتی تو نایاب ہمیں فون کرتیں یا دوسری کوئی رائٹر یہ اطلاع دیتیں نایاب کی بہت سی رائٹرز کے ساتھ دوستی ہے، یہ معاملہ انتہائی تکلیف دہ ہے بنا تصدیق کیے ہمیں مناسب نہیں لگا کہ ہم خبر لگائیں۔

آپ کا تبصرہ جامع اور دلچسپ ہے۔ بہت شکریہ۔ اگرچہ کہ ہم پورا تبصرہ شائع نہیں کرسکے۔

بی سحر ملک، بنت سحر نہیں ہے۔ بنت سحر کچھ ذاتی وجوہات کی بنا پر لکھنا چھوڑ چکی ہیں۔

کراچی سے تسنیم کوثر نے لکھا ہے

جی ہاں ہمیں بہت ہی اچھی طرح سے پتا چل گیا ہے کہ خاموشی کو کیسے توڑا جاتا ہے لیکن ذرا یہ تو بتائیے کہ اگر ہم قارئین چپ سادھ لیں تو پھر آپ کا کیا ردعمل ہوگا۔ چلیں چھوڑیں ان باتوں کو، ہم نے یہ سوچا ہے کہ آپ کی محفل میں، ہم ایک بریک کے بعد نہیں بلکہ دو تین بریک کے بعد حاضر ہوا کریں گے، کیا خیال ہے۔

دوسری بات یہ کہ صفحات کی کمی تو مسئلہ ہے تو کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ شعاع کی قیمت میں خاطر خواہ اضافہ کرکے صفحات کی کمی کا تھوڑا بہت ازالہ کردیں۔

☆ پیاری تسنیم یہ وقفہ دے کر شرکت کرنے والی بات کیوں؟ ہمیں تو اچھا لگتا ہے کہ قارئین ہمیں ہر ماہ خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کریں۔ بہرحال اگر آپ کی کوئی مجبوری ہے تو پھر آپ پچھلے ماہ کی تحریروں کے بارے میں بھی لکھیں۔ رہی یہ بات کہ قارئین چپ سادھ لیں تو ہم کیا کریں گے؟ تو بھئی جب کوئی اپنا روٹھ جائے تو کیا کیا جاتا ہے۔ اسے منایا جاتا ہے نا۔ تو ہم بھی اپنی قارئین سے خاموشی کی وجہ پوچھیں گے، انہیں منائیں گے۔

نفیسہ نے ڈھونڈیانوالہ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

شعاع، کرن، خواتین، آپ کے ادارے کے تینوں رسالے بہت زبردست ہیں۔ یہ میرا کسی بھی رسالے میں پہلا خط ہے۔ شعاع میں شامل "خواب شیشے کا" یہ بہت اچھی تحریر ہے اور "شہرزاد" تو جان ہے رسالے کی پلیز اس کہانی کو جلدی ختم نہ کیجیے گا۔ مزا آتا ہے پڑھ کر اور پرانی مصنفین فرحت اشتیاق، نمرہ بخاری، نایاب جیلانی میں ان کو بہت مس کرتی ہو۔ "یار دل دار" اس کو جاری رکھیے گا، بہت زبردست تحریر ہے۔ "بن پاکھی" بھی اچھی تحریر تھی۔ شعاع کے سب سلسلے خاص طور پر "کھلتا کسی پر کیوں" اور "باتوں سے خوشبو" بہت اچھے ہیں۔

ایک فرمائش ہے کہ شاہین رشید سب کے انٹرویو کرتی ہیں تو پلیز ان کا بھی بھی انٹرویو شامل کریں۔ بہت خوشی ہوگی ان کے بارے میں جان کر۔

☆ پیاری نفیسہ! شاہین رشید ہماری بہت اچھی ساتھی ہیں۔ ایک طویل عرصے سے ادارے سے وابستہ ہیں۔ ہماری بڑی خواہش ہے کہ ان کا انٹرویو شائع کیا جائے مگر وہ اس کے لیے راضی نہیں۔ انہوں نے خود بلاشبہ ہزاروں انٹرویو لیے ہیں لیکن انٹرویو دینے کی بات کریں تو صاف انکار کردیتی ہیں۔ بہرحال ہم آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔

آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ اپنی باجی کو ہماری طرف سے سلام کہیے گا۔

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

UrduBooks.pk

English
POWER OF
11
HERBS
FOR
HEALTHY MOUTH
دانتوں کی Problems کا
Herbal Solution
English
Herbal
Sarwana & Sohzsihm
English.toothpaste
@SnScare

صائمہ اکرم چوہدری

شہزاد

شہزاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا، اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے' ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بینچ کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پٹری پار کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہو گئی۔

میر ہاؤس میں محتشم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔

محتشم علی خان ایم این اے ہیں، ان کے تین بیٹے وہاج، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام در شہوار ہے۔ خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیہ اور طوبیٰ ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت بیگم سے دوسری شادی کی لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے تو، تو ان کے دونوں بچے نمیرہ اور

UrduBooks.pk

ارسل کی پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نمیرہ کو لگائی بجھائی کی عادت ہے۔

ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبیٰ اور در شہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔ انابیہ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے، لیکن برہان کا سرد رویہ اسے افسردہ کرتا ہے۔

ٹینا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں، دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں، آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف بیورو کریٹ سیف الرحمن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی شہزاد جسے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیصہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکینڈل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے خودکشی کی دھمکی دے کر شہزاد کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہزاد کی آمد ٹینا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہزاد پاکستان آئی تو ایک پرانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ طوبیٰ اور در شہوار غلطی سے برابر والے گھر میں داخل ہوئیں تو پتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا، وہاں محمد ہادی آ چکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے، تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنی دوست سعد کو بھی اپنے بنگلے میں لے آیا ہے۔

محتشم علی کا بیٹا وہاج شادی شدہ ہے لیکن گھر کی ملازمہ صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیصہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور ٹینا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہزاد اسے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

در شہوار اور طوبیٰ محمد ہادی کے بنگلے میں جاتے ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں، محمد ہادی سختی سے پیش آتا ہے تو در شہوار اسے دھمکی دیتی ہے، ان دونوں کے درمیان ٹھن جاتی ہے۔

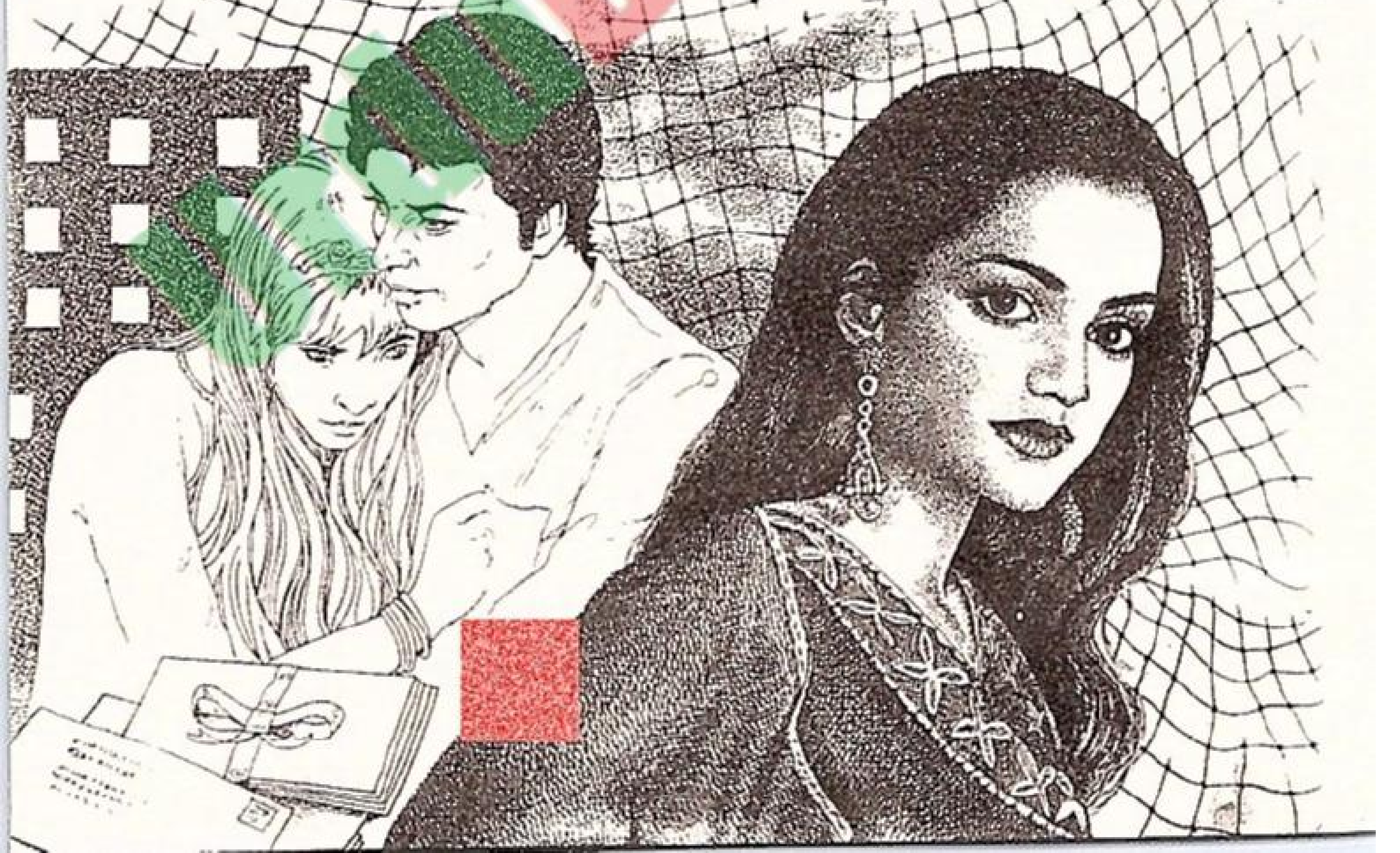

یہ جان کر کہ مناہل، ہادی کی بہن ہے درشہوار کا رویہ اس سے بدل جاتا ہے۔ مناہل اور برہان کی بے تکلفی سے اسے انابیہ کے مستقبل کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ وقار درانی، شہزاد کے پاس سمجھنے کے لیے آتے ہیں۔ ہارون رضا، سیفی کے فون سے مشتعل ہوکر ثمینہ بیگم کو طلاق دے دیتے ہیں۔ شجاع غنی کیس واپس لے لیتا ہے، اس بار پر ہادی اور شہزاد بہت چراغ پا ہوتے ہیں مگر کچھ کر نہیں پاتے۔ رومیصہ اور وہ ایک گھر میں جاکر چھپتے ہیں جہاں رومیصہ اسے اپنے حالات و واقعات سے آگاہ کرتی ہے۔ دونوں کا نیا رشتہ قریب لے آتا ہے۔ یہ جان کر کہ شاہ

میر طوبیٰ کو پسند کرتا ہے تاجدار بیگم کا غصہ گھر میں سب پر اترتا ہے۔ صندل کی بہن سندس کو طوبیٰ کی پرانی کتابوں سے اپنی بہن کا آخری خط ملتا ہے اور وہ حقیقت جان لیتی ہے۔

مونیکا، ذوالکفل کو مائیکل کی آمد سے آگاہ کرتی ہے، وہ اسے لاہور آنے کا مشورہ دیتا ہے۔

صندل کے گھر والے اس کی موت کی وجہ جان کر راتوں رات حویلی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ رومیصہ کو ارسل بحفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے۔ شجاع غنی میر حاکم کی دھمکیوں کی وجہ سے کیس واپس لے لیتا ہے، شہزاد کو یہ جان کر صدمہ ہوتا ہے، ہادی کو بھی غصہ آتا ہے اور اسی وجہ سے اسے درشہوار مزید بری لگتی ہے۔

انابیہ، درشہوار اور مناہل کی بے تکلف گفتگو سن کر صدمے کا شکار ہوجاتی ہے اور درشہوار اور برہان کے ساتھ بے رخی سے پیش آتی ہے جسے وہ دونوں بہت محسوس کرتے ہیں۔

مسجد کے برابر میں گھر لینے پر مونیکا شدید غصے کا اظہار کرتی ہے۔ ہم زاد کو شہزاد اور ارتضیٰ کا ساتھ بہت برا لگتا ہے۔

صندل کے گھر والے، شہزاد کے چوکیدار کے رشتے دار ہیں اور اسی حوالے سے وہ شہزاد کے گھر ملازمت کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔

مسز قریشی کے ڈنر میں برہان اور درشہوار کو دیکھ کر ہادی کو دھچکا لگتا ہے۔ وہ مناہل کو اشاروں میں برہان سے دور رہنے کا کہتا ہے مگر وہ اس کی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔ طوبیٰ اور نمیرہ کی باتوں سے برہان کو درشہوار اور ہادی کے بارے میں پتا چلتا ہے وہ اپنی ماں کو بتاتے ہیں اور درشہوار کی شادی ارسل سے کرانے کا مشورہ دیتے ہیں، اس رشتے پر داجی کو بھی اعتراض نہیں۔

ہم زاد، شہزاد کو اپنی فیملی کے بارے میں بتاتا ہے۔ ارسل کی کوششوں سے روحیل کا دوست صارم خان، رومیصہ کے حق میں گواہی دیتا ہے جس سے کیس کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ منال کو یونی ورسٹی میں برہان اور انابیہ کی شادی کا دعوت نامہ موصول ہوتا ہے۔

برہان کی شادی کا مناہل کو سخت برا لگتا ہے۔ وہ دہنی جان لگتی ہے مگر ہادی کے سمجھانے پر اپنا ارادہ بدل لیتی ہے۔ برہان اور تاج دار بیگم کی خواہش پر درشہوار کا رشتہ ارسل سے اور شاہ میر کا رشتہ نمیر سے طے کردیا جاتا ہے۔

داجی کا یہ فیصلہ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے لیے بھی پریشان کن ہے۔

مونیکا امتحان دے کر ذوالکفل کے ساتھ عمرے پر چلی جاتی ہے اور گھر والوں کو شادی اور اسلام قبول کرنے کا بتا دیتی ہے۔

صارم کو قتل کردیا جاتا ہے۔ ہم زاد شہزاد کی سیکیورٹی کا بندوبست کرتا ہے۔ رومیصہ کو ڈاکٹر خوش خبری سناتا ہے یہ خبر رومیصہ اور ارسل کے لیے پریشانی لاتی ہے۔

ارسل رومیصہ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا ہے تو وہاں پتا چلتا ہے کہ رومیصہ ماں بننے والی ہے۔ ارسل بہت خوش ہوتا ہے، رومیصہ خوف زدہ ہوجاتی ہے آگے کا سوچ کر وہ بچہ ختم کرانے کا کہتی ہے۔ ارسل غصے میں رومیصہ کو تھپڑ مار دیتا ہے۔

میر ہاؤس میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری ہیں، در شہوار سب سے بدتمیزی کرتی ہے۔
برہان، مناہل کے اچانک غائب ہو جانے پر پریشان ہیں۔ وہ سعد سے ملتے ہیں تو حیرت زدہ رہ جاتے ہیں کہ اسے ان کی شادی کے بارے میں پتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ بات تو ہادی اور مناہل کو بھی پتا ہے۔
سعد کو اچانک مناہل میں دلچسپی ہو جاتی ہے۔
شیری رضا سے میجر توصیف کے بارے میں پوچھتی ہے وہ دراصل ہم زاد کا راز جاننا چاہتی ہے۔ ہم زاد شیری کی غیر موجودگی میں اس کے گھر کی سیکیورٹی کی جانچ کے لیے آتا ہے اور شیری کے پسندیدہ پرفیوم کی بوتل لے جاتا ہے۔
در شہوار، ارسل کے کمرے میں جا کر بدتمیزی کرتی ہے اور اس کے کمرے کا سامان توڑ پھوڑ دیتی ہے۔ برہان اور تاجدار بیگم معاملہ سنبھالتے ہیں۔ در شہوار ہادی کو فون کر کے بلیک میل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔
شیری، ارتضیٰ کے ساتھ، صارم کے والد سے بات چیت کرنے جاتی ہے۔ راستے میں ہم زاد کی کال آتی ہے کہ ان کی گاڑی کا تعاقب کیا جا رہا ہے اور ارتضیٰ ان کا نشانہ ہے۔ ہم زاد، شیری کو گاڑی سے اترنے کا کہتا ہے کہ......
ہم زاد شہر یار کو فون کرتا ہے کہ ارتضیٰ کی گاڑی سے اتر کر وہ ان کی گاڑی میں آ جائے۔ اسی دوران ان کے پیچھے پڑے لوگ فائر کھول دیتے ہیں اور ارتضیٰ زخمی ہو جاتا ہے۔ شہزاد کے پاؤں پر بھی چوٹ لگتی ہے۔

اُنیسویں قسط

قریشی ہاؤس میں تو گویا ایمرجنسی نافذ ہو گئی۔۔۔!!!
در شہوار کی اس بچگانہ حرکت نے ایک لمحے کو ہادی کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔۔۔!!!
وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا یہ لڑکی جذباتی ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی بے وقوف بھی ہو سکتی ہے کہ خود کو ہی نقصان پہنچا لے، لیکن اس نے اس موقع پر اپنے حواس برقرار رکھے، در شہوار کی چیخ کی آواز تو شہزاد نے بھی سنی تھی اور پریشانی سے ہادی کی طرف دیکھا جو اسے مسز قریشی کے کمرے کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہ دونوں ٹھٹک کر رکے اور ہادی نے چیخ کی آواز سے فوری طور پر اندازہ لگا لیا کہ یہ اوپر کے پورشن سے آئی ہے۔
”میرا خیال ہے کسی ملازمہ کو چوٹ لگی ہے، آپ سامنے ممی کے کمرے میں چلی جائیں، میں دیکھ کر آتا ہوں۔“
شہزاد جیسے ہی ان کے کمرے کی طرف بڑھی، ہادی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سٹنگ روم میں موجود سیڑھیوں کی جانب گیا، جہاں فرسٹ فلور پر در شہوار نے مناہل کے کمرے میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔
جیسے ہی وہ در شہوار کے کمرے میں پہنچا، فرش پر بہتی ہوئی خون کی لکیر کو دیکھ کر اسے دھچکا لگا، وہ تکلیف کے گہرے احساس سے دہری ہوئی جا رہی تھی۔ ہادی کو فوراً ہی اس کی بے وقوفی کا ادراک ہوا، فرش پر شیشے کی بکھری ہوئی کرچیاں اسے ساری ان کہی داستان سنا چکی تھیں۔
”پاگل ہو گئی ہو کیا؟ دماغ کام نہیں کرتا تمہارا۔؟ اگر مرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنے گھر جاؤ، ہمیں کیوں عذاب میں ڈال رکھا ہے تم نے۔“
اس نے غصے سے بیڈ پر رکھا اس کا دوپٹہ اٹھا کر بے دردی سے پھاڑا اور غصے سے اس کی کلائی پر باندھ کر خون روکنے کی کوشش کی۔ وہ بہت قریب سے ہادی کے چہرے کے بگڑے ہوئے نقوش دیکھ رہی تھی۔
”بہت نارمل بنی ہوئی تھیں ناں، اب برداشت کرو۔“ وہ پٹی کرتے ہوئے مسلسل غصے سے بول رہا تھا۔
در شہوار کا ایک آنسو پھسلتا ٹھوڑی تک آیا اور ہادی کے ہاتھ پر جا گرا۔ ہادی نے ہاتھ کو یوں جھٹکا دیا جیسے وہ

آنسو نہ ہو کوئی جلتا ہوا انگارہ ہو۔ اس کا رنگ چند ہی لمحوں میں نچڑ گیا، وہ اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا کر تکلیف کو برداشت کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔" اس نے آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اٹھایا اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"دل تو چاہتا ہے اٹھا کر میر ہاؤس میں پھینک آؤں تاکہ ہمارے سروں سے تو یہ عذاب ٹلے۔" اس کی بات سن کر وہ اب ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

"پتا نہیں کس گناہ کی سزا ملی ہے؟" وہ بڑبڑاتے ہوئے حمزہ کا نمبر ملانے لگا، اس کی آواز میں ایسی تلخی رچی ہوئی تھی جسے محسوس کر کے درشہوار کے آنسوؤں میں اور زیادہ تیزی آ گئی، وہ جذباتی ہو کر یہ قدم اٹھا تو بیٹھی تھی لیکن اب اس سے ضبط کرنا محال ہو رہا تھا۔

محمد ہادی نے مختصر الفاظ میں میجر حمزہ کو فون پر سارا قصہ سنایا، جو ان کے لان میں موجود تھا۔ ان لمحات میں وہ حمزہ کے علاوہ کسی اور پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے بات کرنے کے بعد اس نے مسز قریشی کو بھی کال کر دی، جو اس وقت اپنے بیڈ روم میں شہزاد کے ساتھ موجود تھیں۔

"مام پلیز آپ ارتضیٰ کو بھی بلوالیں اپنے روم میں، مجھے حمزہ کے ساتھ جانا ہوگا۔" اس نے انہیں محتاط انداز میں بتا کر فون بند کیا۔ ارتضیٰ اس وقت حمزہ کے ساتھ ان کے گھر کے لان میں موجود تھا اور دونوں کے درمیان سرد مہری کی فضا قائم ہو چکی تھی۔

حمزہ اور ہادی دونوں درشہوار کو لے کر ایک پرائیوٹ ہاسپٹل پہنچے، جو حمزہ کے بہت اچھے دوست کا تھا۔

رات گئے تک درشہوار کی چھوٹی سی سرجری ہوئی جس میں اس کی کٹی ہوئی رگ کو ڈاکٹر نے مہارت سے جوڑ دیا تھا، جبکہ وہ دونوں ویٹنگ روم میں تھے۔ حمزہ کافی مطمئن تھا اور ہادی کے چہرے پر پریشانی کا تاثر نمایاں تھا۔

"تم اس لڑکی کو پہلی فرصت میں کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھاؤ، مجھے یہ نارمل نہیں لگتی۔" حمزہ نے سارا قصہ سننے کے بعد اسے مشورہ دیا۔

"پورا خاندان ہی پاگلوں سے بھرا ہوا ہے، کس کس کو دکھاؤں؟" وہ تپ کر بولا۔

"کچھ بھی کہو ہادی، لڑکی جی دار ہے، محبت کرتی ہے تم سے۔" اس نے معاملے کی سنگینی کو محسوس کر کے اسے تھوڑا پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

"بھاڑ میں جائے اس کی محبت، مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں ہے اس میں اور نہ اس کے خاندان میں۔" وہ بے زاری سے گویا ہوا۔

"تو پھر کس میں انٹرسٹ ہے میرے یار کو۔" حمزہ نے اسے چھیڑا۔

"کسی میں بھی نہیں، میں یہ محبت وحبت کے چکروں میں پڑنے والا نہیں ہوں، لیکن یہ تو عذاب بن کر نازل ہو گئی ہے ہم سب کے سروں پر۔ ممی، پاپا سب کو اپ سیٹ کر رکھا ہے اس نے۔" وہ پریشان لہجے میں بول رہا تھا۔

"میری مانو جان چھڑاؤ اس لڑکی سے، تم جانتے نہیں ہو اس کے باپ دادا کو، یہ لوگ اقتدار اور پیسے کے لیے آخری حد تک جا سکتے ہیں۔" حمزہ نے خلوص دل سے اسے مشورہ دیا۔

"مجھ سے زیادہ ان کے خاندان کی گندی سیاست کو کون جان سکتا ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا اس مصیبت سے کیسے جان چھڑائیں۔" وہ تپ کر بولا۔

"بے فکر رہو، شہزاد ان کے خاندان کے پیچھے ہے اور ان کو ان کے انجام تک پہنچا کر ہی دم لے گی۔" حمزہ نے جیسے ہی شہزاد کا نام لیا اس کی کال آ گئی۔

''محبت دیکھو ہماری، ادھر نام لیا اور ادھر محترمہ کی کال آگئی۔۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اپنے سیل فون کی طرف اشارہ کیا۔

☆☆☆

وہ ابھی ابھی مسز قریشی کے گھر سے آئی تھی اور نہ جانے کیوں اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی، وہاں ان کے گھر میں کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا ہے، جس طرح مسز قریشی کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی تھیں اور سونے پہ سہاگہ ارتضٰی نے بتایا کہ حمزہ اور ہادی بھی اچانک غائب ہوگئے تھے۔

اس نے گھر واپس پہنچتے ہی سب سے پہلے حمزہ کا نمبر ملایا تا کہ اس سے خیر خیریت پوچھ سکے۔ دوسری طرف وہ، ہادی کے گھر میں خود کو نظر انداز کیے جانے پر جلا بیٹھا تھا۔

''جی فرمایئے محترمہ، یادداشت بحال ہوگئی آپ کی؟'' حمزہ نے کال اٹینڈ کرتے ہی طنزیہ انداز میں کہا۔

''آئی ایم سوری، ارتضٰی اور ہادی کی وجہ سے میں نے مخاطب نہیں کیا تھا آپ کو۔'' دوسری طرف وہ شرمندگی سے گویا ہوئی۔

''کیوں ان دونوں نے مجھ سے بات کرنے پر کوئی جرمانہ لگا دینا تھا آپ پر۔'' اس کے طنز پر وہ مزید خفت کا شکار ہوئی۔

''ناٹ ایٹ آل، ایکچوئلی تھوڑا عجیب لگتا ہے مجھے دوسروں کے سامنے۔'' شہرزاد کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ اپنی بات کی وضاحت کیسے کرے۔

''یقین مانیں شہرزاد، جب آپ جیسی ویل ایجوکیٹڈ، اور کانفیڈنٹ لڑکی ایسی امیچورڈ باتیں کرتی ہے تو مجھ جیسے انسان کو بہت غصہ آتا ہے۔'' حمزہ آج اسے معاف کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

''اور جب آپ جیسا کیئرنگ اور سینس ایبل شخص کسی کی ریپوٹیشن کے معاملے کو اتنا ایزی لینے لگے تو مجھ جیسے انسان کو بھی بہت غصہ آتا ہے۔'' وہ بھی کون سا کسی سے کم تھی، اس نے بھی دوبدو جواب دیا۔

''شہرزاد کم از کم تم میرے معاملے میں ایسی کوئی بات نہیں کر سکتی ہو۔ میں نے ہمیشہ اپنے سے زیادہ تمہاری عزت کا خیال کیا ہے، ورنہ جتنی شدت سے میں نے تمہیں چاہا ہے، ایسی کیفیت میں تو انسان ویسے ہی اپنے حواسوں میں نہیں رہتا۔''

حمزہ کی ضرورت سے زیادہ سنجیدگی پر اس کے سامنے بیٹھے ہادی نے بغور اسے دیکھا، حمزہ کے چہرے کی برہمی اس سے چھپی نہیں رہ سکی۔ ویسے بھی دونوں کی ہر بات ایک دوسرے سے چھپی نہ تھی۔ اس لیے وہ، اس کی موجودگی میں بھی کھل کر بات کر رہا تھا۔

''میں نے یونہی ایک بات کی ہے حمزہ، آپ کیوں اتنا سیریس ہو رہے ہیں۔۔؟'' وہ پریشان ہوئی۔

''او کے لیو اٹ، بولو، خیریت سے کال کی تھی تم نے؟'' حمزہ نے دانستہ ہلکا پھلکا انداز اپنایا، اس کا مقصد اسے اپ سیٹ کرنا نہیں تھا۔

''ہاں تھوڑی پریشانی ہو رہی تھی مجھے، کیا مسز قریشی کے ہاں کوئی پرابلم ہوئی ہے؟'' اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔

''تمہیں کس نے کہا؟'' حمزہ چونکا۔

''بس ایسے ہی محسوس ہوا تھا مجھے اور مسز قریشی بھی اپ سیٹ لگ رہی تھیں۔'' شہرزاد نے کھل کر بتایا۔

''ہاں ایک ایشو چل تو رہا ہے، کل تمہارے آفس کا چکر لگاؤں گا۔ تو وہاں بیٹھ کر بات کرتے ہیں، ابھی

UrduBooks.pk

ہادی کے ساتھ بزی ہوں۔"

حمزہ نے جان بوجھ کر ہادی کا نام لیا تا کہ فون کے دوسری طرف وہ سمجھ جائے اور شہزاد نے بھی سیکنڈز میں معاملہ بھانپ لیا اس لیے اصرار نہیں کیا اور سلام دعا کے بعد فون بند کر دیا۔

☆☆☆

نور محل آج کل نا امیدی اور مایوسی کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔

میر حاکم کی صدارت میں ہونے والے اس گھریلو اجلاس میں سب کے چہروں پر تشویش اور پریشانی کے رنگ صاف بڑھتے جا رہے تھے۔

حاکم علی کی صندل اور وہاج کے سلسلے میں ہونے والی کانفرنس زیادہ کامیاب نہیں ہوئی، ان کے مخالفین نے ان پر کھل کر تنقید کی، جسے بظاہر تو انہوں نے بڑے تحمل سے سنا لیکن ان کے اندر ابال اٹھ رہے تھے۔ اس کانفرنس کے بعد وہ سیدھے اپنے اسلام آباد والے گھر آ گئے جہاں میر ہاؤس کے سب بڑوں نے ڈیرہ جما رکھا تھا، کئی گئی گھنٹے وہاں بحث چلتی۔ صندل کیس نے ان سب کو حقیقت میں بوکھلا رکھا تھا۔

"مجھے تو ملتان والی سیٹ صاف نکلتی نظر آ رہی ہے اپنے ہاتھوں سے۔" میر حاکم کو وہاج کی گمشدگی سے زیادہ الیکشن کی فکر تھی۔

"حالات بھی تو سازگار نظر نہیں آ رہے۔" خاقان کا لہجہ بھی پریشانی میں ڈوبا ہوا تھا۔

سٹنگ روم کے ایک کونے میں فارحہ بھابھی بھی موجود تھیں اور اندرونی خلفشار کے تحت اپنے انگوٹھے کا ناخن بار بار چبا رہی تھیں اور تاجدار بیگم کو ان کی اس حرکت پر کراہت محسوس ہو رہی تھی لیکن یہ موقع فارحہ کو جھاڑنے کا نہیں تھا۔

"اب تو مجھے بھی لگتا ہے، وہاج کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ چکا ہے، ورنہ وہ کسی نہ کسی سے تو رابطہ ضرور کرتا۔" محتشم علی ہلکا سا جھجک کر بولے۔ اپنی اولاد کے لیے ان کا فکر مند ہونا فطری تھا۔

"اللہ نہ کرے۔ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔" تاجدار بیگم نے دہل کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور ناراضی سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ جبکہ حاکم علی کا ذہن ابھی تک اس کانفرنس میں الجھا ہوا تھا۔ جہاں صحافیوں نے ان کا اپنے تلخ سوالات کے ذریعے اچھا خاصا موڈ خراب کر دیا تھا۔ اسی وقت حاکم علی کے سیل فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف کسی سیاسی شو کا کوئی مشہور و معروف اینکر تھا، جو شاید اپنے پروگرام کے لیے ان کا موقف ریکارڈ کرنا چاہتا تھا۔

"میرا تو دماغ ہی خراب کر دیا ان دو ٹکے کے صحافیوں نے۔" انہوں نے بےزاری سے کال کاٹ دی۔

"وہ تھرڈ کلاس جرنلسٹ نعیم مرتضیٰ کہہ رہا تھا یہ اغوا کا ٹوپی ڈرامہ ہم نے محض وہاج کا جرم چھپانے کے لیے کیا ہے۔" خاقان علی کو بھی یاد آیا۔

"ہاں تو کون سا غلط کہا ہے اس نے۔" حاکم علی بھڑک کر بولے تو ان کے دونوں بیٹوں نے یوں دیکھا جیسے ان کی خرابی دماغ کا یقین ہو گیا ہو۔

"اس بے غیرت کے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ہی تو کیا ہے ہم نے یہ ڈراما۔ آج لفافے بھجواؤ ان سب کو، پھر دیکھنا کیسے ہمارے حق میں دھڑا دھڑ بولتے ہیں۔ ان سب کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے۔" میر حاکم کے نزدیک ہر مسئلے کا حل صرف پیسہ تھا۔

"لفافے اس مسئلے کا حل نہیں ہیں بابا جان، وہاج کا سامنے آنا ضروری ہے، گنتی کے کچھ ہی تو دن رہ گئے

UrduBooks.pk

ہیں الیکشن میں۔'' خاقان نے محتاط انداز اپنایا۔
''تم مانو یا نہ مانو لیکن مجھے یقین ہو گیا ہے وہاج نے کوئی گھٹیا حرکت کی ضرور ہے اور میرے سورسز بتاتے ہیں، بیرسٹر عالیہ قریشی کے پاس باقاعدہ ثبوت ہے اس چیز کا۔''
''کیسا ثبوت بابا جان؟'' محتشم علی کا رنگ اڑا۔
''لمبی چوڑی میڈیکل رپورٹ ہے صندل کی، اور تو اور پوسٹ مارٹم تک کروا ڈالا۔ کاش وہ نمک حرام بہادر علی مجھ سے رابطہ کر لیتا، میں کچھ دے دلا کر یہ معاملہ ہی ختم کروا دیتا۔'' حاکم علی نے بے بس انداز میں ہاتھ ملے۔
''پتا نہیں کیوں، ابا جی مجھے یقین نہیں آ رہا کہ وہاج ایسی حرکت کر سکتا ہے۔'' تاجدار بیگم جذباتی ہوئیں۔
''تمہارا تو بالکل ہی دماغ خراب ہو گیا ہے تاجدار بیگم۔'' وہ غصے کی شدت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے ہاتھ کی چھڑی پر زور ڈال کر مزید گویا ہوئے۔ ''کیا میڈیکل رپورٹ غلط کہہ رہی ہے؟ صندل کا خاندان جھوٹ بول رہا ہے، کوئی ماننے والی بات تو کیا کرو تاجدار، تم تو اپنی اولاد کی محبت میں بالکل ہی اندھی ہو جاتی ہو۔'' میر حاکم ایک دم بھڑکے تو کونے میں بیٹھی ہوئی فارحہ بھابھی کے بے جان وجود میں بھی ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی۔
''امی جان ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' فارحہ نے ہلکا سا جھجک کر اپنی ساس کی طرف داری کی تو سب چونک گئے۔
''لو، ان کی کمی تھی، یہ بھی شوہر کی محبت میں میدان میں اتر آئیں۔'' میر حاکم علی نے طنزیہ انداز میں ہنکارہ بھرا۔
''بابا جان، وہ میڈیکل رپورٹ غلط ہے، اور اگر وہ رپورٹ درست ہے تو کم از کم وہ بندہ وہاج نہیں ہے۔'' فارحہ نے کافی ہمت کا مظاہرہ کیا۔
فارحہ بھابھی کی بات پر کمرے میں ایک چھوٹا سا بلاسٹ ہوا تھا، سب نے بوکھلا کر ان کی طرف دیکھا، گہرے سیاہ رنگ کے سوٹ میں وہ سوگواریت کی ایک جیتی جاگتی تصویر بنی بیٹھی تھیں اور ان کے چہرے پر موجود تنی کا تاثر اتنا گہرا تھا کہ سب سے پہلے حاکم علی نے ہی اس بات کی گہرائی کو سمجھا اور ساتھ ہی ان کے تنے ہوئے اعصاب کچھ پرسکون ہوئے لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی۔
''رپورٹ غلط ہے، تم کیسے کہہ سکتی ہو یہ بات؟'' تاجدار بیگم کے انداز میں بے تابی کا عنصر واضح تھا۔
''سارا خاندان جانتا ہے، اولاد نہ ہونے کی قصوروار میں نہیں ہوں، اگر صندل کے والدین اپنی بیٹی کے حوالے سے ایسا کوئی دعویٰ کر رہے ہیں تو کم از کم یہ دعویٰ غلط ہے، باقی صندل کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتی۔'' فارحہ تلخ لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے سٹنگ روم سے نکل گئیں۔
''اوہ میرے خدایا، یہ تو سامنے کی بات تھی، میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی۔'' تاجدار بیگم بلند آواز میں بڑبڑائیں۔
اگرچہ فارحہ کے جملے خاصے تلخ اور کاٹ دار تھے لیکن اسے سننے کے بعد کمرے میں موجود افراد کے اندر گویا زندگی کی حرارت دوڑ گئی، اس پوائنٹ کی طرف تو انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا، حالانکہ یہ سامنے کی بات تھی۔ صندل کیس میں وہاج کی زندگی کی یہ سب سے بڑی کمی ان کے حق میں بہت بڑا پلس پوائنٹ بن چکی تھی اور میر حاکم علی اپنی اگلی چال اسی مہرے کے ساتھ کھیلنے کو تیار تھے۔

☆☆☆

شمال مغرب سمت سے آنے والی آندھی اپنے ساتھ گرد و غبار کا ایک طوفان لائی تھی۔

UrduBooks.PK

ذوالکفل اور مونیکا نے جیسے ہی ملتان کے ریلوے اسٹیشن پر قدم رکھا، گرم ہواؤں نے ان کا استقبال کیا۔ ساٹھ کلومیٹر فی گھنٹہ سے آنے والی اس آندھی نے پورے شہر کے اشتہاری بورڈز تک گرا دیئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہر طرف بس گرد ہی گرد ہو۔

ایسی ہی بدگمانی کی گرد، ان دونوں کے خاندان کے دلوں پر بھی چھائی ہوئی تھی جس سے انہیں جا کر نبٹنا تھا، وہ دونوں بظاہر اپنے چہروں سے پرسکون دکھائی دے رہے تھے لیکن آنے والے وقت کا خوف ان کی آنکھوں سے صاف چھلک رہا تھا۔

انہیں علم نہیں تھا، اس سے بھی بڑا طوفان بڑی حویلی میں ان کا منتظر ہے۔ جہاں ذوالکفل کی کرسچن لڑکی کے ساتھ شادی نے اس کے والدین کو آگ بگولہ کر رکھا تھا۔ اس کے والد کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنے سب سے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے کو اس خودسری پر عبرت کا نشان بنا دیں تاکہ ان کے خالص سادات گھرانے میں کسی اور خون کی ملاوٹ کا جرم آئندہ نسلوں میں کوئی بھی نہ کر سکے۔

بڑی حویلی میں رہنے والوں کے اپنے اصول و ضوابط تھے جن سے انحراف کرنا ان کے لیے بہت بڑا گناہ تھا اور وہ اس سے ہٹ کر کچھ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے لیکن وہ ذوالکفل تھا، اپنے سب بہن بھائیوں سے بہت مختلف۔

وہ باپ سے چھپ کر اپنے خاندانی ملازمین کی مدد کرتا اور انہیں اپنی طرح کا ہی انسان سمجھا کرتا تھا اور اس کی یہ انسانیت اس کے والد کو سخت ناگوار گزرتی تھی اور اس وجہ سے اسے کئی دفعہ وارننگ بھی مل چکی تھی ایک دفعہ تو انہوں نے اس کی ٹھیک ٹھاک ٹھکائی بھی کی تھی لیکن وہ پھر بھی باز نہیں آیا۔ نیکی اور نرمی اس کی سرشت میں شامل تھی وہ اپنی فطرت سے ہٹ کر زندگی کیسے بسر کر سکتا تھا۔

جب ذوالکفل نے این سی اے میں داخلہ لینے کا اعلان کیا تو تب بھی حویلی میں ایک طوفان آیا تھا لیکن اس بار بی جان ڈٹ گئیں اور وہ واحد خاتون تھیں جن کے سامنے کبھی کبھار بابا جان کی بھی نہیں چلتی تھی، اور پورا خاندان جانتا تھا وہ بی جان کا چہیتا تھا۔

''اور بھجواؤ اسے لاہور، چاند چڑھا دیا نا اس نے۔''

''پسند کی شادی ہی تو کی ہے بے چارے نے۔'' بی جان کے دل میں ابھی بھی اس کے لیے نرم گوشہ تھا۔

''اور وہ بھی ایک عیسائی لڑکی کے ساتھ، لعنت ہو ایسی اولاد پر۔'' انہوں نے غصے سے زمین پر پنچا تو ان کی بیوی سہم کر چپ ہو گئیں۔

ذوالکفل کی پسند کی شادی کی خبر نے حویلی کے در و بام کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور اب تو بی جان بھی سب سے نظریں چرائے پھرتی تھیں کیونکہ ان کی بہوؤں کی طنزیہ نگاہیں اور خاندان کے لوگوں کی باتوں نے ان کی زبان بند کر دی تھی۔ پسند کی شادی کو تو جیسے تیسے کر کے ہضم کر ہی لیا جاتا لیکن ایک غیر مسلم لڑکی کے ساتھ نکاح کرنے کا گناہ تو شاید ساری زندگی وہ لوگ معاف نہ کرتے، ذوالکفل کے والد کو جیسے ہی پتا چلا انہوں نے لاہور میں اپنے بندے بجھوائے تو انہیں علم ہوا، وہ دونوں عمرہ کرنے سعودیہ جا چکے ہیں۔

اس کے والد تب سے انگاروں پر لوٹ رہے تھے اور یہ بھڑاس نکالنے کا موقع ذوالکفل نے انہیں خود حویلی آ کر دے دیا تھا۔

ٹیکسی جیسے ہی بڑی حویلی کے باہر رکی، مونیکا نے سر اٹھا کر اس وسیع و عریض حویلی کو دیکھا جس کے لان میں سو سے زائد چارپائیاں بڑے آرام سے بچھائی جا سکتی تھیں۔ اس حویلی کی عمارت خاصی کشادہ تھی اور اس میں

UrduBooks.pk

بڑے بڑے لان، تہہ خانے اور بالا خانے بھی بنے ہوئے تھے۔ مونیکا کو اندازہ نہیں تھا کہ ذوالکفل کا تعلق اچھے خاصے امیر گھرانے سے ہوگا۔

ان دونوں کی آمد کی اطلاع جیسے ہی اندر پہنچی، کمروں میں ایک ہلچل اور بے چینی سی پھیل گئی، بی جان نے بے ساختہ دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا اور ان کی بہوئیں تجسس کے مارے دروازے کی اوٹ میں آن کھڑی ہوئیں۔ ملازمین کی آنکھوں میں بھی اشتیاق ٹھاٹیں مار رہا تھا، جس عیسائی لڑکی کو دن رات گھر میں غائبانہ کوسا جاتا تھا وہ اپنے شریک حیات کے ساتھ اس گھر میں قدم رکھ چکی تھی۔

سیاہ رنگ کے عبایہ اور پرنٹڈ اسکارف میں اس کا پرنور چہرہ خاصا چمک رہا تھا۔ ایمان کی روشنی نے اس کے چہرے پر ایک دل کو چھو لینے والی دلکشی کا احساس بھر دیا تھا، اس کے دل کے مزاج کا عکس اس کے پورے وجود سے نمایاں تھا۔ بی جان کو وہ پہلی ہی نظر میں اچھی لگی، وہ ان کے بیٹے کے ساتھ کھڑی خوب جچ رہی تھی اور بلاشبہ ان کی سب بہوؤں سے زیادہ پیاری اور معصوم دکھائی دے رہی تھی۔

ان دونوں کی آمد کی اطلاع ذوالکفل کے والد تک بھی پہنچ چکی تھی اور انہوں نے اپنے چٹختے ہوئے اعصاب کو سنبھالا اور غصے سے اپنے کمرے سے باہر قدم رکھا، وہ جہاں جہاں سے گزرتے تھے، حویلی کے ملازمین فوراً دائیں بائیں ہو جاتے، انہوں نے جیسے ہی دالان میں قدم رکھا، اپنے بیٹے کے ساتھ اندر آتی لڑکی کو دیکھ کر انہیں اپنے دل میں ناگواری کی ایک لہر اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''وہیں پر رک جاؤ تم دونوں۔ ایک قدم بھی آگے مت بڑھانا۔'' ان کی آواز میں دبی دبی غراہٹ تھی۔

''السلام علیکم بابا جان۔'' ذوالکفل نے گھبرا کر اپنے والد کو سلام کیا، جس کا جواب نہیں ملا۔

''اپنی بیوی سے کہو، اپنے ناپاک قدموں کے ساتھ میرے گھر کی دہلیز کو گندا مت کرے، جیسے آئے ہو، ویسے ہی پلٹ جاؤ ذوالکفل! ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' ان کی پاٹ دار آواز پوری حویلی میں گونجی اور جیسے پورے ماحول پر کسی نے منتر پھونک دیا ہو۔ پورا گھر ایک محسوس کیے جانے والے سناٹے کی لپیٹ میں آ گیا۔ ان کی بھابھیاں تو اب غیر ارادی طور پر باہر نکل آئیں اور بڑے مزے سے باہر کا منظر دیکھا۔

''بابا جان آپ میری بات تو سنیں۔'' ذوالکفل نے بولنے کی کوشش کی۔

''ایک لفظ بھی مت کہنا، تم نے اس عیسائی لڑکی سے شادی کر کے جو ہمارے خاندان کی عزت پر داغ لگایا ہے اس پر میں تمہیں ساری زندگی معاف نہیں کروں گا۔'' وہ نخوت زدہ انداز میں گویا ہوئے۔

''میں اسلام قبول کر چکی ہوں بابا جان۔'' مونیکا نے ان کے چہرے پر موجود تنفر سے نظریں چرا کر بڑے ہموار لہجے میں کہا تو انہیں کرنٹ لگا۔

''تم جیسی لڑکیاں، ہمارے جیسے اونچے خاندان کے مردوں سے شادی کرنے کے لیے اپنا مذہب تو کیا اپنا خاندان، اور سب کچھ داؤ پر لگا سکتی ہیں، اپنا اسٹیٹس اور اپنی اوقات بدلنے کا موقع بھی تو کبھی کبھی ہی ملتا ہے۔۔''

ان کا جواب مونیکا کے لیے کسی طمانچے سے کم نہیں تھا، اسے سنبھلنے میں چند سیکنڈ لگے۔ تذلیل کے احساس سے اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں۔

''بابا جان آپ مونیکا سے اور کچھ نہیں کہیں گے۔۔'' اپنی بیوی کی بے عزتی ذوالکفل سے برداشت نہیں ہوئی اور وہ کھل کر سامنے آ گیا۔

''ٹھیک ہے تم چھوڑ دو اس لڑکی کو، اور اللہ سے اپنی اس گمراہی پر توبہ کرو۔۔'' انہوں نے سختی سے کہا۔

''پہلی بات تو یہ ہے میں نے کوئی گمراہی نہیں کی، اہل کتاب کے ساتھ نکاح جائز ہے اور جہاں تک بات

UrduBooks.PK

اس لڑکی کی ہے اس نے مجھ سے شادی کے لیے اسلام قبول نہیں کیا، اللہ نے اسے خود ایمان کی روشنی سے نوازا تھا۔'' ذوالکفل نے بے زار لہجے میں جواب دیا۔

''جہاں کروڑوں کی جائیداد اور ہائی فائی خاندان نظر آ رہا ہو، وہاں ایسی دو ٹکے کی لڑکیاں سب سے پہلے اپنے ایمان کا ہی سودا کرتی ہیں۔'' انہوں نے بھی طیش سے مغلوب آواز میں چیخ کر کہا تو مونیکا کا چہرہ ذلت کے احساس سے سرخ ہو گیا۔

''بابا جان! اُف اُف...... اب آپ مزید زیادتی نہیں کریں گے میری بیوی کے ساتھ۔'' اس نے بامشکل خود پر قابو پا کے کہا۔

''تو ٹھیک ہے، دفع جاؤ میری حویلی سے اور دوبارہ اس منحوس لڑکی کے ساتھ یہاں قدم مت رکھنا۔''

''میں بھی آپ ہی کا بیٹا ہوں اگر میری بیوی کے لیے اس گھر کے دروازے بند ہیں تو میں بھی اس دہلیز پر کبھی تھوکنا بھی پسند نہیں کروں گا۔'' ذوالکفل کا ضبط بھی جواب دے گیا۔

اپنے بیٹے کی یہ بات انہیں مشتعل کر گئی، اس سے پہلے کہ وہ آپے سے باہر ہوتے، ذوالکفل نے مونیکا کا ہاتھ پکڑا اور تیز تیز قدموں کے ساتھ حویلی سے ہی نہیں ان سب کی زندگیوں سے بھی نکل گیا۔

☆☆☆

میر وہاج علی کو اپنے دوست اسد چیمہ کے خفیہ ٹھکانے میں چھپے ہوئے پورا ہفتہ ہو چکا تھا۔

وہ مسلسل کئی راتوں سے بے خوابی کا شکار تھے، ہر وقت دل کو دھڑکا لگا رہتا، خواب میں کبھی پولیس تو کبھی جیل دکھائی دیتی، اس دن حیدر کے ڈیرے سے نکل کر وہ اپنی گاڑی دوڑاتے ہوئے راتوں رات ملتان جا پہنچے، اور وہاں سے اپنے دوست اسد چیمہ کے پاس چلے آئے کیونکہ اس وقت ساری دنیا میں وہی ان کا ساتھ دے سکتا تھا جو ان کا شریک جرم بھی تھا۔

اسد لودھراں کے ایک نامور سیاسی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور ان کے ہاں بھی پیسے کی خوب ریل پیل تھی۔ وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور کوئی روک ٹوک نہ ہونے کی وجہ سے دنیا جہان کی برائیوں میں مبتلا ہو چکا تھا، مہینے میں پندرہ دن اس کے اسلام آباد میں نور محل کی انیکسی میں ہی گزرتے اور ساری دنیا جانتی تھی وہ وہاج کا گہرا دوست ہے۔

محتشم علی نے وہاج کی گمشدگی پر سب سے پہلی کال اسد کو ہی کی تھی، جس نے فوراً ہی لاعلمی کا اظہار کر کے اپنی جان چھڑائی۔

وہاج جب اپنے دوست حیدر سے مایوس ہو گئے تو ان کے ذہن میں اسد کا نام آیا جو اس سارے قصے میں ان کا پارٹنر تھا اور یہ بات ان کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ صندل کے ساتھ ایک دفعہ زیادتی کرنے کے بعد میر وہاج کے حوصلے کافی بلند ہو گئے تھے اور اگلے ہی دن وہ اپنے بہترین دوست اسد کو بھی لے آئے اور ایسا کوئی اگلے تین دن تک چلتا رہا، صندل بُری طرح سے خوف زدہ ہو چکی تھی اور جب اس کی حالت بگڑی تو میر وہاج نے بہانے سے اسے میر ہاؤس واپس بھجوا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا یہ گناہ وقت کی گرد میں دب جائے گا، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

میڈیا پر صندل کے حوالے سے آنے والی خبروں نے اگر وہاج کو پریشان کر رکھا تھا تو سکون میں اسد چیمہ بھی نہیں تھا، کیونکہ اسے علم تھا، جب بھی یہ قصہ کھلے گا تو اس میں اس کا نام بھی آئے گا۔ اس لیے دونوں کی ہی جان پر بنی ہوئی تھی، جبکہ اسد دل ہی دل میں خوب کھول رہا تھا اسے اس بات کی ٹینشن تھی کہ کہیں وہاج کی

موجودگی کا کسی کو علم نہ ہو جائے۔
اسد چیمہ کا یہ فلیٹ لودھراں کے ایک کمرشل پلازہ کی چوتھی منزل پر تھا اور یہاں سے نکلنا آسان نہیں تھا کیونکہ وہاج کی گمشدگی اور اس کے بعد میر حاکم کی پریس کانفرنس نے ان کے سارے دروازے بند کر دیئے تھے۔ وہاج کی تصویر بار بار ٹی وی اسکرین پر دکھائی جا رہی تھی جیسے ہی وہ باہر نکلتے تو کسی نہ کسی کی نظروں میں آ جاتے۔ اس لیے انہوں نے فلیٹ میں ہی دبک کر بیٹھنے میں عافیت جانی۔
''یار تم کیوں آ گئے یہاں؟ اپنے ساتھ مجھے بھی مروانے کا ارادہ ہے کیا؟'' اسد انہیں دیکھ کر گھبرا گیا۔
''تو اور کہاں جاتا، حیدر نے تو صاف انکار کر دیا تھا میری مدد کرنے سے۔'' وہاج نے اپنی مجبوری بتائی۔
''تم نے کہیں حیدر کے سامنے میرا نام تو نہیں لے لیا؟'' اسد کو ایک اور پریشانی نے آن گھیرا۔
''اتنا بے وقوف نہیں ہوں میں، اسے بتایا تھا میں نے کہ مجھ سے ہی غلطی ہوئی ہے اور وہ بے وقوف مجھے اوٹ پٹانگ مشورے دے رہا تھا۔'' وہاج کی بات پر اسد نے تھوڑا سکون کا سانس لیا۔
''ویسے تو تمہارے داجی بڑے سیاست دان بنے پھرتے ہیں، لیکن یہ آخر چول ماری ہے انہوں نے۔'' اسد نے بے زاری سے ٹی وی اسکرین کی طرف اشارہ کیا جہاں وہ کچھ صحافیوں کے وہاج کے اغوا کیس کے حوالے سے سوالوں کے جوابات دے رہے تھے۔
''اس میں چول مارنے والی کیا بات ہے......؟'' وہاج برا مان گئے۔
''کیا ضرورت تھی تمہارے اغوا کا ڈراما رچانے کی۔ اب کہیں باہر بھی نہیں نکل سکتے ہو تم۔۔''
اسد اکتا کر ان کے ساتھ صوفے پر آن بیٹھا، تو اس نے ریموٹ کنٹرول کے ساتھ ٹی وی کا بٹن آف کر دیا، کیونکہ بار بار ایک ہی چیز دیکھ کر دونوں کو پریشان ہو رہا تھا اور وہ مسلسل ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ وہاج کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ اسد کی وجہ سے ہوا ہے اور اسد کو دل ہی دل میں لگ رہا تھا، وہاج کے خاندان نے سارے معاملے کو انتہائی بچگانہ طریقے سے ہینڈل کر کے معاملہ بگاڑا ہے۔
''داجی اور کیا کرتے، کیا جواب دیتے لوگوں کو۔؟'' وہاج نے غصے سے اپنے دوست کی طرف دیکھا، جس کی وجہ سے معاملہ زیادہ بگڑا تھا، کیونکہ صندل کی میڈیکل رپورٹ ہی ان کے گلے کا پھندا بن رہی تھی اور اسی وجہ سے اس نے خودکشی کی تھی۔
''دو چار لاکھ دے دلا کر سارا معاملہ سیٹ کر لیتے۔ ایسے ملازموں کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے۔'' اسد برا سا منہ بنا کر بولا کیونکہ اسے علم تھا اگر اس قصے میں اس کا نام بھی سامنے آیا تو اس کے باپ کی بھی قومی اسمبلی کی سیٹ ہاتھ سے نکل جائے گی۔
''تم اس کی اوقات چھوڑو اور اپنی فکر کرو، کیونکہ اس معاملے میں مجھ سے زیادہ تمہارا ہاتھ ہے۔'' وہاج کی بات پر وہ تلملا اٹھا۔
''مطلب کیا ہے تمہارا۔؟ اور تم ایک ہی بات کیوں بار بار جتا رہے ہو۔؟'' اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیل فون زور سے میز پر پٹخا۔
''جتا نہیں رہا، بتا رہا ہوں اگر یہ معاملہ کھل گیا تو کہیں تم بھی ساتھ میں لپیٹے نہ جاؤ، اور ویسے بھی میں نے تمہیں اس وقت بہت منع کیا تھا۔ وہ لڑکی بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئی تھی تم سے۔''
''مجھ سے خوف زدہ ہو گئی تھی تو کون سا تم سے خوش تھی؟ یاد نہیں کتنی منتیں کی تھیں اس نے تمہاری کہ ایسا نہ کرو۔ ہاتھ جوڑے تھے، گڑگڑائی تھی، اور میں نے تو ویسے ہی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے تھے، کیا پتا تھا سارا الزام

تم میرے سر پر رکھ دو گے۔'' اسد نے تپ کر انہیں یاد دلایا تو وہ بھی غصے میں آ گئے۔

''تم کچھ بھی کہو، اس کی میڈیکل رپورٹ والے معاملے سے میں تو صاف بچ جاؤں گا اس لیے تم بھی سوچو کیسے نبٹنا ہے۔''

ان کی بات پر اسد جیمہ نے اپنے بہترین دوست دہاج کو شاکی نظروں سے دیکھا، کچھ لمحے کے لیے سوچا اور جھٹکے سے کھڑا ہوا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا فلیٹ سے نکل گیا، وہ سوچ چکا تھا، اس نے اس معاملے سے اب کیسے نبٹنا ہے۔

☆☆☆

''دیکھو ارسل صاف صاف بتا دو، تم اپنے پیرنٹس کو کیوں نہیں بھجوانا چاہ رہے؟''

رومیصہ آج ارسل کے ساتھ ''کافی شاپ'' میں موجود تھی اور شیری کے بار بار کہنے پر اس نے آج ارسل سے صاف صاف بات کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ وہ جو درشہوار اور دہاج والے معاملے کی وجہ سے بہت زیادہ الجھا ہوا تھا اس کی ضد پر جھنجلا اٹھا۔

''پاگل ہو گئی ہو رومیصہ میں نے کب ایسا کہا ہے؟ میں انہیں نہیں بھیجنا چاہتا؟''

''تو پھر بہانے کیوں بنا رہے ہو۔۔۔؟ صاف صاف بات کیوں نہیں کرتے؟'' اس کی آواز میں خفگی تھی۔

''بے وقوف لڑکی، ہمارے گھر میں آج کل بہت زیادہ ٹینشن پھیلی ہوئی ہے، ایسے موقع پر اپنی شادی یا پروپوزل لے جانے کی بات کرنا اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔ تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی ہو۔'' رومیصہ نے اس کی بات پر بے زاری سے سر جھٹکا۔

''بھاڑ میں جائے ساری ٹینشن، تمہیں میری کنڈیشن کا اندازہ نہیں ہے کیا۔؟ جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے، بتاؤ میں اس چیز کو کیسے چھپاؤں گی۔؟'' رومیصہ بھی جذبات کی رو میں بہہ کر کچھ زیادہ ہی زور سے بول اٹھی۔

دائیں بائیں بیٹھے کچھ لوگوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تو دونوں ہی خفت کا شکار ہوئے۔

''فار گاڈ سیک رومی، آہستہ بولو، کیا ساری دنیا کو بتاؤ گی کہ ہمارے درمیان کیا چل رہا ہے۔'' وہ خفا ہوا۔

''میں چپ بھی رہوں گی تو تمہاری اولاد چیخ چیخ کر بتا دے گی۔'' وہ واقعی سخت ٹینشن کا شکار تھی۔

''پلیز ٹرائی ٹو انڈرسٹینڈ، میں جلد ہی اپنے ماموں، ممانی سے بات کر لوں گا، تم بھی تھوڑا تحمل سے کام لو۔'' ارسل نے بھی موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑا جسے رومیصہ نے ناراضی سے چھڑانے کی کوشش کی تو اس نے اور زیادہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''آپ کو اندازہ نہیں ہے جس دن یہ بات ڈس کلوز ہو گئی، میری پچوئشن بہت آکورڈ ہو جائے گی۔'' وہ جھنجلا کر گویا ہوئی۔

''میری جان، میرے مسائل کو بھی سمجھنے کی کوشش کرو، میرے بڑے ماموں کی بیٹی گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے ہم سب اس کی وجہ سے بہت اپ سیٹ ہیں۔'' ارسل کی بات پر رومی ٹھٹکی اور اس نے الجھن بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کہاں چلی گئی؟''

''آئی ڈونٹ نو، اس کی شادی اس کی پسند کے خلاف ہو رہی تھی تو وہ غصے میں گھر ہی چھوڑ کر چلی گئی۔'' اس نے گھما پھرا کر مختصراً بتایا کیونکہ اتنا تو اسے بھی علم تھا، اصل بات بتائے بغیر رومیصہ کو قائل نہیں کیا جا سکتا۔

''وہ مائی گاڈ، تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے؟ رومیصہ کا سارا غصہ بھاپ بن کے اڑ گیا، اور ارسل کو اس کی

UrduBooks.PK

سادگی اور معصومیت پر بے ساختہ پیار آیا، اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر سہلایا، اس سے پہلے وہ اس کی بات کا جواب دیتا، اس کا سانس حلق میں ہی اٹک گیا کیونکہ میر برہان اپنے کسی دوست کے ساتھ اسی ریسٹورنٹ میں ناصرف داخل ہو چکے تھے بلکہ اس کے ہاتھوں میں موجود رومیصہ کا ہاتھ بھی دیکھ چکے تھے، وہ گھبرا کر تھوڑا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

میر برہان اپنے دوست سے معذرت کر کے سیدھے اس کی طرف چلے آئے، ارسل بوکھلا کر کھڑا ہوا تو رومیصہ نے پریشانی سے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا، برہان ان دونوں کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ رومیصہ بھی گھبرا گئی۔

''السلام علیکم برہان بھائی۔'' ارسل نے اپنے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ لاشعوری انداز میں صاف کیا۔

''وعلیکم السلام، تم گئے نہیں مری؟ آج تو ویک اینڈ تھا۔'' برہان کی جانچتی ہوئی نگاہیں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔

''بس نکلنے ہی والا تھا، ان سے ملیں، یہ رومی ہے میری بہت اچھی دوست اور یونیورسٹی فیلو۔'' اس نے گھبرا کر رومیصہ کا تعارف کروایا تو انہوں نے ہلکا سا سر خم کر کے اسے سلام کیا۔

''رومی! یہ میرے بڑے ماموں کے بیٹے ہیں برہان بھائی، جن کی پچھلے دنوں شادی ہوئی تھی، شاید میں نے تمہارے سامنے ذکر بھی کیا تھا۔'' ارسل نے اپنا خشک حلق تر کرتے ہوئے ان کو بھی رومی سے متعارف کروایا تو وہ بھی زبردستی مسکرا دی۔

''کس ڈیپارٹمنٹ میں ہوتی ہیں آپ؟'' برہان نے اس بار ڈائریکٹ اس سے پوچھا تو وہ گڑبڑا کر بولی۔

''اکنامکس!'' رومیصہ نے جھوٹ بولا تو ارسل بے ساختہ سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

''اکنامکس ڈیپارٹمنٹ میں، میں نے تو نہیں دیکھا آپ کو کبھی؟'' برہان کی بات پر رومیصہ ہلکا سا بوکھلائی۔ اس نے مدد طلب نگاہوں سے ارسل کی طرف دیکھا، جو خود بھی اس بات پر پریشان ہو گیا تھا کہ اب اس معاملے کو کیسے سنبھالے۔

''کیا آپ بھی وہیں پڑھتے ہیں۔'' رومیصہ کی اگلی بے وقوفی، ارسل کو خاصی مہنگی پڑی، برہان نے جتاتی ہوئی نظروں سے ارسل کی طرف دیکھا تو وہ فوراً نظریں چرا کر گویا ہوا۔

''رومی! برہان بھائی اکنامکس ڈیپارٹمنٹ میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔'' ارسل کے خفت زدہ انداز پر رومیصہ کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا لیکن اس وقت تک تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ بھی شرمندہ سی ہوگئی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

شائع ہوگئے ہیں

☆ فصل غم کا گوشوارہ	رضیہ جمیل	قیمت: -/300 روپے
☆ زرد موسم	راحت جبیں	قیمت: -/1000 روپے
☆ حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	قیمت: -/400 روپے

خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

UrduBooks.pk

''اینی ہاؤ، آپ لوگ انجوائے کریں، میرا دوست انتظار کر رہا ہوگا۔'' برہان اپنی بات مکمل کر کے آگے بڑھ گئے تو رومیصہ نے جھنجھلا کر اس کی طرف دیکھا۔

''پہلے نہیں بتا سکتے تھے کہ یہ اکنامکس ڈیپارٹمنٹ میں ہی ہوتے ہیں۔'' اس نے اپنا سارا غصہ ارسل پر اتارا۔

''تمہیں بھی بس یہ ہی سبجیکٹ ملا تھا بتانے کے لیے؟'' اس کو بھی غصہ آیا۔

''مجھے الہام تھوڑی ہوا تھا کہ یہ بھی وہیں ہوتے ہوں گے۔ اب خود ہی سنبھال لینا سارا معاملہ۔ پتا نہیں کیا سوچ رہے ہوں گے وہ میرے بارے میں۔'' رومی کو اب نئی پریشانی نے گھیر لیا۔ زندگی میں پہلی بار ارسل کی فیملی کے کسی فرد سے اس طرح اچانک سامنا ہوا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی صورت حال خاصی عجیب ہوگئی تھی اور رومیصہ کو اب کئی دن تک اسی شرمندگی کے حصار میں رہنا تھا۔

''او کے لیو اٹ۔ برہان بھائی خاصے براڈ مائنڈڈ ہیں، میں ان کو خود ہی ہینڈل کرلوں گا۔'' ارسل نے میز پر رکھا ہوا کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے اسے تسلی دی۔

اسی رات جب وہ میر ہاؤس پہنچا تو رات کے کھانے کے بعد برہان نے اسے آنکھ کے اشارے سے اپنے کمرے میں آنے کا کہا، وہ گھڑی آچکی تھی، جس سے ارسل دل ہی دل میں گھبرا رہا تھا۔

''اب سچ سچ بتاؤ، کون تھی وہ لڑکی، اور کیا چل رہا ہے تم دونوں کے بیچ؟'' کمرے میں پہنچتے ہی انہوں نے پہلا سوال کیا اور اسے کاؤچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، وہ محتاط انداز میں بیٹھ کر آہستہ سے گویا ہوا۔ ''دوست ہے وہ میری۔''

''صرف دوست ہے یا کچھ اور بھی ہے درمیان میں؟'' برہان کی سنجیدگی نے اسے پریشان کیا۔

''شادی کرنا چاہتا ہوں میں اس سے۔'' اس نے بھی ہمت کر کے سچ بول دیا، برہان کو دھچکا سا لگا۔

''اس خاندان میں کس کی شادی ہوئی ہے پسند سے؟ جو تم اتنی بڑی جرأت کا مظاہرہ کر بیٹھے؟'' برہان کے طنزیہ انداز پر اس نے الجھ کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ برہان بھائی کو اس بات پر غصہ کیوں آ رہا ہے۔

''میرے پیرنٹس کی لو میرج تھی برہان بھائی۔'' اس نے یاد دلایا۔

''اس لیے کہ تمہارے والد ہمارے سیکنڈ کزن تھے، اس کے علاوہ کوئی ایک مثال دے دو مجھے پورے خاندان سے۔''

''ضروری نہیں ہے جو کام پہلے کسی نے نہ کیا ہو، وہ کوئی اور بھی نہ کرے۔'' اس کے لہجے میں موجود خودسری برہان کو چونکا گئی۔

''کیا درشہوار کو بھی اس بات کا علم تھا......؟'' برہان کے اس سوال پر ارسل نے بوکھلا کر ان کی طرف دیکھا، اب اسے برہان کی ناراضی کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی۔

''ہرگز نہیں، درشہوار ایسا کچھ نہیں جانتی تھی اور ویسے بھی سب کو علم ہے میں نے اس سے شادی سے انکار نہیں کیا تھا۔'' اس کے لہجے کی سچائی ہی اس کی سب سے بڑی گواہ تھی، برہان نے ایک لمبا سانس لیا۔ وہ اب تھوڑے مطمئن نظر آ رہے تھے، ورنہ اس لڑکی کے ساتھ دیکھتے ہی انہیں سب سے پہلے درشہوار کا ہی خیال آیا تھا کہ کہیں وہ ارسل کی پسندیدگی کی وجہ سے تو گھر چھوڑ کر نہیں گئی۔

''آپ جو سوچ رہے ہیں، ایسا کچھ نہیں ہے برہان بھائی۔'' ارسل نے ان کی سوچ کو الفاظ دیئے تو وہ خفت کا شکار ہوئے۔

Monthly Shuaa October 2018
UrduBooks.pk

”میں جانتا ہوں ارسل، ہمارے خاندان کے لڑکوں کو ایسی قربانیاں دینے کی عادت ہے، وہ محبت کسی اور کے ساتھ کرتے ہیں اور ان کی زندگیاں کسی اور کے ساتھ گزرتی ہیں، یہی ہمارا سب سے بڑا المیہ ہے۔“

کمرے میں داخل ہوتی انابیہ نے اپنے شریک حیات کا یہ جملہ پورے ہوش وحواس سے سنا تھا اور اس کا چہرہ ایک لمحے کو تاریک ہو گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی چائے کی ٹرے ارسل کے سامنے کی، تو اس نے فوراً بھاپ اڑاتا ہوا کپ اٹھا لیا۔

”بہتر ہوگا کہ تم ابھی اس بات کا ذکر کسی سے مت کرنا، ایسا نہ ہو الٹی آنتیں گلے پڑ جائیں، یہاں کے بڑوں کو بے تکے فیصلے کرنے کی عادت ہے۔“ برہان نے انابیہ کی موجودگی میں ڈھکے چھپے الفاظ کے ساتھ اسے سمجھانے کی کوشش کی تو ارسل نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جانتا تھا وہ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ایسی صورت حال میں رومیصہ کے ساتھ شادی کی بات کرنا بالکل بھی مناسب نہیں تھا اور اسے اب شدت سے اس مناسب وقت کا انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

صندل کیس کی پہلی ہی پیشی مسز عالیہ قریشی اور شہزاد کو خاصی بھاری پڑی۔

مسز قریشی نے اپنے ذرائع استعمال کر کے یہ کیس ترجیحی بنیادوں پر عدالت میں لگوا لیا تھا لیکن انہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ میر حاکم کی طرف سے آنے والا وکیل اپنے ساتھ ایک ایسا ہتھیار لا رہا ہے جو ان کے سارے دلائل پر بھاری پڑ جائے گا۔

وہ دونوں اپنی طرف سے بھرپور تیاری کر کے آئیں اور اسی وجہ سے خاصی پر اعتماد تھیں لیکن پہلی ہی پیشی میں جب مخالف پارٹی کے وکیل نے میر وہاج کی میڈیکل رپورٹ عدالت کے سامنے پیش کی تو ایک لمحے کو مسز قریشی بھی گڑبڑا گئیں۔ انہیں پہلی دفعہ اندازہ ہوا یہ کیس اتنا بھی سیدھا نہیں، جتنا وہ سمجھ رہی ہیں۔ انہوں نے اس موقع پر سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً کیس کی اگلی پیشی کی تاریخ لے لی۔ مخالف پارٹی کے چہرے پر موجود استہزائیہ مسکراہٹ ان دونوں کو بری طرح سے محسوس ہوئی اور اسی لیے انہوں نے نئے سرے سے اس پر کام شروع کرنے کا ارادہ کر لیا۔

”آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ رپورٹ فیک لگتی ہے مجھے۔“ اپنے چیمبر میں آتے ہی شہزاد نے کھل کر تبصرہ کیا۔

”رپورٹ جس لیب کی ہے، وہ فیک نہیں بنا سکتے۔“ مسز قریشی نے فوراً اس کی بات کو رد کیا۔

”اگر وہاج کی رپورٹ ٹھیک ہے تو پھر کیا صندل کی ڈاکٹر کی رپورٹ غلط ہے؟“ شہزاد الجھ گئی۔

”صندل کی ڈاکٹر بھی غلط نہیں کہہ رہی وہ واقعی پریگننٹ تھی۔“ مسز قریشی نے ہاتھ میں پکڑا پیپر ویٹ اپنی فائل پر رکھا۔ ان کا دماغ بہت تیزی کے ساتھ کڑیاں جوڑ رہا تھا جبکہ پہلی ہی پیشی پر مخالف پارٹی کے وکیل نے ان پر خاصا بھاری وار کیا تھا اور اب انہیں اس کا توڑ کرنا تھا۔

”تم خود سوچو شیری، اگر دونوں رپورٹس درست ہیں تو پھر بیچ میں کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟“ انہوں نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کو مزید سوچنے پر اکسایا۔

”اس بات کا تو پھر ایک ہی مطلب نکلتا ہے میم، اس جرم میں یقیناً وہاج کے ساتھ کوئی اور بھی شامل ہے۔“ شہزاد کا تجزیہ سو فیصد درست تھا، تبھی مسز قریشی نے مسکرا کر بال پوائنٹ کے ساتھ فائل پر کچھ کمنٹس لکھے۔

”تم اب بالکل ٹھیک پوائنٹ پر سوچ رہی ہو شیری۔“ وہ ہاتھ میں پکڑا بال پوائنٹ میز پر رکھ کر مسکرائیں۔

”اگر ایسا ہی ہے تو صندل نے ان سب کا اپنے خط میں ذکر کیوں نہیں کیا؟“ شہزاد کو اگلی سوچ نے آن

UrduBooks.pk

گھیرا۔۔

"تم صندل کی جگہ خود کو رکھ کر سوچو شیری، اگر خدانخواستہ تمہارے ساتھ ایسا کوئی ظلم ہو جس میں تمہارے گھر کا بندہ انوالو ہو تو تم زیادہ ہرٹ اسی کی طرف سے ہوگی اور صندل نے جس ذہنی اذیت کے ساتھ اپنے رقعے میں یہ چند لائنیں لکھی ہیں کہ وہاج صاحب نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا تو اس سے ہمیں خود اندازہ لگا لینا چاہیے، کہ یقیناً اس کے ساتھ جتنا ظلم ہوا، وہ اسے تفصیل سے نہیں لکھ پائی۔" مسز قریشی نے کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا تو شہرزاد کو ان کی ساری باتیں درست لگیں اور اس کے دل میں میر فیملی کے لیے نفرت میں دوگنا اضافہ ہو گیا۔

"ہمیں اس کیس پر مزید ورکنگ کرنا ہوگی۔ تم اسے دوبارہ اسٹڈی کر کے اپنے پوائنٹس بنا کر لاؤ۔۔"

"ڈونٹ ووری میم! ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ ضرور نکل آئے گا، جو ہمارے لیے ہیلپ فل ہوگا، میں ذرا اپنے آفس میں بیٹھ کر اسے نئے سرے سے دیکھتی ہوں۔" وہ اپنے کام کے معاملے میں انتہائی جنونی تھی اور یہ بات مسز قریشی سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس لیے انہوں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

شہرزاد کے دماغ میں اس کیس کے حوالے سے کئی چیزیں ایک ساتھ چل رہی تھیں، وہ اپنی دھن میں تیزی کے ساتھ آفس میں داخل ہوئی تو پہلے ہی قدم پر ٹھٹک کر رک گئی۔

میجر حمزہ اس کی نشست کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بڑی بے تکلفی سے بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ شہرزاد نے گردن موڑ کر سائیڈ میز پر رکھی الیکٹرک کیتلی کو دیکھا، اسے اندازہ ہو گیا کافی بنانے کا عمل بھی اسی کے آفس میں سرانجام دیا گیا ہے۔

"آپ کو اپنے آفس میں کوئی کام نہیں ہوتا کیا؟" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"محترمہ میری آج کل آفیشل چھٹیاں چل رہی ہیں، اگر اتنا ہی برا لگتا ہوں تو چلا جاتا ہوں۔" وہ کافی کا مگ میز پر رکھ کر مصنوعی سنجیدگی سے کھڑا ہوا۔

"یہ اوور ایکٹنگ کرنا بند کریں اور بیٹھ جائیں سکون سے، میں ویسے ہی تھکی ہوئی ہوں۔"

حمزہ مسکراتے ہوئے دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور کہنی کو میز پر ٹکا کر اسے بڑی فرصت سے دیکھنے لگا، وہ واقعی تھکی تھکی سی تھی۔ نہ جانے کیوں اس لڑکی کی ہر ادا ہی اسے بھاتی تھی، اس نے بہت سال اس سے یک طرفہ محبت بڑی شدت کے ساتھ کی تھی اور اب جا کر اس کی زندگی میں تھوڑا ٹھہراؤ آیا تھا۔

"ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں آپ۔" وہ کوفت کا شکار ہوئی۔

"اگر تھکنا شروع ہو گئی ہو تو اس پروفیشن کو پہلی فرصت میں چھوڑ دو تم۔" اس کا خلوص دل سے دیا گیا مشورہ شہرزاد کو بالکل اچھا نہیں لگا۔

"میں نے کب کہا، اس پروفیشن سے تھک گئی ہوں میں، آپ کو غلط اندازے لگانے پر کوئی ایوارڈ ملنا چاہیے۔" وہ ہلکا سا چڑ گئی۔

"ایوارڈ تو نہیں، کسی اچھی سی جگہ لنچ کر کے آتے ہیں، چلو اٹھو۔" وہ مسکراتے ہوئے فوراً کھڑا ہوا۔

"آئی ایم سوری حمزہ، اس وقت تھوڑا کام نبٹانا ہے مجھے، لنچ کا سلسلہ کسی اور دن کے لیے رکھ لیں پلیز۔" شہرزاد کا دماغ ابھی تک اسی کیس میں الجھا ہوا تھا۔ اس لیے اسے فی الحال کوئی بھی چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی، وہ جلد از جلد کوئی نیا پوائنٹ نکال کر مسز قریشی کے سامنے لانا چاہتی تھی۔

"کوئی ضرورت نہیں، ایک ضروری بات ڈسکس کرنی ہے مجھے تم سے آج، یہ کام تو ساری زندگی چلتے ہی رہیں گے، بس تم اٹھو۔" اس نے بے تکلفی سے اس کے سامنے رکھی ہوئی فائل بند کی تو وہ چڑ گئی۔

"کہاں ناں یار نہیں جاسکتی، کیوں ضد کر رہے ہیں آپ؟" اس کے جھنجلائے ہوئے انداز پر حمزہ کا چہرہ ہلکا سا

UrduBooks.pk

تاریک ہوا۔

اسی وقت ارتضٰی حیدر عجلت بھرے انداز میں اس کے آفس میں داخل ہوا، ارتضٰی کو علم نہیں تھا، کہ یہاں میجر حمزہ سے ملاقات ہو جائے گی، اس لیے اس کو بھی جھٹکا لگا، لیکن اس نے جلد ہی خود کو سنبھال کر سرسری انداز میں دونوں کو مشترکہ سلام کیا۔

''شیری، ہمیں ابھی اور اسی وقت مری جانا ہوگا، ہادی نے ایک دو ضروری میٹنگز ارینج کروائی ہیں صندل کیس کے سلسلے میں۔''

''آپ اپنے آفس کا کام کب کرتے ہیں ارتضٰی؟'' حمزہ نے طنزیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، جو اس بات پر اچھی خاصی خفت کا شکار ہوا۔

''آفس میں ہی تھا، مسز قریشی نے کال کر کے بلوایا ہے مجھے، اور میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ان کو انکار نہیں کر سکتا، وہ استاد ہیں میری۔'' ارتضٰی نے بڑے تحمل سے جواب دے کر شہرزاد کی طرف دیکھا، جو اس وقت حمزہ کے چہرے کے بگڑتے ہوئے زاویوں کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

''شیری! ایکسکیوز مود، میری شام میں ایک میٹنگ بھی ہے۔ مجھے واپس بھی آنا ہوگا۔'' ارتضٰی کی بات پر شہرزاد نے جلدی سے میز پر رکھی ہوئی اپنی فائلوں کو سمیٹا۔

''آئی ایم سوری حمزہ! لنچ کا پروگرام کل پر رکھ لیتے ہیں، ابھی جانا ہوگا مجھے۔'' شہرزاد نے ہمت کر کے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو مخاطب کیا، جو بہت مان بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جائے گی، لیکن وہ بھی شہرزاد تھی جس کے لیے اس کا پروفیشن اس کا جنون تھا اور وہ اس پر کسی بھی قسم کا کوئی کمپرومائز کرنے کو تیار نہیں ہوتی تھی۔

''اٹس اوکے!'' حمزہ کا چہرہ سرخ ہوا، وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا، ایک سرد نگاہ ان دونوں پر ڈالی اور آفس سے نکل گیا۔ وہ آج زندگی میں پہلی بار اس سے دل سے خفا ہوا تھا۔

شہرزاد کو نہ جانے کیوں اس کا انداز کچھ غیر معمولی سا لگا، اس نے چند لمحے سوچا کہ وہ ارتضٰی کو انکار کر کے اس شخص کو کال کرے جس کے لیے اس کی ذات ساری دنیا سے اہم تھی لیکن اسی وقت مسز قریشی آفس میں چلی آئیں۔

''شیری پلیز آپ لوگ جلدی نکلیں، ہادی ویٹ کر رہا ہے وہاں۔'' مسز قریشی کی بات سنتے ہی اس نے تمام چیزوں کو ایک جھٹکے سے اپنے ذہن سے نکالا اور میز پر رکھی ہوئی اپنی ضروری چیزیں اٹھائیں اور ارتضٰی حیدر کے ساتھ مری جانے کے لیے نکل پڑی۔

☆☆☆

سارے دن کا تھکا ماندہ آفتاب مغرب کی آغوش میں چھپ گیا۔

درشہوار کے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ آج پورے دو دن بعد اپنے کمرے سے نکلی اور لان کی طرف چلی آئی۔ وہ افسردہ انداز سے لان چیئر پر بیٹھے سورج کی سنہری دھوپ کو شام کے قرمزی رنگ میں مدغم ہوتے دیکھنے لگی۔

اس کی خودکشی کی حرکت نے مسز قریشی کے ساتھ ساتھ عبداللہ صاحب کو بھی خوفزدہ کر دیا تھا اور وہ جلد از جلد اس آفت کی پڑیا سے جان چھڑانا چاہ رہے تھے، لیکن انہیں کوئی بہترین راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

درشہوار کی آنکھوں میں ہادی کو دیکھ کر عجیب سی حسرتیں سسکتی ہوئی نظر آتیں، اس سے بات کرنے کی تمنا

UrduBooks.pk

چٹکیاں لیتی لیکن اس دشمن جان کی آنکھوں میں اسے اپنے لیے سوائے بے زاری، تنفر اور کوفت کے کچھ نہیں ملتا تھا اور یہ بات اسے دن بہ دن مایوس کر رہی تھی۔

اب تو مسز قریشی کو بھی کھل کر اس کا مسئلہ سمجھ میں آ گیا تھا اور اس شام وہ اسے سمجھانے کی غرض سے اپنا چائے کا کپ اٹھائے اس کے پاس چلی آئیں، در شہوار نے ایک نظر اٹھا کر ان کی طرف افسردہ انداز میں دیکھا، اس کا چہرہ بجھا ہوا اور آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے تھے، مسز قریشی کو اس کی حالت دیکھ کر رحم آیا۔ وہ لڑکی، ان کے بیٹے کی محبت میں خود کو برباد کر رہی تھی۔

''بیٹا، کیوں اپنے آپ کو اذیت دے رہی ہو؟'' مسز قریشی نے پہلی دفعہ اس سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''تو اور کیا کروں آنٹی؟'' اس نے بے بس انداز میں اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں اور وہ آنسو روکنے کے چکر میں اپنے ہونٹوں کو کاٹتی ہوئی مسز قریشی کو پہلی دفعہ معصوم لگی۔

''میں مانتی ہوں مجھے محبت کرنے کا سلیقہ نہیں آتا، میرے دل میں جو ہوتا ہے میں بلا جھجک بول دیتی ہوں، میں اپنی ضد کی غلام ہوں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ لڑکیوں کی یہ عادتیں ان کو نقصان کے علاوہ کچھ نہیں دیتیں لیکن محبت کرنا کیا اتنا بڑا جرم ہے کہ اگلا انسان آپ کو اس طرح سے دھتکار دے کہ آپ کو خود سے نفرت ہونے لگے۔'' در شہوار کے لہجے میں اذیت کا ایک جہان آباد تھا۔

''محبت کرنا جرم نہیں، لیکن اپنے والدین اور گھر والوں کے اعتماد کو توڑ کر کسی انجان شخص کے لیے اپنی ساری زندگی کو داؤ پر لگا دینا ایسا جرم ہے جسے ہمارا معاشرہ کبھی معاف نہیں کرتا، اور جہاں تک بات ہادی کی ہے، میں جانتی ہوں اس کا مزاج تم سے بہت مختلف ہے اور خدا کی قسم وہ ایک دفعہ بھی تم میں اپنا انٹرسٹ شو کرتا تو میں فوراً تم دونوں کی شادی کروا دیتی۔'' مسز قریشی کی بات پر وہ بے ساختہ رو پڑی۔

''میں اس کے مزاج کے مطابق خود کو ڈھال بھی تو سکتی ہوں، وہ جیسا کہے گا، میں کرنے کو تیار ہوں، وہ ایک دفعہ مجھ سے بات تو کرے، میں اتنی بھی بُری نہیں ہوں، جتنا وہ مجھے سمجھتا ہے۔'' وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولی۔

''زندگی میں ہر چیز ہر انسان کے لیے نہیں ہوتی، تم بھی اپنے اندر لچک پیدا کرو۔'' مسز قریشی نے اسے نصیحت کی۔

''میں نے زندگی میں جو چاہا، وہی حاصل کیا، تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی، بچپن میں امی نے میری ضدی طبیعت کو بدلنے کے بجائے ہمیشہ میری خواہش پوری کی، مجھے لگتا تھا، میں جس چیز کی بھی خواہش کروں گی، وہ میری دسترس میں آ جائے گی، لیکن پہلی بار مجھے احساس ہوا ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو ایک لڑی کی صورت میں بہہ رہے تھے۔

''دیکھو بیٹا! ہادی کی زندگی میں تمہاری کوئی گنجائش نہیں نکلتی، میری مانو تو واپس چلی جاؤ، میں خود تمہارے پیرنٹس سے جا کر بات کر لوں گی۔ وہ کچھ نہیں کہیں گے تمہیں۔'' مسز قریشی نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر سمجھانے کی کوشش کی۔

''آئی ایم سوری آنٹی! میں واپسی کی ساری کشتیاں جلا کر آئی ہوں، اب میرے لیے میر ہاؤس میں صرف ایک قبر کی ہی گنجائش نکل سکتی ہے اس کے علاوہ نہیں، آپ میرے خاندان والوں کو نہیں جانتیں، وہ مار دیں گے مجھے۔'' در شہوار کی بات پر مسز قریشی نے دہل کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے لہجے کی سچائی گواہ تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔

''ایک بات تو بتاؤ درشہوار۔'' مسز قریشی کے انداز میں کچھ تھا، درشہوار کا دل بُری طرح سے دھڑکا۔
''میر وہاج کے ساتھ تمہارا کیا رشتہ ہے۔؟ آئی مین تم کیا لگتی ہو ان کی؟'' مسز قریشی ان کے خاندان میں برہان کے علاوہ کسی کو نہیں جانتی تھیں۔
''سگے بھائی ہیں وہ میرے، لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں ان کے بارے میں۔'' درشہوار کے اس انکشاف پر مسز قریشی بُری طرح سے چونکیں۔
''اچھا تو تم میر وہاج کی بہن اور میر محتشم کی بیٹی ہو۔'' ان کا انداز اگرچہ سرسری تھا لیکن درشہوار ان کا چونکنا محسوس کر چکی تھی۔
''آپ کیوں وہاج بھائی کے بارے میں پوچھ رہی ہیں؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟'' درشہوار کا باہر کی دنیا سے رابطہ کٹا ہوا تھا اور کچھ وہ ٹی وی دیکھنے کی بھی خاص شوقین نہیں تھی، اس لیے اس کے تو فرشتوں کو بھی اس بات کی خبر نہیں تھی کہ اس کا خاندان آج کل کس قیامت سے گزر رہا ہے۔
''تمہیں شاید علم نہیں، تمہارے بھائی پر اپنے گھر کی ملازمہ صندل کے ساتھ زیادتی کا کیس چل رہا ہے اور اسی وجہ سے صندل نے خودکشی کر لی تھی۔'' مسز قریشی نے درشہوار کی سماعتوں میں بم پھوڑا، وہ کچھ لمحوں کے لیے گنگ سی کیفیت میں ان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔
''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میرے بھائی ایسا نہیں کر سکتے۔'' کچھ لمحوں کے بعد اس کے حلق سے آواز برآمد ہوئی۔
''ہمارے پاس اس چیز کے کئی ثبوت ہیں درشہوار، اور تم چاہو تو میں تمہیں دکھا بھی سکتی ہوں۔'' مسز قریشی بڑے متحمل انداز میں اسے تفصیل سے بتاتی چلی گئیں جسے سنتے ہوئے اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے، شرمندگی کے، ملامت کے، غصے کے اور بے بسی کے۔
''اب تم بتاؤ کیا غلط کہہ رہی ہوں میں؟'' مسز قریشی نے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا، وہ کافی دیر تک تو بول ہی نہیں پائی اسے لگا اس کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی ہو۔ مسز قریشی نے اس کا ہاتھ ہلکا سا دبا کر اسے بولنے کے لیے راضی کیا۔ ''بتاؤ ناں درشہوار۔؟ تمہارے بھائی نے ایسا کیوں کیا؟''
''بہت بُرا کیا وہاج بھائی نے، انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' وہ صدمے بھرے انداز میں بس اتنا ہی بول پائی۔
''اب بتاؤ، تم اس سارے قصے میں ہماری کوئی ہیلپ کر سکتی ہو؟ مسز قریشی کی بات پر وہ الجھن کا شکار ہوئی۔
''کیسی ہیلپ؟''
''کوئی ایسی بات یا کوئی ایسی چیز جو اس کیس میں ہماری مدد کر سکے۔'' وہ چائے کا کپ پکڑے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو بڑی جانچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔
درشہوار کو انہوں نے ایک عجیب سی صورت حال میں پھنسا دیا تھا۔ ایک طرف اس کا خاندان تھا تو دوسری طرف ہادی کی ماں اور ایسے موقع پر اس کا جھکاؤ کہاں ہونا چاہیے تھا، وہ فوری طور پر یہ فیصلہ نہیں کر پائی۔
''ممی ایسے لوگ بیٹھ کر بس دوسروں کی بے بسی کا تماشا دیکھ سکتے ہیں، اس کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔''
ہادی ابھی ابھی مری سے واپس آیا تھا اور اس نے اپنی ماں کی آخری بات سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس سے صندل کیس کے سلسلے میں بات کر رہی ہیں۔
''تم کب آئے واپس؟ شہزاد اور ارتضیٰ سے میٹنگ ہوئی تمہاری؟''

UrduBooks.pk

''ہاں میٹنگ ہوگئی اور ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ ہیلپ مل جائے گی۔'' وہ خاصا پرامید تھا۔
''آنٹی، آپ کو میری جس قسم کی بھی ہیلپ کی ضرورت ہوگی، میں دینے کو تیار ہوں۔'' درشہوار ایک دم بولی تو ہادی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، جبکہ مسز قریشی بھی خوش گوار قسم کی حیرت کا شکار ہوئیں۔
''تھینک یو بیٹا۔ اللہ تمہیں اس کا اجر دے۔'' انہوں نے خلوص دل سے کہا اور ایک دم ان کی نظر اس کے ہاتھ پر پڑی تو انہیں یاد آیا۔
''ہاں ہادی ایک کام تو کرو بیٹا، ذرا درشہوار کو ڈاکٹر طاہر کے کلینک پر لے جاؤ اس کی بینڈیج تبدیل ہوگی آج۔''
''ٹھیک ہے ممی، لیکن پہلے اچھی سی کافی تو پلائیں، رات میں حمزہ کے ساتھ ڈنر پر جانا ہے مجھے۔'' وہ خلاف توقع کوئی بھی بحث کیے بغیر اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہوگیا تو درشہوار کے ساتھ ساتھ مسز قریشی کو بھی خاصی حیرانی ہوئی۔
شام کو وہ اس کے ساتھ کلینک جانے کے لیے نکلی تو اس نے بڑی سی چادر میں خود کو اچھی طرح سے ڈھانپا ہوا تھا، وہ خاموشی سے اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی، ہادی کا خیال تھا وہ بیٹھتے ہی ہمیشہ کی طرح اوٹ پٹانگ باتیں کرنا شروع کردے گی، لیکن درشہوار کا دماغ وہاج والے قصے میں بُری طرح سے الجھا ہوا تھا، وہ ابھی تک اس صدمے سے باہر نہیں نکل پائی تھی۔
اسے دل ہی دل میں وہاج پر سخت غصہ آرہا تھا، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کا بھائی پستی کی اس حد تک بھی گر سکتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسے مسز قریشی اور ہادی سے بہت شرمندگی محسوس ہورہی تھی جو اس کے بھائی کی اس مکروہ حرکت کے بارے میں جان گئے تھے۔
اس نے کلینک جا کر بڑے سکون سے بینڈیج تبدیل کروائی اور پہلے کی طرح چپ چاپ ہادی کی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ کلینک سے گھر تک کے راستے میں اس نے ہادی کو مخاطب کرنا تو دُور کی بات اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا نہیں تھا اور یہ بات اب ہادی کو تعجب میں مبتلا کر رہی تھی۔

☆☆☆

اس رات ایک بار پھر دونوں کے درمیان خوب جھگڑا ہوا۔
اسد چیمہ کا خیال تھا، وہاج کو پہلی فرصت میں اس کا فلیٹ چھوڑ کر ایک اور دوست کے پاس کراچی چلے جانا چاہیے اور وہاج باہر نکلنے سے بہت زیادہ خوف زدہ تھے یہ ممکن ہی نہیں تھا، وہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر وہاں پہنچ جاتے۔
''تم مجھے اپنے فلیٹ سے نکالنا چاہتے ہو؟'' وہاج نے بغیر کسی لگی لپٹی کے اسد کو کہا، جس کے چہرے پر بے زاری ہی بے زاری تھی۔
''ہزار دفعہ بتا چکا ہوں، بابا کے کچھ فرینڈز آرہے ہیں سندھ سے اور اس لیے انہوں نے کہا ہے مجھے۔'' وہ اکتا کر بولا۔
''دیکھو اسد بہانے مت بناؤ، کیا مجھے علم نہیں، تم لوگوں کی حویلی اور بے شمار گھر ہیں اب مہمانوں کو ٹھہرانے کے لیے یہ ہی فلیٹ رہ گیا ہے کیا۔؟'' وہاج کو غصہ آیا، ویسے بھی دوستی کے رشتے میں دراڑ تو پڑ ہی چکی تھی۔
''یار تم کچھ بھی کہو، الیکشن کے موقع پر میں ایسا کوئی اسکینڈل افورڈ نہیں کر سکتا۔'' وہ بھی بدلحاظ ہوا۔
''اسکینڈل تو اس وقت بھی بنے گا جب میری گرفتاری ہوگی۔'' وہاج نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اسے دھمکانے کی کوشش کی۔

''ایسا کرو، تم ابھی فون کر کے پولیس کو بتا دو، تاکہ بات آج ہی ختم ہو جائے۔'' اسد نے غصے سے اپنا سیل فون اس کی طرف پھینکا۔

''میں ایسی کوئی گھٹیا حرکت نہیں کروں گا لیکن یاد رکھنا اگر میں پھنسا تو پھر چھوڑوں گا میں بھی نہیں کسی کو۔''

''فار گاڈ سیک وجی، میں تمہیں صرف چند دن کے لیے یہاں سے جانے کا کہہ رہا ہوں، یہ الیکشن کا ہنگامہ نبٹ جائے، نئی گورنمنٹ کے آتے ہی ہم لوگ اس معاملے کو نبٹا لیں گے۔'' اسد نے تھوڑی مصلحت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے نرم لہجہ اختیار کیا لیکن وہاج کا دل اس کی طرف سے کھٹا ہو چکا تھا اور وہ دل ہی دل میں ان تمام ممکنہ دوستوں کے نام دہرا رہے تھے جو اس موقعے پر ان کا ساتھ دے سکتے تھے۔

''میں تم سے بات کر رہا ہوں وہاج، اب چپ کر کے کیوں بیٹھ گئے ہو۔'' وہ ہلکا سا چڑ گیا۔

''بے فکر رہو، کل شام تک چلا جاؤں گا میں یہاں سے۔'' وہاج ناراضی سے سٹنگ روم سے نکل کر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئے، وہ اب سنجیدگی سے اکیلے بیٹھ کر اس مسئلے کا کوئی حل نکالنا چاہتے تھے۔

ان کے اس اعلان پر اسد چیمہ نے تھوڑا سکون کا سانس لیا۔ انہیں یقین تھا کہ وہاج نام کی بلا جلد ہی اس کے سر سے ٹلنے والی ہے۔

☆☆☆

وہ ایک حبس زدہ سی شام تھی۔

حمزہ اس وقت ہادی کے ساتھ اسلام آباد کلب پولو گراؤنڈ میں موجود تھا۔

وہ دونوں سرسبز میدان میں سبک رفتار گھوڑوں پر بیٹھے ہوئے اپنی ٹیم کی طرف سے بڑی مہارت کے ساتھ گیند کو گول میں پھینکنے کی کوشش کر رہے تھے اور کچھ منٹوں کی جدوجہد کے بعد ہادی فائنل گول کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پھیلی۔

وہ حمزہ کو ہرا چکا تھا، جس کا موڈ صبح سے خراب تھا اور وہ مارے بندھے ہی کھیل رہا تھا۔ شہزاد کے رویے نے اسے بُری طرح سے ہرٹ کیا تھا۔ بار بار اس کا دھیان اسی بات کی طرف جا رہا تھا۔

حمزہ نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اسٹک جھنجھلا کر زمین پر پھینکی اور اچھل کر اپنے گھوڑے سے نیچے اترا، ہادی چونکہ ویک اینڈ کی وجہ سے گھر آیا ہوا تھا، وہ حمزہ کو زبردستی کلب لے آیا، یہاں آ کر بھی اس پر مایوسی اور قنوطیت چھائی رہی، ہارنے کے بعد تو وہ مزید بدمزا ہو گیا۔

''بادشاہوں کے کھیل کو اگر غلاموں کے انداز میں کھیلا جائے تو ہار ہی انسان کا مقدر بنتی ہے۔'' ہادی نے پولو گراؤنڈ سے نکلتے ہوئے اسے چھیڑا۔

''ہار تو چکا ہوں میں بہت سال پہلے، اب کسی سے جیتنے کی تمنا نہیں ہے مجھے۔'' اس کا لہجہ اداسی کے حصار میں لپٹا ہوا تھا۔

''سچ سچ بتاؤ، آج تمہارا دھیان کہاں تھا۔؟ ورنہ میں جیت جاؤں تم سے، یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟'' ہادی پولو اسٹک بار کی طرف جاتے ہوئے ہنسا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو، بادشاہوں کے کھیل کو غلاموں کے انداز میں نہیں کھیلنا چاہیے لیکن سچ بتاؤں محبت کی غلامی کے بعد انسان دنیا کا کوئی بھی کھیل کھیلنے کے قابل نہیں رہتا۔'' تلخی اس کے ہر انداز سے نمایاں تھی۔

''لگتا ہے میم شیری نے پھر کوئی ایموشنل ڈیزی کٹر مار دیا ہے میرے دوست پر۔'' ہادی نے شرارتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں ہی بے وقوف ہوں جو اتنے سالوں سے اس کے پیچھے جھک مار رہا ہوں۔'' وہ بے زاری سے پولو

اسنیک بار میں داخل ہوا۔
ہادی نے جانچتی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا، دنیا بھر کی بے زاری اس کے پورے وجود پر چھائی ہوئی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے اس بار وہ شہرزاد کے ساتھ ساتھ خود سے بھی خفا ہو، ہادی نے اسنیک بار میں پہنچتے ہی اسموکڈ چکن اور پاستا سیلڈ کا آرڈر کیا۔ وہ اسے لے کر نسبتاً ایک سنسان گوشے کی طرف چلا آیا۔
''ہاں بھئی، اب شروع ہو جاؤ، اس بار جھگڑا کس بات پر ہوا ہے؟'' ہادی نے غیر سنجیدگی سے پوچھا۔
''میں نے اس کے سامنے آکر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے، مجھے اس کے ساتھ بس بلی اور چوہے والا کھیل ہی کھیلنا چاہیے تھا، کم از کم اس وقت اسے میری ذات سے کوئی دلچسپی تو تھی۔'' وہ ایک دم پھٹ پڑا۔
''تمہارا کیا خیال ہے شہرزاد کی تم میں دلچسپی کم ہوگئی ہے؟'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں دریافت کیا۔
''اس کی میری ذات میں دلچسپی ''کم'' نہیں ہوئی بلکہ سرے سے ''ختم'' ہی ہوگئی ہے، میں اپنی اتنی ٹف روٹین سے ٹائم نکال کر پاگلوں کی طرح اس کے پیچھے بھاگتا ہوا آتا ہوں اور وہ مجھے ایک تنکے سے بھی زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں۔'' حمزہ کو اس سے بے تحاشا گلے تھے۔
''آخر ہوا کیا ہے؟ کچھ بتاؤ گے تو پتا چلے گا؟'' ہادی کو بالآخر سنجیدہ ہونا ہی پڑا۔
''تم گواہ ہو میں نے اس لڑکی کو ٹوٹ کر چاہا، اس کے سوا کسی کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا، اس کے لیے کہاں کہاں خوار نہیں ہوا، اس کی خاطر کئی راتوں کے رت جگے کاٹے لیکن وہ اپنی پرسنل اور پروفیشنل لائف میں میری ذات کو سب سے آخر میں رکھتی ہے، بس یہی اوقات ہے میری۔ کل اس بات کا بہت اچھی طرح سے احساس ہوگیا ہے مجھے۔'' وہ ناراضی، غصے اور رنجیدگی کے ملے جلے جذبات کا شکار تھا۔
ہادی کو پہلی بار احساس ہوا، معاملہ اتنا سیدھا نہیں جتنا وہ سمجھ رہا ہے۔
''میں اسے گڑیا سے ملوانے کے لیے گھر لے جانا چاہتا تھا، اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا اور وہ صندل کیس کے لیے اس تھرڈ کلاس پولیس آفیسر ارتضیٰ حیدر کے ساتھ میٹنگ کرنے چلی گئی۔ حد ہوتی ہے یار ہر بات کی۔ اسے ذرا بھی میرے جذبات کی پروا نہیں۔''
حمزہ کا ایک ایک لفظ اس بات کا گواہ تھا وہ اس بار شہرزاد کے ہاتھوں بُری طرح سے ہرٹ ہوا ہے، اس سے پہلے ہادی اس کی بات پر غور کرتا، حمزہ کے منہ سے بے ساختگی میں نکلنے والی اطلاع نے اس کا دل بُری طرح سے دھڑ کا دیا۔
''حریم کب آئی پاکستان؟ تم نے بتایا ہی نہیں؟'' وہ نظریں چرا کر گویا ہوا۔ حمزہ کی بہن حریم کو گھر میں پیار سے گڑیا کہا جاتا تھا۔
''رات ہی پہنچی تھی امریکہ سے اور ملنا چاہتی تھی شہرزاد سہگل صاحبہ سے، لیکن ان کے پاس عوام الناس کے لیے ٹائم کہاں ہے؟'' حمزہ کے چہرے پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ دوڑی، جیسے وہ اپنا خود ہی مذاق اڑا رہا ہو۔
''یار وہ واقعی کل بہت ٹینشن میں تھی اور تمہیں پتا تو ہے وہ ضرورت سے زیادہ اپنے کام کو خود پر حاوی کر لیتی ہے، تمہیں اس کی پوزیشن کو سمجھنا چاہیے۔'' ہادی نے شہرزاد کی طرف سے اس کا دل صاف کرنے کی کوشش کی۔
''بات کام کی نہیں ہے یار۔'' وہ جھنجھلایا۔
''بات ترجیحات کی ہوتی ہے، وہ جس منظر میں میرے سامنے ہوتی ہے، مجھے اس کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ہر چیز پس منظر میں چلی جاتی ہے، لیکن اسے میرے سوا ہر چیز اہم لگتی ہے۔'' وہ جذباتی ہوا۔
''میرا خیال ہے تم دونوں کو بیٹھ کر اس موضوع پر کھل کر بات کر لینی چاہیے۔'' ہادی نے اسے مشورہ دیا۔

''نہیں یار اب نہیں۔ میری انا مجروح ہوئی ہے، اور میں اس چیز کو بار بار دہرانا نہیں چاہتا۔''

''تو کیا چھوڑ دو گے شہرزاد کو؟'' ہادی نے ہنس کر اسے چھیڑا۔

''دل سے نہیں نکال سکتا لیکن زندگی سے تو خارج کر سکتا ہوں، کم از کم روز روز مرنے سے تو بہتر ہے۔'' وہ تلخی سے گویا ہوا۔

''کم آن یار وہ بات کرو، جو تم کر سکتے ہو۔'' وہ اس کی بات پر مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسا تھا۔

''تم اچھی طرح سے جانتے ہو، میں جو ٹھان لیتا ہوں اس سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹتا۔'' اس کی بات پر ہادی کچھ پریشان ہوا۔

''اچھا بے وقوفوں جیسی باتیں مت کرو، ابھی اسے کچھ ٹائم دو اور اٹھو کوئی اچھی سی مووی دیکھ کر آتے ہیں۔'' ہادی نے اس کا موڈ بہتر کرنے کی کوشش کی۔

''سوری، میرا دل نہیں چاہ رہا، گھر چلتے ہیں اور حریم کے ہاتھوں کی کافی پیتے ہیں۔۔'' حمزہ اپنی بات مکمل کر کے فوراً کھڑا ہوا۔

''حریم کی کافی تو کوئی پاگل ہی چھوڑ سکتا ہے، چلو اس بہانے اس سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔'' ہادی کا موڈ ایک دم خوش گوار ہوا۔

''اس کے سامنے میری اور شہرزاد کی لڑائی کا ذکر مت کرنا۔ اپ سیٹ ہو جائے گی وہ۔'' اسنیک بار سے باہر نکلتے ہوئے اس نے ہادی سے سرسری انداز میں کہا تو وہ مسکرا دیا، اس سے بہتر کون جان سکتا تھا کہ حریم خالد کو دنیا میں سب سے زیادہ اپنے بھائی سے محبت تھی، اور اس کے لیے تو وہ ساری دنیا سے لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتی تھی۔

☆☆☆

''میں حمزہ کی فیملی کو ڈنر پر انوائیٹ کرنا چاہتی ہوں۔''

ٹینا بیگم کی اس اطلاع پر شہرزاد کا رشین سیلڈ کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ فضا میں ہی معلق رہ گیا۔ اس نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا، جو چھری کانٹے کے ساتھ بڑی مہارت سے فش کھا رہی تھیں۔ اس وقت ڈائننگ روم میں وہ دونوں ماں بیٹی ہی موجود تھیں۔

''حمزہ کی فیملی کو کس خوشی میں انوائیٹ کرنا چاہ رہی ہیں آپ؟'' ہلکی سی ناگواری اس کے لہجے میں در آئی۔

''وہ جنرل خالد کا بیٹا ہے اور تمہیں پتا ہے میں ہمیشہ سے ہائی فائی فیملیز کے ساتھ اپنا سوشل سرکل مینٹین رکھتی ہوں۔''

''آئی ایم سوری مام، فی الحال آپ اپنا سوشل سرکل تھوڑا محدود ہی رکھیں، دو چار دن میں رومیصہ کا معاملہ نبٹ جائے پھر دیکھیں گے۔'' اس نے ٹینا بیگم کو صاف ٹالا۔

''رومی کا کیس ختم ہونے پر تو میں ایک گرینڈ پارٹی کا اہتمام کروں گی۔'' ٹینا بیگم کی اس اگلی اطلاع نے شہرزاد کو مزید کوفت میں مبتلا کیا۔

''مام، رومی نے کوئی گولڈ میڈل نہیں لیا اور نہ ہی وہ ابراڈ سے کوئی ڈگری لے کر آئی ہے، جس کی سیلبریشن آپ اتنے بڑے پیمانے پر کرنا چاہتی ہیں۔'' اس نے برا سا منہ بنا کر اپنی ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''واٹ دا ہیل شیری! پرابلم کیا ہے تمہارے ساتھ۔'' وہ چڑ گئیں۔

''مام ٹرائے ٹو انڈر اسٹینڈ، لوگ مذاق اڑائیں گے، کیس کے متعلق عجیب و غریب سوالات کر کے رومیصہ کو پریشان کرنے کی کوشش کریں گے، اس لیے اس حوالے سے ایسی کوئی گیدرنگ کرنے کی ضرورت

UrduBooks.pk

نہیں۔'' شہزاد نے اپنے مخصوص دو ٹوک انداز میں کہا۔

اس سے پہلے ٹینا بیگم اس بات کا کوئی اور کڑوا جواب دیتیں، رومیصہ بڑا سا دوپٹہ پھیلائے، شلوار قمیص میں ڈائننگ روم میں داخل ہوئی، ٹینا بیگم نے اس کے اس حلیے کو ناگوار نظروں سے دیکھتے ہوئے بے زاری سے پہلو بدلا۔

''رومی یہ تم کیا اوٹ پٹانگ حلیہ بنائے گھومتی ہو؟''

''کیوں، کیا ہوا ہے میرے حلیے کو؟ مام کی بات پر رومیصہ ہلکا سا گڑبڑا کر جلدی سے کرسی پر بیٹھ گئی، اس کے دل میں چور تھا اس لیے اس نے لاشعوری طور پر اپنا دوپٹہ مزید پھیلا لیا۔

''شلوار قمیص اور یہ ڈھائی گز کا دوپٹہ تو ساری زندگی تم نے نہیں لیا۔ اب کون سی بوڑھوں والی روح بیدار ہو گئی ہے تم میں؟'' ٹینا بیگم کی طنزیہ نگاہیں رومی پر جمی ہوئی تھیں جو دل ہی دل میں کافی خوف زدہ ہو چکی تھی۔

''مام، آپ کو کیا ایشو ہے رومیصہ کی ڈریسنگ سے؟ وہ جو پہننا چاہتی ہے اسے پہننے دیں۔'' شہزاد کی بات پر رومیصہ نے مشکور نگاہوں سے اپنی بہن کی طرف دیکھا جو اکثر ہی اس کے آگے ڈھال بن کر کھڑی ہو جاتی۔

''شیری تم نے شاید غور سے اسے دیکھا نہیں ہے دیکھو کتنا ویٹ گین کرتی جا رہی ہے۔'' ٹینا بیگم کی کھوجتی نگاہیں اور طنزیہ انداز پر رومی جھنجلا کر بولی۔

''مام پلیز کھانا کھانے دیں مجھے، یہ فضول بحث کسی اور دن کر لیجیے گا۔'' وہ منہ بنا کر پلیٹ میں کھانا نکالنے لگی۔

''کم آن مام! سارا دن تو گھر پر ہوتی ہے وہ، نہ کوئی یونیورسٹی، نہ کوئی اور فزیکل ایکٹویٹی، ایسی سچوئشن میں ویٹ تو گین ہوگا۔'' شہزاد کا انداز سرسری تھا۔

''میں کل ہی جم میں اس کی رجسٹریشن کرواتی ہوں، اسے فوراً ہی کوئی ورک آؤٹ کرنا چاہیے، لڑکیاں ایسی بے ڈھنگی اچھی نہیں لگتی ہیں۔'' اس سے پہلے ٹینا بیگم فٹنس پر مزید ایک لمبا لیکچر دیتیں، ان کے سیل فون پر آنے والی کال نے انہیں متوجہ کر لیا۔

وہ اپنا فون اٹھا کر ڈائننگ روم سے نکل گئیں تو رومیصہ نے کھل کر سانس لیا، اسی وقت شہزاد کی اس پر نظر پڑی، وہ ہلکا سا چونکی اور پھر مسکرا دی۔

''ویسے مام ٹھیک کہہ رہی ہیں رومی! تمہیں پہلی فرصت میں کوئی جم جوائن کر لینا چاہیے۔''

''کیا مصیبت ہے شیری! تم بھی اسی ایک بات کے پیچھے پڑ گئی ہو۔'' اس نے جھنجلا کر ہاتھ میں پکڑا کانٹا میز پر پٹخا اور ناراضی سے کھڑی ہو گئی۔

''آئی ایم سوری یار! میں نے تو یونہی ایک بات کی تھی، تم کھانا تو کھاؤ۔'' شیری کو افسوس ہوا۔

''مجھے نہیں کھانا، موڈ نہیں ہے اب میرا۔'' رومیصہ جان بوجھ کر خفا ہو کر ڈائننگ روم سے نکل گئی، وہ تو پہلے ہی بہانہ ڈھونڈ رہی تھی، جو شیری نے اسے فراہم کر دیا تھا اس لیے وہ کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھاتی۔

''رومی بات تو سنو میری، یار میں مذاق کر رہی تھی۔ آئی ایم سوری۔'' شہزاد نے پریشانی سے اسے پکارا، لیکن رومیصہ کو اپنی سراسیمگی پر قابو پانے کے لیے تنہائی درکار تھی، اس لیے وہ رکی نہیں اور سرعت سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

شہزاد کو گہرے تاسف نے آن گھیرا، وہ اس احساس کو کم کرنے کے لیے لان کی طرف چلی آئی، تازہ ہوا بڑی خوش گوار اور فرحت بخش تھی۔ پچھلے دو دن سے اسے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں مل رہی تھی، جیسے ہی وہ لان چیئر پر بیٹھی اس کا دھیان حمزہ کی طرف گیا تو اسے ایک دم شرمندگی کا احساس ہوا۔

UrduBooks.pk

”یقیناً وہ مجھ سے خفا ہوگا، تبھی تو دو دن سے کوئی کال اور ٹیکسٹ نہیں کیا، مجھے خود اس سے بات کرنی چاہیے۔“

شہزاد نے کچھ سوچ کر حمزہ کا نمبر ملایا جو تیسری بیل پر کاٹ دیا گیا تو وہ مسکرا دی۔ اس نے کچھ سوچ کر نئے سرے سے کال ملائی جو اس بار پانچویں بیل پر کاٹ دی گئی تو شہزاد کو یقین ہو گیا وہ خفا ہے۔

”حمزہ مجھے آپ سے بات کرنی ہے، پلیز میری کال اٹینڈ کریں۔“ اس نے کچھ سوچ کر اسے ٹیکسٹ میسج کیا۔

”آئی ایم بزی۔“ پانچ منٹ بعد اس کا ناراضی سے بھرپور جواب آیا تو وہ مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی کہ چاہے کتنی ہی بڑی بات کیوں نہ ہو وہ اس سے زیادہ دن تک خفا نہیں رہ سکتا۔ اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے اسے اگلا میسج کیا۔

”کیا آپ مجھ سے خفا ہیں؟“

”ڈونٹ ڈسٹرب می۔“ اس کے اگلے میسج پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

اسے معلوم تھا وہ ہمیشہ بچوں کی طرح جتنی جلدی ناراض ہوتا تھا، اتنی ہی آسانی سے مان جاتا تھا۔ شہزاد کو اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔

”آپ جتنے بھی خفا سہی، لیکن ایک دفعہ بات تو کرلیں مجھ سے۔“ اس نے اگلا میسج کیا اور ٹھیک پندرہ سیکنڈ بعد حمزہ کی کال آگئی۔ جو اس نے بڑے خوش گوار موڈ میں اٹینڈ کی، وہ جانتی تھی، چند گلے شکوے کرنے کے بعد وہ سیٹ ہو جائے گا۔

”جی جناب کیسے ہیں آپ حمزہ خالد صاحب؟“

”تم میری خیریت کو چھوڑو۔“ اس کا سرد لہجہ شہزاد کی سماعتوں سے ٹکرایا۔

”کیا مطلب؟“ اسے حمزہ کا انداز کچھ غیر معمولی سا محسوس ہوا۔

”ایک بات غور سے سنو شہزاد، میں زندگی میں ہر چیز برداشت کرسکتا ہوں لیکن اپنا نظر انداز کرنا نہیں، تم مجھ سے محبت کرو یا نہ کرو، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن تم مجھ پر کسی اور کو ترجیح دو۔ میں یہ چیز کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ میں جان چکا ہوں، تمہارے نزدیک تمہارا پروفیشن مجھ سے زیادہ زیادہ اہم ہے اِس لیے تمہیں وہی مبارک ہو، میں دوبارہ تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گا اور چاہوں گا کہ تم بھی ایسا نہ کرو۔“ حمزہ اپنی بات مکمل کرکے کال کاٹ چکا تھا۔

شہزاد کو یوں لگا جیسے کسی نے اسے اٹھا کر جلتی ہوئی بھٹی میں پھینک دیا ہو۔ اس نے خود پر کس طرح سے قابو پایا یہ اس کا دل جانتا تھا۔ اسے اپنے اعصاب سخت کشیدہ محسوس ہوئے اور وہ کافی دیر تک سن کیفیت میں بیٹھی رہی۔ اس کا چہرہ کسی بلب کی مانند فیوز ہو گیا تھا، اس کا دماغ اس بات کو تسلیم کرنے سے انکاری تھا کہ حمزہ خالد اس سے اتنے زہر آلود لہجے میں بھی بات کرسکتا ہے۔

اس نے صدمے بھری کیفیت کے ساتھ اس کا نمبر دوبارہ ملایا، وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ اس نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا اور وہ اس کے بارے میں غلط سوچ رہا ہے، لیکن دوسری طرف موجود شخص کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھا، شہزاد کی کال اس بار بھی کاٹ دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی اسے حمزہ کا اپنے سیل فون پر ٹیکسٹ موصول ہوا۔

”شیری مجھے دوبارہ کال مت کرنا، ورنہ میں تمہارا نمبر بلاک لسٹ میں ڈال دوں گا۔“

یہ میسج نہیں ایک جلتا ہوا انگارہ تھا، اس نے گھبرا کر سیل فون گود میں رکھ لیا، حمزہ خالد نے اسے زندگی میں پہلی بار اس کے مکمل نام سے نہیں پکارا تھا۔ وہ شہزاد کی بجائے شیری نام میں چھپی ہوئی اس کیا جنبیت کو کسی بوجھ کی

UrduBooks.PK

طرح اپنے دل پر گرتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

آسمان پر موجود ستاروں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی نے ماحول کو خاصا پراسرار بنا رکھا تھا۔

انابیہ اپنے بیڈ روم میں اکیلی تھی، اس کی آنکھوں میں افسردگی کی ایک گہری تہہ تھی۔ کاتب تقدیر نے جانے اس کی قسمت میں کیا لکھ دیا تھا، ایک تو اس کی شادی اتنے عجیب ماحول میں ہوئی اور اس کے بعد ہونے والے یکے بعد دیگرے واقعات نے اس گھر کے سب مکینوں کی زندگیوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا، جبکہ انابیہ کے اوپر تو دہری قیامت ٹوٹی تھی۔ ایک طرف برہان کا سرد رویہ اس کے اندر آگ جلاتا اور دوسری طرف گھر میں کسی کو احساس ہی نہیں تھا کہ ان دونوں کی نئی نئی شادی ہوئی ہے اور ہر کوئی در شہوار اور وہاج کے مسئلوں میں الجھا ہوا تھا۔

وہ امید بھری نگاہوں سے برہان کی طرف دیکھتی، ان کی جھڑکیاں سنتی اور وقتی طور پر ان سے تھوڑا دور ہو جاتی اور پھر چند ہی گھنٹوں بعد ڈھیٹ بن کر واپس پلٹ آتی، کیونکہ اسے برہان سے محبت تھی اور اس محبت کا خراج شاید اسے ساری زندگی دینا تھا۔

''آخر آپ دونوں کے درمیان چل کیا رہا ہے؟'' ایک دن طوبیٰ نے اپنی بڑی بہن کو آڑے ہاتھوں لیا۔

''کچھ چلنے کی نوبت ہی کہاں آئی ہے، مجھے تو لگتا ہے بس اس گھر میں میرا کمرہ تبدیل ہوا ہے۔'' انابیہ نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''شوہر ہیں وہ آپ کے، نکاح ہوا ہے ان کے ساتھ، آپ کو اپنے ہونے کا احساس دلانا چاہیے برہان بھائی کو۔''

''اسی احساس سے تو چڑتے ہیں وہ۔'' وہ تلخی سے گویا ہوئی۔

''اتنی ہی نفرت تھی آپ سے تو شادی کیوں کی انہوں نے؟'' طوبیٰ کو غصہ آیا۔

''برہان نے اپنی رضامندی سے شادی نہیں کی مجھے تو زبردستی مسلط کیا گیا ہے ان پر۔'' انابیہ کو اب صرف اپنی قسمت سے گلہ تھا۔

''پتا نہیں کس دنیا میں رہتی ہیں آپ؟ لڑکیاں تو اچھے خاصے مردوں کو قابو کر لیتی ہیں۔'' طوبیٰ نے بے زاری سے اپنی بہن کا سادہ چہرہ دیکھا۔

''جو شخص پہلے ہی سے کسی کی چاہت کے حصار میں ہو، اس پر کسی اور کی محبت کا جادو نہیں چلتا۔'' وہ مکمل طور پر مایوس ہو چکی تھی، طوبیٰ نے ناراضی سے اس کی طرف دیکھا اور پیر پٹختی ہوئی چلی گئی۔

☆☆☆

میر وہاج والے قصے کے بعد تو میر ہاؤس کے سب ہی مکین مصروف تھے، ہر وقت گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت جاری رہتی۔

میر حاکم نے خاقان علی کو ملتان الیکشن مہم کے لیے بھجوا دیا تھا جہاں وہ سیاسی جلسوں میں اپنے بھتیجے کی بے گناہی اور مخالفین کے جھوٹے مظالم کی کہانیاں بڑے جوش و خروش کے ساتھ سنا رہے تھے یہ الگ بات تھی کہ لوگ اس پر یقین ذرا کم ہی کر رہے تھے، کیونکہ انہوں نے پچھلے پانچ سالوں میں اپنے حلقے میں کوئی کام نہیں کروایا تھا۔ حاکم علی اور محتشم علی نے اسلام آباد کی سرگرمیوں کو سنبھال رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ در شہوار کی بھی تلاش جاری تھی۔

وال کلاک پر اس وقت رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔

انابیہ کو اپنے بیڈ روم میں گھٹن کا احساس ہوا تو وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی، پورا گھر سناٹے میں ڈوبا ہوا

UrduBooks.pk

تھا، وہ کچھ دیر تو یونہی دائیں بائیں ٹہلتی رہی اور پھر کچھ سوچ کر پچھلے صحن کی طرف نکل آئی۔

آسمان پر چند ٹمٹماتے ہوئے ستارے تھے اور باہر بھی ہو کا عالم تھا، درختوں کے پتے بالکل ساکت تھے، جیسے کسی نے ہوا کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ ہر طرف حبس اور گھٹن کا احساس تھا۔ وہ برآمدے میں رکھے ہوئے لکڑی کے جھولے پر بیٹھ گئی، جو اس گھر کی لڑکیوں کی پسندیدہ ترین جگہ تھی، اور اس پر بیٹھنے کے لیے باقاعدہ جھگڑا ہوا کرتا تھا، حالانکہ جھولا اتنا بڑا تھا کہ اس پر ایک وقت میں تین لوگ آسانی سے بیٹھ سکتے تھے۔

انابیہ نے جھولے کے ساتھ ٹیک لگائی اور پاؤں کی نوک سے اسے آہستہ آہستہ جھلانے لگی۔ اس کا ذہن بُری طرح سے برہان کے رویئے میں الجھا ہوا تھا، جو اسے بالکل بھی لفٹ نہیں کروا رہے تھے، وہ ان کے بیڈ روم میں تو آچکی تھی لیکن زندگی میں اپنی جگہ بنانے میں ابھی تک ناکام تھی۔

وہ دونوں ایک کمرے میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے صدیوں کے فاصلے پر تھے، بلکہ برہان نے تو اپنا بیڈ بھی اس کے ساتھ شیئر کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا اور اس کا ٹھکانہ بیڈ روم میں رکھا ہوا کاؤچ تھا۔

''کیا ہم دونوں کی ساری زندگی یوں ہی اجنبی بن کے گزرے گی۔'' وہ لکڑی کے جھولے پر بیٹھی ہوئی مستقبل کی سوچوں میں غلطاں تھی۔

اسے وہاں بیٹھے بامشکل دس منٹ گزرے تھے جب پچھلی گیلری کی طرف اسے ہلکی سی سرسراہٹ کا احساس ہوا، اس نے چونک کر اپنے دائیں طرف دیکھا، پڑوس میں موجود ہادی کا گھر مکمل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ویسے بھی رات کے اس پہر کون بھلا مانس جاگ سکتا تھا۔

رات کے سناٹے میں اچانک ایک الو کی تیز آواز گونجی اور انابیہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے گھبرا کر دیکھا، ایک خوفناک آنکھوں والا الو پھڑ پھڑاتا ہوا ہادی کے گھر کی طرف سے ان کے برآمدے کی طرف آ رہا تھا۔

الو کی آنکھوں میں موجود خوفناک سی چمک دیکھ انابیہ کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی وہ ننگے پاؤں اندر کی طرف بھاگی اور سامنے کوریڈور سے آتے ہوئے برہان سے بُری طرح ٹکرا گئی، اس کے پورے جسم پر لرزا طاری تھا۔

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا، آدھی رات کو یہاں کیا کر رہی ہو۔'' میر برہان نے جھنجھلا کر اسے خود سے الگ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس قدر سہمی ہوئی تھی کہ کسی بھی قیمت پر ان سے الگ ہونے کی تیار نہیں تھی، اور اس اونچی آواز میں رونے لگی۔ وہاج جو ابھی اسلام آباد سے واپس آئے تھے اور بیڈ روم میں اسے نہ پا کر اس کی تلاش میں باہر نکلے تھے اور اب اسے یوں روتا دیکھ کر جھنجھلا گئے۔

''بے وقوف لڑکی، کچھ نہیں ہوا، چلو اندر۔'' اس کے رونے پر برہان کا دل تھوڑا نرم ہوا۔

''باہر خوفناک آنکھوں والا الو ہے، وہ مجھ پر حملہ کرنے والا تھا۔'' انابیہ کے حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکلی۔

''تمہیں کس نے کہا تھا آدھی رات کو باہر نکلو۔'' وہ اسے اپنے ساتھ لگائے کمرے میں لے آئے۔ انابیہ نے ان کا بازو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

الو کی تیز چمک دار آنکھیں یاد کر کے اسے بار بار جھرجھری سی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے بیڈ روم میں داخل ہو کر اس نے سب سے پہلے دروازہ مضبوطی سے بند کیا، اس کا جسم ابھی بھی کانپ رہا تھا۔ برہان نے تاسف بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور بازو سے پکڑ کر اسے بیڈ پر بیٹھا دیا۔ وہ اب سائیڈ میز پر رکھے ہوئے جگ سے پانی کا گلاس بھر رہے تھے انہوں نے جیسے ہی گلاس اس کی طرف بڑھایا، وہ ایک ہی سانس میں پی گئی۔

اس کا پورا چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا اور آنکھوں سے خوف چھلک رہا تھا۔

''تمہیں اچھی طرح سے علم ہے باہر والے صحن کے پیچھے گھنا جنگل ہے، بھلا رات کے اس پہر وہاں جانے کی کیا تک بنتی تھی۔'' برہان کا دل تھوڑا نرم ہوا کیونکہ سامنے بیٹھی انابیہ کی حالت واقعی خراب تھی۔

''کمرے میں گھٹن کا احساس ہو رہا تھا مجھے۔'' وہ اپنی آواز میں موجود کپکپاہٹ کو چھپا نہیں پا رہی تھی۔
''انسانوں کے اندر کی گھٹن گھر کے صحن میں جانے سے بھی کم نہیں ہوتی۔ تمہیں اتنی سی بات سمجھ لینی چاہیے۔'' وہ افسردگی سے گویا ہوئے۔
''میرا دل ابھی بھی بُری طرح سے دھڑک رہا ہے۔'' انابیہ نے لاشعوری انداز میں برہان کا گرم ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے سے لگایا۔ وہ انہیں دل کی دھڑکن سنانا چاہتی تھی لیکن برہان کو ایسا لگا جیسے ان کا ہاتھ کسی برقی رو سے ٹکرا گیا ہو۔ وہ گھبرا کر ایک دم پیچھے ہٹے۔
''پتا ہے مجھے، تھوڑی دیر بعد خود بخود ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' وہ نظریں چرا کر آہستہ سے گویا ہوئے۔
''لیکن مجھے ابھی بھی ڈر لگ رہا ہے۔'' اس کے لہجے میں خوف تھا۔
''کچھ نہیں ہوتا، میں تمہارے ساتھ ہوں، بس خاموشی سے آنکھیں بند کر کے یہیں سو جاؤ۔'' وہ جو پچھلی کئی راتوں سے ان کے تنفر کی عادی ہو چکی تھی۔ اس التفات پر تو دل اور ہی لے میں دھڑکنے لگا۔ وہ اپنا تکیہ ٹھیک کر کے رکھ رہے تھے۔ وہ بھی جھجک کر ان کے برابر میں لیٹ گئی۔ کمرے میں زیرو واٹ کا بلب روشن تھا اور دونوں کے درمیان معنی خیز خاموشی کے لمحے ٹھہر گئے۔ برہان بھی شاید اس سے دُور بھاگ بھاگ کر تھک گئے تھے۔
''اب ڈر تو نہیں لگ رہا تمہیں۔'' ان کا لہجہ سادہ تھا۔
''نہیں۔'' وہ آہستہ سے گویا ہوئی۔
''کیوں؟'' برہان نے انجان بن کر پوچھا، زندگی میں پہلی بار اس سے بات کرنا انہیں بُرا نہیں لگ رہا تھا۔
''اب آپ جو ہیں میرے پاس۔'' اس کے لہجے میں کچھ تھا، برہان پر ڈھیروں خفت کا حملہ ہوا۔ انہیں پوری شدت سے اپنی کوتاہی کا احساس ہوا۔
''آئی ایم سوری!'' برہان کی بڑبڑاہٹ پر اس کے کان کھڑے ہوئے۔
''کس بات پر؟'' اب انجان بننے کی باری انابیہ کی تھی۔
''میں تمہیں وہ سب کچھ نہیں دے سکا جو تمہارا حق تھا۔'' ان پر آج سچ بولنے کا دورہ پڑا ہوا تھا۔
''ابھی ہماری نئی زندگی کے آغاز کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔'' اس نے کھلے دل کے ساتھ ان کا حوصلہ بڑھایا تو ایک افسردہ سی مسکراہٹ برہان کے لبوں پر دم توڑ گئی۔ انہیں شدت سے آج اپنی زیادتیوں کا احساس ہو رہا تھا۔ انہوں نے آہستہ سے اپنا بازو انابیہ کے ہاتھ پر رکھا، وہ ان کے لمس میں موجود نرمی کو محسوس کر کے مسکرائی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ بہار کو اب اس کی زندگی میں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

☆☆☆

آسمان کی ملگجی سیاہی، چمک دار اجلی نیلاہٹ میں تبدیل ہو چکی تھی۔
شہزاد نے ساری رات ٹیرس پر جاگ کر گزاری، اس کی کرسی کے پاس چھوٹی میز پر اس کی فائلوں کا ڈھیر تھا اور اس میز کے چاروں اطراف میں فرش پر بے شمار کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔ جو اس کے اندرونی اضطراب کی بھرپور عکاسی کر رہے تھے۔
اس کی سوجی ہوئی آنکھیں رتجگے کی غماز تھیں، ساری رات حمزہ کا سرد لہجہ اس کی سماعتوں میں انگارے برساتا رہا، اور وہ چاہ کر بھی اپنا کوئی آفیشل کام نہیں نبٹا سکی۔ شہزاد، جس کی زندگی کی پہلی ترجیح اس کا پروفیشن تھا اور وہ اس پر سمجھوتا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی لیکن پہلی بار اسے ہر چیز سے اکتاہٹ محسوس ہوئی۔ اس کی فائلیں اس کی منتظر تھیں، اسے کچھ نوٹس بھی بنانے تھے لیکن دل و دماغ آج اس کے اختیار میں نہیں تھے۔
اسے اب حمزہ خالد کا رویہ انتہائی امیچورڈ اور بچگانہ لگ رہا تھا، وہ مانتی تھی، کچھ غلطی اس کی بھی تھی لیکن کم از کم

وہ اس سے اس قدر شدید ردعمل کی توقع نہیں رکھتی تھی۔ وہ اس سے خفا ہوتا تو شاید وہ منا لیتی لیکن اس نے تو ایک جھٹکے سے اسے خود سے الگ کر کے پھینک دیا تھا۔

شہرزاد کو پہلے اس کی باتوں پر صدمہ پہنچا اور جیسے جیسے وہ ان باتوں کی گہرائی پر غور کرتی گئی، تو صدمے کی کیفیت کی جگہ اپنی ناقدری نے لی تھی۔

ایک گھنٹہ شاور لینے کے بعد بھی اس کے اندر کی کھولن کم نہیں ہوئی، وہ حمزہ کے تلخ جملوں کو سینکڑوں بار اپنے ذہن میں دہرا چکی تھی، اس کی باتیں اتنی سخت نہیں تھیں لیکن اس کا لہجہ کسی کو بھی زندہ زمین میں گاڑ دینے کے مترادف تھا۔

اسے پہلی بار احساس ہوا، لفظ انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اگر لہجے زہر آلود نہ ہوں تو انسان کڑوا گھونٹ بھی کسی نہ کسی طرح پی ہی لیتا ہے۔ جیسے وہ اس کی باتوں کو ہضم کرنے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن اس کوشش میں بری طرح سے ناکام تھی۔ وہ ایسی تھکن محسوس کر رہی تھی جیسے کئی صدیوں کی مسافت طے کر آئی ہو۔

اس دن وہ ناشتہ کیے بغیر گھر سے نکل آئی، باہر آ کر ایک اور صدمہ اس کا منتظر تھا۔ گیٹ پر موجود سیکورٹی گارڈ نے بتایا اس کا پرسنل گارڈ رضا رات ہی واپس جا چکا ہے اور اسے اپنی کمپنی کی طرف سے واپسی کے آرڈرز ملے تھے۔

رضا کی واپسی، یقیناً حمزہ کے حکم کے بغیر ممکن نہیں تھی اور اس سوچ کے آتے ہی شہرزاد کی رنجیدگی، ناراضی میں تبدیل ہو گئی۔ وہ جان گئی تھی رضا کے واپس جانے کا صاف مطلب یہ تھا کہ حمزہ کو اب حقیقت میں اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا، وہ مرے یا جیے اس سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس سوچ نے اس کے اندر کی انا پرست لڑکی کو ایک جھٹکے میں بیدار کر دیا۔

''گو ٹو ہیل۔'' اس نے غصے سے اپنی گاڑی کا دروازہ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

آج اسے مسز قریشی کو آفس جاتے ہوئے پک کرنا تھا، کیونکہ دونوں کی ڈی پی او کے ساتھ ایک ضروری میٹنگ تھی، اس کا آج کا سارا دن مصروف گزرنے والا تھا۔ شہرزاد نے اپنی گاڑی مسز قریشی کے گھر کی جانب موڑ لی، وہ ان سے اگلے ہی سیکٹر میں رہتی تھیں، دس منٹ بعد اس کی گاڑی ہادی کے خوب صورت بنگلے میں داخل ہو رہی تھی۔ مالی اس وقت لان میں پودوں کو پانی دے رہا تھا۔

وہ جیسے ہی اپنی گاڑی سے باہر نکلی، گھر کے اندرونی دروازے سے ہادی عجلت بھرے انداز میں اپنا لیپ ٹاپ کا بیگ اٹھائے نکل رہا تھا، اسے آج مری کے لیے دیر ہو گئی تھی، اسے دیکھ کر وہ ہلکا سا ٹھٹکا اور اس کی سوجی آنکھوں کو بغور دیکھتے ہوئے اس نے سلام کیا۔

''کیسے ہیں ہادی آپ؟'' وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

''میں تو ٹھیک ہوں، لیکن شاید آپ ٹھیک نہیں۔'' اس کے لہجے میں فکر مندی تھی۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' شہرزاد نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ ڈارک براؤن کلر کی پینٹ کے ساتھ فان کلر کی شرٹ میں وہ خاصا اسمارٹ لگ رہا تھا۔

''آئی تھنک ساری رات کام کرتی رہی ہیں آپ، تب ہی آنکھیں اتنی زیادہ سرخ ہو رہی ہیں۔'' ہادی کی بات پر وہ ہلکا سا گڑبڑائی۔

''اندازے اچھے لگا لیتے ہیں آپ، بس کچھ ایسا ہی سلسلہ رہا رات بھر۔'' وہ زبردستی مسکرا کر مزید گویا ہوئی ''آپ شاید مری کے لیے نکل رہے ہیں؟''

''تھینکس گاڈ، آپ نے یاد دلا دیا میں آل ریڈی لیٹ ہو چکا ہوں، ان شاء اللہ نیکسٹ ویک اینڈ پر

ملاقات ہوتی ہے۔'' وہ تیزی سے پورچ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھا اور چلتے چلتے رکا اور پھر مڑ کر اسے مخاطب کیا۔۔

''ایک بات کہوں شہرزاد؟''

اس کے انداز میں کچھ تھا شیری کے دل کی دھڑکن بے ربط ہوئی۔ وہ جانتی تھی وہ اس وقت حمزہ کے علاوہ کوئی اور بات نہیں کرے گا، وہ دونوں بیسٹ فرینڈز تھے اور یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اس کے اور حمزہ کے بیچ کی ناراضی کے بارے میں جانتا نہ ہو۔

''مرد کی انا پر جب چوٹ پڑتی ہے تو وہ ساری محبت لپیٹ کر ایک سائیڈ پر رکھ دیتا ہے، کوشش کیجیے گا اپنی زندگی میں ایسا کوئی موقع نہ آنے دیں۔'' ہادی کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گیا۔ شہرزاد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔

''جب عورت کی انا پر چوٹ پڑتی ہے تو وہ انتہائی محبت کے ساتھ سر پر بیٹھائے ہوئے مرد کو بری طرح سے زمین پر لا پٹختی ہے اور پھر ساری زندگی اس کی طرف مڑ کر نہیں دیکھتی۔'' وہ اپنی بات مکمل کر کے رکی نہیں اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اندر کی طرف بڑھ گئی۔

''لو جی حمزہ خالد! ساری زندگی کی خواری آپ کی قسمت میں لکھی جا چکی ہے۔'' وہ دل ہی دل میں سوچتا ہوا اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔

وہ اچھی طرح سے جانتا تھا، وہ شہرزاد تھی، جو محبت میں صرف دل دینے کی قائل تھی، اپنی عزت اور انا کا سودا کسی بھی قیمت پر نہیں کر سکتی تھی، وہ مر سکتی تھی لیکن کسی کے سامنے جا کر یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔

شہرزاد اپنی دھن میں چلتی ہوئی جیسے ہی مسز قریشی کے سٹنگ روم میں داخل ہوئی، اس کی نظر صوفے پر بیٹھی ہوئی در شہوار پر پڑی۔ شہرزاد کو دیکھتے ہی در شہوار کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا، جبکہ شہرزاد نے بھی ہلکا سا ٹھٹک کر اس لڑکی کو دیکھا، جس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا، لیکن وہ اب اتنی نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی کہ شہرزاد کو الجھن کا احساس ہوا۔

''السلام علیکم!'' شہرزاد کے سلام کرنے پر اس کے ہونٹوں پر ایک زہر آلو تبسم نے کروٹ لی۔

''پلیز مسز قریشی کو بتا دیں، بیرسٹر شیری آئی ہیں۔'' اس نے اس کی خاموشی سے گھبرا کر اسے کہا۔

''میں اس گھر کی سرونٹ نہیں ہوں۔'' در شہوار بولی تو اس کے لہجے میں سختی کے ساتھ محسوس کیا جانے والا تنفر بھی نمایاں تھا۔

''آئی ایم سوری، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔۔'' وہ شرمندہ ہوگئی۔

وہ شہرزاد کی مزید کسی بھی بات کا جواب دیئے بغیر پاؤں پٹختی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی، شہرزاد کو عجیب سا احساس ہوا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کے بارے میں سوچتی، ایک ملازمہ گھومتی ہوئی ادھر آ نکلی تھی۔ اس نے اپنا پیغام اسے دیا اور خاموشی سے صوفے پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگی۔

وہ سارا دن اس نے مسز قریشی کے ساتھ خاصا مصروف گزارا، لیکن دھیان کی بند کھڑکیاں بار بار حمزہ کی طرف کھل رہی تھیں۔ جسے وہ پوری شدت سے نظر انداز کر کے دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہو جاتی، لیکن آج اس کی کارکردگی تھوڑی سست رہی اور اس بات کو مسز قریشی نے بھی کئی بار محسوس کیا۔

دوپہر میں وہ مسز قریشی اور اپنے ایک کلائنٹ کے ساتھ لنچ کرنے ''سرینہ'' ہوٹل پہنچی تو اس کا موڈ کافی بہتر ہو چکا تھا، لیکن آج شاید اس کے ستارے گردش میں تھے۔

بوفے لنچ کے لیے ہال میں داخل ہوتے ہوئے اس کی نظریں سب سے پہلی میز پر موجود حمزہ خالد کے ساتھ ایک اسٹائلش سی لڑکی پر پڑیں۔ اس کے ساتھ ہی اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا دل اپنی مٹھی میں بند کر کے مسل دیا ہو۔

زمین نے اس کے پیروں کو مضبوطی سے جکڑ لیا تھا۔ حمزہ خالد کو بھی خود پر کسی کی نگاہوں کی جلن محسوس ہوئی تو اس نے بھی چونک کر سامنے کی طرف دیکھا، شہرزاد براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی، جہاں اس کے لیے محض اجنبیت کے گہرے سائے تھے۔ اس نے شہرزاد پر یوں ایک سرسری سی نظر ڈالی تھی جیسے ان کے بھی درمیان شناسائی نہ رہی ہو۔

وہ اب مسکراتے ہوئے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کی پلیٹ میں فرائیڈ رائس ڈال رہا تھا، جو ہنستے ہوئے اسے بار بار منع کر رہی تھی۔ شہرزاد کو یہ منظر دیکھ کر اپنی آنکھوں میں مرچیں بھرتی محسوس ہوئیں۔

مسز قریشی فون پر بات کرتے ہوئے اپنے کلائنٹ کے ساتھ ایک خالی میز کی طرف بڑھ گئیں، اسے بھی مجبوراً ان کی پیروی کرنا پڑی، ویسے بھی راستے میں یوں کھڑے ہونا عجیب لگ رہا تھا۔ مسز قریشی نے شاید حمزہ کی طرف نہیں دیکھا تھا ورنہ وہ اس سے سلام دعا کرنے کے لیے ضرور رکتیں۔

شہرزاد کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹا۔ وہ خاموشی سے جا کر بیٹھ تو گئی لیکن اس کی ساری بھوک پیاس اڑ چکی تھی۔ اس نے ایک رات میں اس شخص کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھا تھا اور اس چیز کو قبول کرنے کے لیے اسے کئی سال درکار تھے، اس نے گلے میں لگنے والے پھندے کو ختم کرنے کے لیے ٹھنڈے یخ پانی کے گلاس کو منہ سے لگا لیا، لیکن اندر جلتا ہوا الاؤ، ایک گلاس پانی سے کہاں ختم ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

ساری رات مونیکا نے ہوٹل میں رو رو کر گزاری تھی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

چلمن

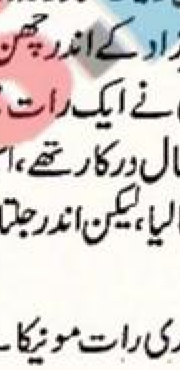

نادرہ خاتون

قیمت -/300 روپے

دل ایک گلشن

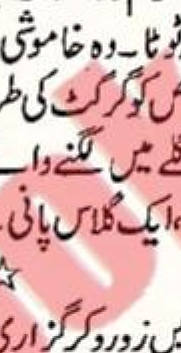

رضیہ جمیل

قیمت -/300 روپے

دستِ کوزہ گر

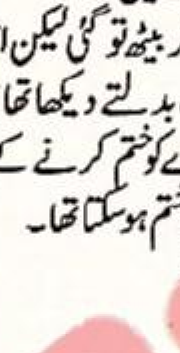

فوزیہ یاسمین

قیمت -/750 روپے

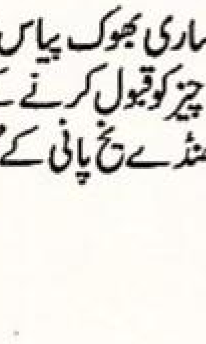

نسیم سحر قریشی

قیمت -/400 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32735021

بڑی حویلی سے دھتکارے جانے کے بعد ذوالکفل اسے کسی دوست یا رشتے دار کے گھر جانے کے بجائے ہوٹل لے آیا۔ وہ دونوں اس وقت شدید صدمے کی کیفیت کا شکار تھے لیکن مونیکا کو اپنی تذلیل کا احساس بار بار کچوکے لگا رہا تھا۔

"کیا آپ کو بھی لگتا ہے میں نے آپ کے ساتھ شادی آپ کی دولت کی وجہ سے کی ہے۔" اس نے ٹشو سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے رنجیدگی سے پوچھا۔

"یار پاگل ہوگئی ہو کیا؟ کیوں بے وقوفوں جیسی باتیں کرتی ہو، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے تمہیں کبھی بھی اپنے بیک گراؤنڈ کے بارے میں نہیں بتایا اور نہ ہی تم نے کبھی اس معاملے میں کوئی دلچسپی لینے کی کوشش کی۔" ذوالکفل نے محبت سے اسے اپنے ساتھ لگا کر تسلی دی۔

"پھر آپ کے بابا ایسا کیوں سوچ رہے ہیں؟" مونیکا کو اس کے والد کا زہر آلود لہجہ یاد آیا تو اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔

"ظاہر ہے ان کی سوچ یہیں تک جا سکتی ہے، ویسے بھی جس شخص کو اپنے حسب نسب اور خاندانی دولت پر غرور ہو، وہ ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔" ذوالکفل اپنے والد سے دل ہی دل میں ناراض ہو چکا تھا۔

"مجھے تو لگتا ہے یہ لوگ ساری زندگی ہمیں معاف نہیں کریں گے۔" مونیکا کو اگلی پریشانی نے گھیر لیا۔

"ایسا نہیں ہوگا، وہ لوگ تمہیں اہمیت دیں یا نہ دیں لیکن میری اولاد کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔" ذوالکفل کے لہجے میں آنے والے دنوں کے لیے خاصی روشن امید تھی۔

"مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ لوگ مجھے اس طرح سے دھتکاریں گے۔" مونیکا افسردہ ہوئی۔

"توقع تو مجھے بھی نہیں تھی لیکن تم ٹینشن مت لو، ان شاء اللہ بی جان مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گی۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں اور میرے بغیر نہیں رہ سکتیں۔" ذوالکفل کو اپنی ماں کی محبت پر بھرپور یقین تھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں کل ہی واپس لاہور چلے جانا چاہیے۔"

"تم اپنے والدین سے نہیں ملو گی کیا؟" ذوالکفل حیران ہوا۔

"مجھے اب ان سے بھی کوئی اچھی امید نہیں، ایسا نہ ہو وہ اس سے بھی برا سلوک کریں۔" مونیکا بہت مایوس ہو چکی تھی۔

"وہ جتنا بھی برا سلوک کر لیں لیکن کم از کم ایسا نہیں ہوگا جیسے میرے والد صاحب نے تمہارے ساتھ کیا، اور مجھے اس بات کا بہت دکھ ہے، ہو سکے تو تم مجھے معاف کر دینا، کیونکہ یہ سب میری وجہ سے تمہیں بھگتنا پڑ رہا ہے۔" ذوالکفل واقعی دل سے شرمندہ تھا اس کی اس بات پر مونیکا بھی خفت کا شکار ہوئی۔

"اس میں آپ کا تو کوئی قصور نہیں، اس لیے آپ پلیز معافی مت مانگیں۔" وہ اپنی نم آنکھوں کے ساتھ اسے مطمئن کرنے کے لیے زبردستی مسکرائی۔

"بس فیصلہ ہو گیا، کل تمہارے پیرنٹس سے ملنے کے بعد ہم لاہور کے لیے نکل جائیں گے۔" ذوالکفل نے اپنی شریک حیات کو محبت کے ساتھ اپنے ساتھ لگایا اور نرمی سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اپنا اگلا پلان بتایا۔

"اگر ان لوگوں کو ہماری ضرورت نہیں ہے تو ہمیں بھی کسی کا ساتھ نہیں چاہیے، ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے کافی ہیں۔" وہ مونیکا کی دلجوئی کر رہا تھا جس کا دل اس کی باتوں کو سننے کے بعد ہی ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

شام ہی سے لودھراں شہر کی فضا گرد و غبار سے اٹی ہوئی تھی۔

ایک تو بے تحاشا گرمی اور اوپر سے ماحول میں ر   ردینے والا حبس طاری تھا۔ وہاج فلیٹ سے اپنی ضروری چیزیں سمیٹ رہے تھے، انہیں آج اپنی گاڑی سے کراچی کے لیے نکلنا تھا۔ جہاں ان کا دوست خاور ان کا منتظر تھا۔

اسد چیمہ صوفے پر بیٹھا ہوا بار بار بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا اور اس کی نظریں بار بار بھٹک کر وال کلاک کی طرف جا رہی تھیں۔ وہاج نے اس کی بے چینی کو محسوس کیا اور ایک دل جلانے والی مسکراہٹ ان کے لبوں پر آ گئی۔

''کیوں ٹینشن لے رہے ہو، آج جان چھوڑ رہا ہوں تمہاری۔'' وہاج کی بات پر اسد کھسیا سا گیا۔

''ارے نہیں نہیں، تم غلط سمجھ رہے ہو مجھے اصل میں شزا سے ملنے جانا تھا۔'' اسد نے گھبرا کر اپنی گرل فرینڈ کا نام لیا جس کے ساتھ اس کی آج کل خوب دوستی تھی اور وہاج بھی اس سے مل چکے تھے۔

''تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔'' وہاج کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا، انہوں نے بیگ میں اپنے کپڑے رکھ کر زپ بند کی، ان کی یہ ساری شاپنگ اسد نے کی تھی کیونکہ وہ اس دن مری سے خالی ہاتھ ہی نکلے تھے انہیں اپنے کپڑے وغیرہ بھی لینے کا موقع نہیں ملا تھا۔

''وہاج، تم مجھ سے خفا ہو کر تو نہیں جا رہے ہو؟'' اسد نے فلیٹ کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے ہلکا سا جھجک کر پوچھا تو وہ مسکرا دیے۔

''ارے نہیں یار، میں تمہاری مجبوری سمجھتا ہوں، اصل میں اقتدار چیز ہی ایسی ہے، جس کے لیے انسان اپنی سگی اولاد تک کا خون بہا دیتا ہے، اور الیکشن کے دن ہیں، میں نہیں چاہتا تم لوگ بھی اسی سچویشن سے گزرو جس سے میر   خاندان گزر رہا ہے۔'' وہاج کی بات پر اسد کو کچھ شرمندگی ہوئی۔

''جیسے ہی حالات ٹھیک ہوں گے میں تمہیں بلا لوں گا۔'' اسد نے یوں ہی انہیں دلاسہ دینے کو کہا لیکن وہاج اس صورت حال میں جان چکے تھے، بُرے وقت اور مصیبت میں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا، اپنے حصے کا جہنم انسان کو خود ہی بھگتنا پڑتا ہے۔

وہاج جب اسد کے فلیٹ سے نکلے، اس وقت رات کے دس بج رہے تھے اور پورا شہر سرخ آندھی کی لپیٹ میں تھا۔ گرد اور مٹی کے اس طوفان میں بمشکل گاڑی چلاتے ہوئے ہائی وے کی طرف جا رہے تھے۔

ایک سنسان سڑک پر اچانک ان کی گاڑی کا ٹائر برسٹ ہوا۔ وہاج اس اچانک حملے سے سنبھل نہیں سکے ان کی گاڑی غیر متوازن ہوئی انہوں نے پوری قوت سے بریک لگایا اور اردگرد کی فضا ٹائروں کے چرچرانے کی آواز سے گونج اٹھی۔

اس سے پہلے وہ سنبھل کر صورتحال کا جائزہ لیتے۔ تین چار لمبے تڑنگے آدمی رات کے سیاہ اندھیرے میں ان کی گاڑی کی طرف بڑھے، غصے سے ان کی گاڑی کا دروازہ کھولا اور سب سے آگے موجود شخص نے وہاج کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ہاتھ میں پکڑی کلاشنکوف کا پورا برسٹ ان کے سینے پر خالی کر دیا۔ فضا میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ پھیل گئی اور دور کہیں اجل نے بھی میر وہاج علی کے مردہ وجود کو استہزائیہ نظروں سے دیکھا۔

☆☆

باقی آئندہ ماہ

افشین نعیم

یار دل دار

حیدر سیدھا ہاسپٹل پہنچا تھا۔

خالو کی حالت خطرے سے باہر تھی، انہیں وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ حیدر نے پہنچنے کے بعد سب سے پہلے امی، خالہ اور باقی کے۔ تمام رشتے داروں کو گھر بھیجا۔ حالانکہ خالہ رکنے پر بضد تھیں، پر......

حیدر نے بڑے اصرار سے سمجھا بجھا کر انہیں امی کے ساتھ ہی رخصت کر دیا۔ ماہی بھی رکنے پر بضد تھی۔ حیدر نے اس کو بھیجنے کے لیے اصرار تو دور کی بات، جھوٹے منہ بھی نہیں کہا کہ ماہی تم بھی چلی جاؤ۔

اب بھلا، صرف خالو کے ساتھ وہ ہاسپٹل رک کر کیا کرتا؟ رات کا آخری پہر شروع ہوا ہی چاہتا تھا۔ خالو سکون سے سو رہے تھے۔

حیدر ہسپتال کی کینٹین سے جا کر دو کپ چائے لے آیا۔ دونوں باہر برآمدے میں آ کر بیٹھ گئے۔

حیدر نے ایک کپ ماہی کو تھمایا، دوسرے سے خود دھیرے دھیرے گھونٹ بھرنے لگا۔

”شکر ہے۔ ابا کی طبیعت سنبھل گئی ورنہ میں اور امی تو گھبرا ہی گئی تھیں۔“ بات ماہی نے شروع کی۔ (شکر ہے، ان کی طبیعت بگڑ گئی تھی ورنہ میں اور میرے دوست بھی خاصے گھبرا گئے تھے)۔

”ہاں شکر ہے۔“ یہ شکر حیدر نے دل کی گہرائیوں سے کیا تھا۔

رات کا آخری پہر......

چائے کا گرما گرم کپ......

کچھ ہی فاصلے پر بیٹھی منکوحہ......

حیدر کو ایک دم ہی سب کچھ اچھا لگنے لگا، بے ساختہ ہی اظہار بھی کر گیا۔

”کتنا اچھا لگ رہا ہے نا......“

ماہی نے کچھ چونک کر آس پاس کے ماحول پر نگاہ ڈالی۔

دور، دور سفید یونی فارم میں نظر آتی نرسیں اور وارڈ بوائے۔ اکا دکا مریضوں کے لواحقین۔ ماحول میں بسی دوائیوں کی عجیب سی بو......

اس کو ہمیشہ سے ہاسپٹل کے ماحول سے نفرت تھی، وہ شدید بیماری میں بھی آخری حد تک ڈاکٹر کے پاس جانے سے گریز کرتی تھی۔

”کیا اچھا لگ رہا ہے تمہیں یہاں؟“ ناک چڑھا کر پوچھا۔ ناگواری انداز سے مترشح تھی۔

”ہاں، نہیں......“ ایک دم ہی گڑبڑا گیا۔ ”میرا مطلب تھا کہ کتنا اچھا لگ رہا ہے نا کہ خالو کی طبیعت بہتر ہوگئی ورنہ کس قدر پریشانی تھی۔“ فٹافٹ بات سنبھالی۔

ماہی نے سر ہلا کر چائے کا گھونٹ بھرا۔

”پتا ہے حیدر......“ ماہی نے حیدر کو دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”مجھے امی سے، امی کو ابا سے اور ابا کو تمہارے دوستوں سے پتا چلا کہ......“

”کہ...... میں ایک بہت امیر کبیر آدمی ہوں، میرا بہت شان دار سا فلیٹ ہے۔ بڑی سی گاڑی ہے وغیرہ وغیرہ۔“ حیدر نے درمیان سے ہی بات اچک لی۔

”یہی بات ہے نا؟“ اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

وہ نظر چرا گئی۔ ان آنکھوں میں دیکھنا آسان

UrduBooks.PK

UrduBooks.pk

نہیں تھا۔

''ہاں......'' یک لفظی جواب پر اکتفا کیا۔

''اور تمہیں یقین آ گیا ان سب باتوں کا؟''

''بالکل بھی نہیں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''یقین تو ابا کو بھی نہیں تھا، تب ہی تو آ رہے تھے تم سے ملنے۔ پر...... اچانک ہی طبیعت بگڑ گئی۔'' اس کا لہجہ افسردہ تھا۔

(اور کریں، میری جاسوسی)

''اللہ کا کرم......'' ابھی حیدر کے منہ سے نکلا ہی تھا کہ ماہی نے چونک کر اسے دیکھا۔

''اللہ کا کرم ہوا، جو سب ٹھیک ہو گیا۔'' جلدی سے بات مکمل کی۔ ماہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

(اوہوں، اتنی گرم چائے کے ساتھ، ایسی ٹھنڈی سانس کچھ میچ نہیں کر رہی)

''یار! میں نے اپنے دوستوں سے مدد مانگی تھی، اپنے اور تمہارے معاملے میں۔ ان مسخروں نے اللہ جانے کہاں کہاں کے جھوٹ گھڑ کے سنا دیے خالو جان کو۔ اب مجھے تو یہی فکر کھائے جا رہی ہے کہ جب پول کھلے گا تب ان کا کیا ردعمل ہو گا؟'' حیدر سچ مچ پریشان تھا۔

''چلو، پھر کم سے کم چھ ماہ کے لیے تو، تمہاری پریشانی ختم ہوئی۔'' ماہی قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''ڈاکٹرز نے چھ ماہ تک تو کسی بھی قسم کے سفر سے منع کر دیا ہے ابا کو۔''

حیدر نے دھیان سے اس کے موتی جیسے دانتوں کو دیکھا۔

اس کی ہنسی، یوں جیسے جیسے......
دور کوئی جھرنا بہہ رہا ہو۔

حیدر کے چاروں اور پھول کھلنے لگے

اور......

اس فسوں کو موٹی اور بھدی نرس کی کڑک دار آواز نے توڑا۔

''او بی بی! تم یہاں، اس مسٹنڈے کے ساتھ ٹھٹھے لگا رہی ہو، اندر تمہارا مریض پانی، پانی کر رہا ہے۔'' ماہی اٹھ کر اندر بھاگی۔ پھول، جھرنا، سب ماہی کے ساتھ ہی چلا گیا۔ پیچھے رہ گئی دوائیوں کی بو اور ہاسپٹل کا ماحول۔

☆☆☆

''کوئی قدر نہیں یہاں ٹیلنٹ کی، قابلیت بالکل بے کار چیز ہے۔ ڈگریاں...... بس ردی، کاغذ...... اس سے زیادہ کوئی اوقات نہیں ہے ان کی۔ نوکری اس کو ملے گی جس کے پاس خوب پیسہ ہے رشوت دینے کے لیے یا پھر، تگڑی سی سفارش ہے۔''

عادل غصے سے تمتماتا چہرہ لیے بول رہا تھا۔

محب اللہ، انس اور احسن تابع دار بیویوں کی طرح بیٹھے سن رہے تھے (بھڑاس کا نکل جانا بہتر ہوتا ہے)۔

وہ کافی دیر بولتا رہا۔ یہ تینوں خاموش اسے سنتے رہے۔

''میرا خیال تھا، بس ڈگری ملنے کی دیر ہے۔ یہاں ڈگری ہاتھ میں آئے گی......''

''وہاں نوکری سلام کرتی ہوئی دروازے پر آ جائے گی۔'' احسن نے کہتے ہوئے دانت نکالے (آخر کب تک خاموش رہتا؟)

عادل نے ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار کھینچ کر اسے مارا۔ جسے احسن نے چابک دستی سے کیچ کر لیا۔

''تین جگہ انٹرویو دیے گیا ہوں آج۔ تینوں جگہ انٹرویو کے نام پر محض خانہ پری ہو رہی تھی۔ صاف پتا لگ رہا تھا کہ بندہ پہلے سے منتخب ہے صرف فارمیلٹی پوری کی جا رہی ہے۔''

سخت طیش کے عالم میں بولتے ہوئے عادل نے ڈاکومنٹس کی فائل اٹھا کر پرے پھینکی۔ مایوسی، ناامیدی الفاظ کے ساتھ ساتھ انداز سے بھی واضح تھی۔ احسن نے جلدی سے فائل اٹھا کر سینے سے لگائی۔

''یار! تیرے تو ویسے ہی کسی کام کے نہیں ہیں یہ کاغذ۔ ایسا کر یہ مجھے دے دے۔'' کہہ کر چٹاچٹ فائل کے دو تین بوسے لے ڈالے۔

''خالی خولی کاغذ کیوں؟ یہ باقی کی چیزیں بھی لے۔''

جلدی سے پاؤں سے جوتا اتار کر احسن کا نشانہ لے کر کھینچ مارا۔ احسن بروقت جھکائی دے گیا، سو بچت ہو گئی۔ محب اللہ نے حالات خراب ہوتے دیکھے تو فوراً بیچ بچاؤ کی غرض سے آگے بڑھا۔ پانی کا گلاس بھر کر عادل کے ہاتھ میں تھمایا۔

''یہ لے اور دماغ ٹھنڈا رکھ ذرا۔'' ساتھ ہی نصیحت بھی داغ دی۔

''یار عادل! میرے باس آج ہی مجھ سے کہہ رہے تھے کہ کوئی دیانت دار اور قابل اعتبار آدمی ہو تو بتانا۔'' احسن نے مزے سے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''تو راضی ہو تو بات کروں؟''

''ہاں تو کرنا، انتظار کس بات کا کر رہا ہے؟'' عادل جوش سے اس کی طرف گھوما۔ ''کام کیا ہوگا؟ مطلب اکاؤنٹس یا مارکیٹنگ؟''

''نہیں نہیں، ایسا کوئی کام نہیں ہے۔'' احسن نے پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''بس باس کے آفس کی جھاڑ پونچھ، چائے پانی لا کر دینا، باتھ روم وغیرہ کی...... صا...... صفا...... صفائی۔''

بات ابھی منہ میں ہی تھی کہ بریک لگانا پڑ گئی۔

عادل نے پانی سے بھرا ہوا گلاس اس کے سر پر انڈیل دیا تھا۔

☆☆☆

UrduBooks.pk

انٹرویو کا وقت ختم ہونے میں محض پندرہ منٹ باقی تھے جب وہ اوکاپی اینڈ سنز کے آفس پہنچا۔

محب اللہ نے پند و نصائح کے ٹوکرے اس پر انڈیل کر، انس نے منت ترلے کر کے اور احسن نے تقریباً دھکے دے کر اسے اس انٹرویو پر آنے کے لیے راضی کیا تھا۔

وہ اتنا دل برداشتہ تھا کہ اس انٹرویو کے لیے قطعاً خود کو تیار نہیں کر پا رہا تھا۔

دوستوں کے اصرار پر وہ گھر سے نکل تو آیا تھا مگر...... راستے میں ہر ممکن کوشش کی تھی کہ وقت پر پہنچ نہ پائے۔

پہلے اسٹاپ پر تین بسیں یوں ہی گزار کر چوتھی میں سوار ہوا۔ پھر مطلوبہ اسٹاپ سے ایک اسٹاپ پہلے یوں ہی بس سے اتر گیا۔ جی نہ چاہنے کے باوجود چائے خرید کر پی۔

حالات حاضرہ سے دلچسپی نہ ہونے کے باوجود ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے پورا اخبار پڑھا، یہاں تک کہ کئی ضرورت رشتہ تک کے اشتہار پڑھ ڈالے۔

کتنا ہی وقت ریڑھیوں پر پھلوں اور سبزیوں کی قیمتیں پوچھ پوچھ کر ضائع کیا۔ کئی بار جی میں آئی کہ یہیں سے واپس گھر کو لوٹ جانا چاہیے پر......

دوستوں کی لعن طعن کے خیال نے ارادے پر بند باندھ دیے سو اپنی طرف سے بھرپور وقت ضائع کر کے جب وہ مطلوبہ مقام پر پہنچا تو انٹرویو کا وقت ختم ہونے میں ابھی بھی پندرہ منٹ باقی تھے۔

اس نے جی بھر کر اس بس والے کو کوسا جس نے اتنی تیز رفتاری سے بس چلائی۔

اس چائے والے کو بھی خوب لعنت ملامت کی جس نے اس کے مانگتے ہی چائے ہاتھ میں تھما دی۔

اور سب سے آخر میں اپنی عقل پر ماتم کیا......

کیا تھا جو گھر سے پیدل ہی چل پڑتا۔

پر اب پچھتائے کیا ہوت...... اب تو انٹرویو دینا ہی پڑے گا۔

تو ٹھیک ہے پھر...... ایسا انٹرویو دوں گا کہ انٹرویو لینے والے عرصے تک یاد کریں گے۔

اس نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا۔

☆☆☆

”یہ سیٹ بھی پہلے سے بکی ہوئی ہوگی۔ بندہ آل ریڈی سلیکٹ کیا جا چکا ہوگا۔ یہ تمام لوگ (مطلب انٹرویو پینل کے تمام حضرات) تابڑ توڑ سوالات کے ذریعے مجھے ڈی گریڈ کرنے (نیچا دکھانے) کی کوشش کریں گے۔

مجھے ان کے سوالات کے جواب نہیں دینے۔

میں سوال کے جواب میں، ان سے سوال کروں گا۔

ان تمام لوگوں کو اچھی طرح زچ کروں گا۔ یاد کریں گے کہ کوئی آیا تھا انٹرویو دینے۔“

عادل نے اچھی طرح یہ باتیں خود کو ذہن نشین کروائیں۔

ایک بار......

دوبار......

اور یہ تیسری بار تھی کہ اس کا نام پکارا گیا۔

”عادل جنجوعہ آپ ہیں؟“ نائب قاصد نے آ کر سوال کیا۔ عادل نے ویٹنگ روم کو یہاں سے وہاں تک دوبارہ دیکھا۔ (جہاں اس کے علاوہ کوئی ذی روح موجود نہیں تھا)۔

”نہیں، یہ جو باقی چالیس پچاس لوگ بیٹھے ہیں نا یہاں، ان میں سے کوئی ہوگا۔“

نائب قاصد نے دانتوں کی نمائش کی۔

”کیوں مخول کرتے ہیں صاب؟“

”شروع کس نے کیا تھا؟“ عادل نے گھور کر پوچھا۔

”آجائیں صاب، اندر۔“ بتیسی ہنوز باہر تھی۔

اس شاندار آفس میں قدم رکھتے ہی وہ اپنے آپ کو رٹوائے تمام اسباق بھولنے لگا۔

UrduBooks.pk

وہ، آج تک جتنی جگہوں پر بھی انٹرویو دینے گیا، ان میں سے کوئی ایک جگہ بھی اس کے پاسنگ بھی نہ تھی۔

دوسرا سرپرائز وہاں کوئی انٹرویو پینل موجود نہیں تھا۔

بڑی سی میز کے دوسری طرف انتہائی بارعب شخصیت کے مالک وہ صاحب آنکھوں پر باریک کمانی کی عینک لگائے اپنے سامنے پڑا کاغذ دیکھ رہے تھے جو غالباً انہیں یقیناً عادل کا سی وی تھا۔

عادل نے خود کو ان سے متاثر ہوتے محسوس کیا۔

فٹافٹ احساس کو جھٹکتے اس نے باآواز بلند السلام علیکم کہا۔ گویا خود کو یہ باور کرایا کہ وہ کسی رعب داب میں نہیں آنے والا۔ انہوں نے چونک کر سر اٹھا کر دیکھا۔

نووارد نے اندر آنے سے پہلے رسماً بھی ان سے اجازت طلب نہیں کی تھی۔

دوسرا جھٹکا انہیں تب لگا، جب وہ باآواز بلند انہیں سلام کرتا کرسی پر آرام دہ انداز میں بیٹھ گیا (گویا انٹرویو دینے نہیں مووی دیکھنے آیا ہو)۔

وہ ان کے اس طرح دیکھنے پر کچھ خائف ہوا۔ جلدی سے آفس کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

سر سے پیر تک مطلب پردوں سے لے کر قالین تک ہر چیز بہترین تھی۔ اس نے نظروں میں حقارت بھرنے کی کوشش کی۔ چہ افسوس...... ناکام رہا۔ جو تاثر آنکھوں سے چھلکا، وہ محض ستائش تھا۔

اردگرد کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد اس کی نظر، ان کی نظروں سے ٹکرائی۔ وہ انتہائی سنجیدگی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

عادل گڑبڑا گیا۔

''اگر آفس کا معائنہ ہو گیا ہو تو کام کی بات کر لیں؟''

''جی...... شیور۔'' اس نے تھوک نگلا۔

''تعلیمی ریکارڈ خاصا شاندار ہے آپ کا۔'' انہوں نے ایک نظر اپنے سامنے پڑے کاغذ پر ڈالی پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ ''یہ بات تو آپ کی سی وی کہہ رہی ہے۔''

انہوں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔

(سی وی کچھ نہیں بول سکتی، یہ تو آپ کہہ رہے ہیں۔ دل ہی دل میں جواب دینے پر گزارا کیا۔)

''اوریجنل ڈاکومنٹس تو ساتھ لائے ہوں گے آپ؟''

''جی......'' اس نے اپنی فائل ان کی طرف بڑھائی۔

انہوں نے ہاتھ بڑھا کر فائل تھام لی اور کھول کر اسناد الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ کافی دیر گزر گئی، عادل بے چین ہونے لگا۔

(بابا جی، اس میں سے کسی خزانے کا نقشہ وقشہ نہیں ملے گا آپ کو)۔

اب اس کے بعد یہ سوال کریں گے اور مجھے جواب میں ان سے سوال کرنا ہے، اس نے خود کو یاد دلایا۔

''ایف ایس سی میں کتنے مارکس تھے آپ کے؟'' انہوں نے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

''ہیں......؟'' سوال سن کر حیرت کے مارے عادل کا منہ کھل گیا۔

''مطلب، یہ اتنی دیر سے جو میرے سرٹیفکیٹس الٹ پلٹ رہے تھے، تو کیا واقعی خزانے کا نقشہ تلاش کر رہے تھے۔''

(اوہو۔ میں تو اب جواب میں یہ نہیں پوچھ سکتا کہ آپ بتائیں آپ کے کتنے مارکس تھے ایف ایس سی میں)۔ مطلب سیدھے سیدھے جواب ہی دینے پڑیں گے، نوکری ملے یا نہ ملے۔

''ترانوے فی صد۔''

”گریڈ کون سا تھا؟“
(میرا خیال ہے بابا جی پہلی مرتبہ انٹرویو لے رہے ہیں)۔
(سرکار، یہ کاغذ جو آپ نیچے سے اوپر، اوپر سے نیچے تک اتنی دیر پھرولتے رہے ہیں نا، اس پر سب لکھا ہوا ہے)۔
”اے ون۔“ متانت سے جواب دیا۔
”تاریخ پیدائش کیا ہے آپ کی؟“
انہوں نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔
(او بابا جی، اس کا انٹرویو اور نوکری سے کیا تعلق ہے؟)
”سولہ مئی انیس سو ترانوے۔“
انہوں نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔
(سجنو! نوکری کے لیے بلایا ہے یا بیٹی کا رشتہ دینا ہے؟)
”والد صاحب کا نام بتایئے؟“
”کس کے؟“ بے ساختہ ہی منہ سے پھسل گیا۔
”ظاہر ہے، آپ کے۔ اپنے والد صاحب کا نام تو میں آپ سے پوچھنے سے رہا۔“
”ابصار جنجوعہ۔“
اب کے فائل ٹیبل پر دھر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ عینک اتار کر ٹیبل پر رکھی، عقابی نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں یوں جیسے کچھ کھوج رہے ہوں۔
”عادل جنجوعہ!“ یوں پکارا گویا قید کی سزا سنانے والے ہوں۔
”جی۔“

”آپ کا تعلیمی ریکارڈ شروع سے آخر تک انتہائی شان دار ہے، مگر......“ انہوں نے کچھ توقف کیا۔ نظریں ہنوز اس کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔
”درمیان میں ایک جگہ تھوا لوز کر گئے تھے آپ، کیوں؟“
انہوں نے ایک ثانیے کو بھی نظر اس کے چہرے سے نہیں ہٹائی تھی۔

بیوٹی بکس کا تیار کردہ
سوہنی ہیئر آئل
SOHNI HAIR OIL

گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے۔
نئے بال اگاتا ہے۔
بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔
قیمت-/150 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہٰذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جا سکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف-/150 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آرڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- -/350 روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- -/500 روپے
6 بوتلوں کے لئے ---------- -/1000 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:
بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں
بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

"جی، بی ایس آنرز کے سیکنڈ سمسٹر میں کچھ مارکس لوز کیے تھے میں نے۔ میرے والد صاحب بہت بیمار تھے اور اسی سمسٹر بلکہ ان فیکٹ (درحقیقت) پیپرز شروع ہونے سے چند دن پہلے ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ میں پڑھائی کو زیادہ وقت نہیں دے پایا ان دنوں۔"

دل کچھ بھاری سا ہوا۔ حلق میں کوئی نمکین سا گولا آ کر اٹکا۔ انہوں نے ریوالونگ چیئر گھما کر سائڈ والی چھوٹی میز سے پانی کا گلاس بھر کر عادل کے سامنے رکھا۔

عادل نے گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا۔

"عادل! یہ انٹرویو نوکری مطلب جاب کے لیے نہیں تھا۔"

عادل کو زور کا اچھو لگا۔

(تو مطلب واقعی بیٹی کا رشتہ دینا ہے)۔

"یہ انٹرویو محض یہ چیک کرنے کے لیے تھا کہ آیا یہ اسناد واقعی آپ کی اپنی ہیں۔ سی وی پر لکھی معلومات درست ہیں یا نہیں۔ ڈگریوں کی اس سیریل میں کہیں کسی جعلی ڈگری کا پیوند تو نہیں لگا ہوا۔"

وہ حیرت سے ان کی بات سن رہا تھا۔

"میں سمجھا نہیں۔" عادل واقعی کچھ نہیں پا رہا تھا، سو اظہار بھی کر ڈالا۔

"میں سمجھاتا ہوں۔" وہ آگے کو ہوئے۔

"ہمارے ہاں بے ایمانی اور دو نمبر کام اس قدر عام ہو چکے ہیں کہ اب تو لوگوں نے ان پر شرمندہ بھی ہونا چھوڑ دیا ہے۔ لوگ دوسروں کی ڈگریاں لے کر اسکین کروا کر اس پر اپنا نام سجا لیتے ہیں۔ جعلی ڈگریاں ایسی بنواتے ہیں کہ آپ اصل اور نقل میں فرق نہ کر سکیں۔ پر جب اصل اسناد دکھانے کی باری آتی ہے تو آئیں بائیں شائیں کرتے ہیں۔ کچھ تو ایسے استاد ہوتے ہیں کہ جعلی ڈگری کی کلر فوٹو کاپی کروا کر پلاسٹک کوٹ کروا کر پیش کر دیتے ہیں۔

لوگوں سے کسی ڈگری، سرٹیفکیٹ کے نمبر پوچھ لو تو وہ نہیں بتا پاتے۔ تاریخ پیدائش تک میں غلطی کرتے ہیں۔ مضامین تک ٹھیک نہیں بتا پاتے۔ جھوٹ پھر جھوٹ ہی ہوتا ہے، کہیں نہ کہیں پکڑا ہی جاتا ہے۔" وہ مسکرائے۔

"آج صبح نو بجے سے میں بیٹھا لوگوں کے جھوٹ ہی پکڑ رہا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کامیاب قرار پائے ہیں، یہ تمام ڈاکومنٹس......" انہوں نے فائل اس کی جانب بڑھائی۔ "اصلی ہیں اور آپ کے اپنے ہیں۔ جتنا اچھا آپ کا تعلیمی ریکارڈ ہے مجھے امید ہے کہ آپ کا انٹرویو اس سے کہیں زیادہ اچھا ہوگا۔ آپ کے پاس ایک ہفتہ ہے، آپ انٹرویو کی تیاری کریجیے۔ باہر ریسپشن سے کچھ ضروری ڈیٹا وغیرہ آپ کو مل جائے گا، گو تجربہ آپ کے پاس بالکل بھی نہیں ہے مگر...... ہم لوگ قابل نئے لوگوں کو موقع دینے پر یقین رکھتے ہیں۔" وہ مسکرائے۔

"نائس میٹنگ ود یو (آپ سے ملاقات اچھی رہی)۔"

☆☆☆

"یعنی کہ مجھے واقعی اتنے بڑے فورم پر چانس ملنے جا رہا ہے۔" وہ سارا راستہ بے یقین رہا۔

اسے اس بس والے پر پیار آیا جس نے اسے جلدی پہنچایا۔ اس چائے والے کا منہ چوم لینے کو دل کیا جس نے فٹافٹ چائے تھما دی۔

اپنے آپ کو شاباش دی کہ شکر ہے گھر سے پیدل ہی نہیں نکل کھڑا ہوا۔ سب سے بڑھ کر اپنے دوستوں پر پیار آیا۔

وہ جو حوصلہ ٹوٹنے نہیں دیتے تھے، ہمت ہارنے نہیں دیتے۔ یار تھے، دل دار تھے۔ غم گسار تھے، غم خوار تھے۔

وہ خوش تھا، بے تحاشا خوش۔

ایک ہفتہ تھا تیاری کے لیے۔ اس ایک ہفتے میں جان لڑا دینی ہے، دل میں پکا ارادہ کر لیا۔

دوستوں کے لیے مٹھائی خریدتا ہوا گھر پہنچا۔

UrduBooks.pk

گھر میں اس وقت صرف حیدر موجود تھا۔

"جگر! کب واپس آیا؟" عادل نے مٹھائی کا ڈبا کھول کر اس کے سامنے کیا۔

"آدھا گھنٹہ ہوا ہے۔"

"لگتا ہے نوکری مل گئی۔" حیدر نے گلاب جامن نگلتے ہوئے کہا۔

"ملی نہیں ہے ابھی، پر کچھ کچھ امید بندھی ہے۔" اس نے برفی کھاتے ہوئے جواب دیا۔

"امید بندھنے پر مٹھائی، مطلب نوکری ملنے پر تو شان دار سا لنچ ہوگا نا؟"

"نوکری ملنے کی امید لگی ہے، کروڑوں کا پرائز بانڈ نہیں کھلنے لگا۔" تپ کر بولا تھا۔

حیدر اس کی شکل دیکھ کر محظوظ ہوا۔

"تو سنا..... کیا حال ہے خالو کا؟"

"دورہ تو بڑا شدید پڑا تھا، پر شکر ہے بچت ہوگئی۔ ٹھیک ہیں اب۔"

"چل پھر شکر کہ اپنے گھر میں دورہ پڑ گیا۔ ورنہ یہاں آ کر تیرا یہ لگژری فلیٹ دیکھ کر جو دورہ پڑنا تھا نا بے چاروں نے جان سے گزر جانا تھا۔"

"تم دوستوں کی مہربانی ہے ساری، جھوٹ بول کر مجھے پھنسا دیا۔"

"احسان فراموش آدمی! ہماری وجہ سے تیرا نکاح ہوگیا ورنہ آج سے چار، پانچ سال بعد ہماری بھابھی تیری طرف اشارے کر کر کے اپنے بچوں کو بتا رہی ہوتیں۔ ببلو بیٹا، پنکی بیٹی یہ ہیں آپ کے حیدر ماموں، سلام کرو ماموں کو۔"

حیدر نے آس پاس نگاہ دوڑانی شروع کی تاکہ کوئی چیز اٹھا کر عادل کا سر کھول دے۔

"یار حیدر! تو بھی نا بڑا بے وقوف انسان ہے۔ ہاسپٹل میں موقع پا کر خالو کو ساری حقیقت بتا کر لگے ہاتھوں معافی مانگ لیتا۔"

"خالو کا صدمے سے دل بند ہوتا اور یہ راز ان کے ساتھ ہی منوں مٹی تلے جا سوتا۔" اپنی دانست میں عادل نے انتہائی معقول بات کہی۔

"یہ مشورے تو اپنے ہونے والے سسر کے لیے سنبھال کر رکھ۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ فوراً ہی مان گیا۔

رات میں وہ سارے اکٹھے عادل کی خوشی سلیبریٹ کر رہے تھے۔

انس جا کر تکے اور نان لے کر آیا۔

کولڈ ڈرنکس حیدر نے منگوائیں۔

"یار! مجھے بتا میں تیری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" احسن نے عادل سے پوچھا، کیوں کہ کھانا تو انس اور حیدر نے ارینج کر دیا تھا۔

"یار! ایسا کر میری ٹانگیں دبا دے۔" جھٹ سے خدمت کا موقع دیا۔

"میں سیدھا تیرا گلا دباؤں گا۔"

عادل کا ہاتھ فوراً اپنے گلے تک پہنچا۔

"نہیں رہنے دے، تو بڑا ہے تجھ سے خدمت کروا کر کیا کروں گا۔"

"چل لا لے، ایسا ہے کہ تیرے حصے کے برتن رات میں دھو دوں گا۔"

"تو عظیم ہے احسن!" فرط جذبات سے عادل کی آواز رندھ گئی۔ اتنی بڑی خدمت کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

"بس پھر آخر میں ایک ہی چیز میرے حصے میں آتی ہے۔" کافی دیر سے خاموش بیٹھا محب اللہ بولا۔

سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"آئس کریم۔"

"نہیں......" عادل نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر ایک زوردار چیخ ماری۔

ان سب کا ایک مشترکہ قہقہہ بلند ہوا۔

زندگی سے بھرپور قہقہہ۔

UrduBooks.PK

عندلیب زہرا

بدلے الجھے رشتے

شمع اپنے گھر کی بڑی سیانی بیٹی تھی۔ بچپن سے وہ اپنی چیزیں سنبھال کر رکھتی تھی۔ کپڑے، جوتے، بستہ، کھلونے، گڑیا۔

سمجھ داری سے بات کرتی۔ ماں باپ کی بات پر کان دھرتی۔ امی ابو کی غیر موجودگی میں بہن بھائیوں کا خیال رکھتی اور یوں اس کی سمجھ داری کے بھروسے پر سارا گھر چلنے لگا۔

اماں ابا بھی اسی پر بھروسا کرنے لگے۔ اماں کو بھی اپنی عقل مند سیانی بیٹی کی سمجھ بوجھ پر یقین تھا۔ کس بہن بھائی نے کیا پڑھنا ہے؟ کس نے کیا کھانا ہے؟ کیا پہننا ہے؟ خاندان میں لین دین کیسے کرنا ہے، کس کو مدعو کرنا ہے کس کو زبانی کلامی پیغام دینا ہے۔ سب شمع کے مشورے سے طے کیا جاتا تھا۔ اماں ابا کو اس نے تمام فکروں سے آزاد کر دیا۔ سو ان کے لبوں پر بھی ہر وقت دعائیں ہوتیں۔

شمع میں احساس ذمہ داری کے ساتھ ساتھ، احساس ملکیت بھی آ گیا۔ حکومت کا نشہ۔ انا پرستی اور خود پسندی۔ سو اپنے آگے کسی کو دیکھنا گوارہ نہ کرتی لیکن یہ منفی خیالات اس نے تابع داری اور فرماں برداری میں چھپا رکھے تھے۔ کم آمیزی کے پردے میں، متانت کے ساتھ، لیکن کسی کی زیرک نگاہ میں یہ بات عیاں تھی۔

شمع کا رشتہ شروع سے خالہ کے گھر طے تھا۔

بچپن سے آنا جانا تھا۔ سو سارا ماحول مزاج، عادات سب کچھ اس کے سامنے تھا۔ خالہ کافی امیر لاپرواہ اور ہنسوڑ تھیں۔ بچے بھی بے فکرے ہنس مکھ۔ بلال لاابالی اور من موجی سا تھا۔ وہ جب جاتی، خالہ کے گھر کا چپ چاپ جائزہ لیتی رہتی۔ مزاج واطوار کا، کھانے پینے کی عادات...... دل ہی دل میں پلاننگ کرتی کہ کس طرح یہاں اپنا ہولڈ قائم رکھنا ہے۔ بلال کو قابو کرنا ہے۔ تاہم یہ ارادے دل میں مقید تھے۔

"اماں! مجھے اپنی سسرال میں بڑی محنت کرنی ہو گی۔ ہر چیز بے ترتیب اور پھوہڑ پن کا آئینہ ہے۔" وہ اکثر تدبر سے کہتی۔

"میری حساس اور سیانی بچی۔!" اماں اس کے ذمہ دارانہ رویے پر صدقے واری جاتیں۔

سب کہتے شمع خوش نصیب ہے۔ خالہ کے گھر جا رہی ہے اور خالہ بھی وہ جو خوش مزاج اور من موجی ہے۔ نہ روایتی سسرال نہ دیور نند کا جھگڑا۔" شمع اترا کر رہ جاتی۔

☆☆☆

اس نے شادی کی تیاریوں میں اپنا کنٹرول رکھا۔ کون سی چیز کہاں سے خریدنی ہے؟ کس کو مدعو کرنا ہے؟ حتیٰ کہ کھانے کا مینیو بھی خود ترتیب دیا۔ مہندی کے فنکشن کے اختتام پر اس نے اپنی نگرانی میں گھر کی بتیاں بند کروائیں۔ بارات والے دن پارلر جانے سے قبل کچن کا دروازہ لاک کروایا کہ گھر والوں کے ہال میں جانے کے بعد ملازم آزادانہ نہ پھر سکیں۔

"بس کر بیٹی۔ آج تو آرام کر لے۔" تائی نے پیار سے کہا۔

"پتا نہیں میرے بعد گھر کیسے چلے گا۔" اس نے فکر مندی سے سوچا اور پارلر کے لیے روانہ ہو گئی۔

اسٹیج پر وہ روایتی دلہن بن کر بھی روایتی نہیں تھی۔

اس نے لن انکھیوں سے سب کچھ نظر میں رکھا تھا۔ بلال بہت مطمئن انداز میں سب کے فقرے انجوائے کر رہا تھا۔ تاہم لاپروا سی خالہ آج کچھ سنجیدہ اور خاموش سی تھیں۔ یہ بات شمع نے ایک دم محسوس کر لی تھی۔

رسموں کے بعد اسے بیڈ روم میں پہنچایا گیا۔ خالہ، بلال سے کچھ کھسر پھسر کرتی رہیں۔ اس نے کان لگائے لیکن سننے سے قاصر رہی۔ بلال اندر آیا تو

UrduBooks.pk

وہ قدرے سنجیدہ اور بارعب سا لگا۔
''شمع......'' اس نے پکارا۔
''جی......'' وہ ہمہ تن گوش تھی۔
''امی بڑی ہیں۔ ہر کام ان کی مرضی سے ہوتے آئے ہیں۔ تم نے بھی ہمیشہ ان کی ہر بات مانی ہے......میری خوشی، ان کی خوشی میں پوشیدہ ہے۔'' شمع قدرے حیرت اور بوریت سے سن رہی تھی۔
''تم اپنی سلامی امی کو دے دو۔'' بلال نے حکمیہ انداز میں کہا۔ گویا بلی تھیلے سے نکالی۔
''جی!'' اس نے سوالیہ انداز میں نظریں اٹھائیں۔
''جی......'' بلال نے قطعیت سے کہا۔
یوں شمع کی نئی زندگی کا آغاز بدمزگی سے ہوا۔ شمع کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے؟
اسے لگتا اس کی شادی کسی اجنبی خاندان میں ہوئی ہے۔ جن کے مزاج، عادات، رویوں سے وہ یکسر انجان تھی۔ ہنس مکھ بلال اب سنجیدگی کے لبادے میں لپٹا رہتا تھا۔ کزنز اب دیور اور نند تھے۔ جو صرف کام کی بات کرتے۔ خالہ کم گو ہو گئی تھیں۔ سارا انتظام ان کے ہاتھ میں تھا۔ خالو البتہ اپنے آپ میں مگن تھے۔
اس نے سوچا کہ ٹی وی لاؤنج کی ترتیب بدل دے۔ کرسیاں، دیوار کے ساتھ لگا دیں۔ قالین درمیان میں بچھایا۔ ابھی وہ اس کارروائی میں مصروف تھی کہ خالہ نے آکر جائزہ لیا اور بارعب انداز میں ہانیہ کو کہا کہ ترتیب پہلے جیسی کر دے۔ اس نے کھانا پکانا چاہا تو خالہ نے کہا۔
''سب کو ان کے ہاتھ کا ذائقہ پسند ہے۔'' جو بات کرتی صرف اس کا جواب ملتا۔ جو حکم دیا جاتا وہ بجا لاتی۔ قدم قدم پر اسے رد کیا جاتا۔
ماں باپ کے گھر کی سیانی شمع......بے وقوفوں کی طرح سر ہلا کر رہ جاتی۔ پھر ایک دن ماں کی گود میں سر رکھ کر خوب روئی۔
اماں بھی افسردہ ہو گئیں، بہن سے دل الگ خراب ہوا۔ ابا بھی ملول دکھائی دیے۔
''میں تو جنگلی ہو گئی اماں جسے انڈا توڑنا بھی نہیں آتا۔'' اس نے آنسوؤں میں بتایا۔
''آپا ایسی تو نہ تھیں۔'' ابا بہت حیران تھے۔
بالآخر کار خالہ کے رویے کے بدلاؤ کا معمہ بھی کھل ہی گیا۔
اتوار کو وہ بخار کے باعث سو رہی تھی۔ آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی اور گھر میں سناٹا تھا۔ وہ باہر آئی تو خالہ کے بیڈروم سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔
''میں تو شروع دن سے ہی اسے سمجھ گئی تھی۔ کیسے میکے میں ہر چیز اپنے قبضے میں رکھتی تھی۔ میری سیدھی سادی بہن کو دیوار سے لگا رکھا تھا۔'' خالہ کی آواز اسے بہت اجنبی لگی تھی۔
''آپ تو اس کو سمجھ دار اور سیانی بیٹی کہتی تھیں۔''
چھوٹا دیور شرجیل یاد دلا رہا تھا۔
''رشتہ بھی آپ نے خود مانگا تھا۔'' ہانیہ نے بھی حصہ لیا۔ بلال نے بھی تائید میں سر ہلایا۔
''ہاں نا......باہر سے لڑکی لاتی تو اس کے مزاج اور عادات کا اندازہ نہ ہوتا۔ اسے حکومت کرنے کی عادت تھی۔ اپنی من مانی کی سو میں نے شروع دن سے لگامیں کس لیں۔''
ہنسوڑ اور لاپروا سی خالہ بہت گھاگ اور زمانہ ساز لگ رہی تھیں۔
''سر نہ اٹھانے دے اسے۔ ورنہ حکومت کرے گی تیرے پہ۔ دبا کر رکھ......بولنے نہ دے۔'' اب بلال کو ہدایات دی جا رہی تھیں شمع نے لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لیا۔ اسے چکر آرہے تھے۔ اس کی سمجھ میں آچکا تھا کہ نہ خالہ بدلی تھیں نہ بھانجی۔ رشتہ اور اس کی نوعیت بدل چکی تھی۔
وقت اپنی بساط الٹ چکا تھا۔ اپنے گھر کی سیانی شمع......سسرال میں بے وقوف اور دبو بہو بن چکی تھی۔ جسے اب کان لپیٹ کر رہنا تھا۔ ☆

UrduBooks.pk

Monthly Shuaa October 2018

عاصمہ فرحین

شہلا شکور اور شکوے

"یہ پیچھے کرو، دیکھو، یہ والی پک...... یہ میکسی مجھے شاہ رخ نے میری برتھ ڈے پر لا کر دی تھی۔"

"شہلا تمہیں کیا بتاؤں......؟ کتنا مزا آ رہا تھا نا...... ہم نے اتنا انجوائے کیا، بتا نہیں سکتی۔ اس نے جس طرح سے میری برتھ ڈے سیلیبریٹ کی میں سچ مچ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ نیلم اتنی کھوئی ہوئی آواز میں بول رہی تھی کہ شہلا کو لگا کہ کہیں وہ واقعی میں نہ اڑ جائے۔

"مجھے معلوم ہے کہ تمہارا دل جل رہا ہوگا۔ شاہ رخ صرف میرا کزن ہے...... تو میرے لیے اتنا کچھ کرتا ہے۔ مگر شکور بھائی۔ ظاہر ہے تمہارے ایسے نخرے اٹھانے سے تو رہے۔ ویسے ان کا نام اتنا

ناولٹ

پرانا۔ یہ تو ٹھیک ہے مگر ان کے تو کام بھی اٹھارہویں صدی والے ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ تمہارے فیانسی ہیں۔" اب کی بار نیلم نے طنزیہ انداز میں بات کرتے ہوئے اس طرح ہاتھ ہلایا جیسے ناک پر سے مکھی اڑا رہی ہو۔

"نہیں نہیں! ایسی بات نہیں ہے...... تائی میرے لیے برتھ ڈے پر کیک اور گفٹ لائی تھیں اور ہم نے گھر پر سیلیبریٹ بھی کی تھی۔" شہلا سنبھل کر بولی۔

"تم ہی ہوتی ہو گی ایسی سیلیبریشن سے خوش...... اچھا...... اب میں چلتی ہوں۔" نیلم نے چائے کا کپ ٹرے پر رکھتے ہوئے کہا۔ اور فوراً ہی بیڈ سے اتر گئی۔ مگر اپنے جانے کے بعد شہلا کو سوچنے کے لیے بہت ساری باتیں دے گئی۔

☆☆☆

شکور بیگ کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ شہداد بیگ، شہید بیگ اور شائستہ بیگ۔

شہداد بیگ اور شہید بیگ دونوں کی شادیاں ماموں زاد کزنز تہمینہ اور فہمیدہ سے ہوئی تھیں جو کہ سگی بہنیں بھی تھیں۔ جب کہ شائستہ بیگ جو دونوں بھائیوں سے بڑی تھیں۔ اپنے پھپھو زاد ریحان بیگ کے ساتھ رخصت ہو کر دبئی شفٹ ہو گئی تھیں۔ گزرتے برسوں میں آمنہ، فہد اور حرا کی آمد نے ان کی ذمے داریوں میں اضافہ کیا تھا۔

شہداد بیگ اور شہید بیگ کی شادی ان کی شادی کے دو سال بعد ہوئی تھی۔ شہداد بیگ کے بچوں میں شکور، شہلا اور شہزاد تھے۔ جبکہ شہید بیگ

UrduBooks.pk

کے بھی تین ہی بچے تھے۔ شہلا، شایان اور شمائل۔

شہلا...... شہنیلا کی ہم عمر اور شکور سے چار سال چھوٹی تھی۔ شکور کی چچا زاد اور خالہ زاد ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی منگنی بچپن میں ہی شکور سے ہو چکی تھی۔ جب اس نے ایف ایس سی امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ تو باقاعدہ طور پر رسم بھی ادا کر دی گئی تھی۔ منگنی کرنے سے پہلے اس سے رسمی طور پر پوچھا بھی گیا تھا۔ اور اس نے اپنے والدین کی رضا کے آگے سر جھکا دیا تھا۔

☆☆☆

''شہلا! چھت پر سے کپڑے لے آؤ، ورنہ رنگ اڑ جائے گا۔ دھوپ بہت تیز ہے۔ پھر آ کر کام کر لینا......'' فہمیدہ نے اسے جرنل میں سر دیئے دیکھا۔ تو بولیں۔ اور یہ کہہ کر اپنے کمرے میں آرام کی غرض سے چلی گئیں۔

''ایک تو امی بھی نا!'' اس نے جرنل پٹخا...... کل اسے یہ جرنل لیب انچارج کو دینا تھا۔ چھت پر دھوپ کافی روشن تھی۔ اس نے کپڑے سمیٹنے شروع کر دیئے۔ کہ اچانک ایک پتھر آ کر اسے لگا۔ وہ چونک گئی۔

ان کے بائیں جانب نیلم کا گھر تھا اور دائیں جانب کی پوری عمارت کرائے پر تھی۔ نیچے والے پورشن میں فیملیز رہتی تھیں اور اوپر والے پورشن کے دو کمرے دوسرے شہروں سے روزگار کی تلاش میں آئے ہوئے نوجوانوں کے پاس تھے۔ جنہیں عرف عام چھڑے چھانٹ کہا جاتا تھا۔ باقی تفصیلات نہ تو اسے معلوم تھیں، اور نہ ہی اسے جاننے کا شوق تھا۔

ان تینوں عمارتوں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ اور یہ پتھر اسی گھر سے آیا تھا۔ وہ متجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ پھر نیچے جھک گئی۔ اس پتھر کو اٹھانے کے لیے۔ اس پتھر پر کاغذ لپٹا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پتھر اٹھاتی۔

''کیا کر رہی ہو؟ ادھر......'' یہ شکور کی کڑکتی ہوئی آواز تھی۔ چھت پر ایک چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا۔ جہاں شکور نے...... اس کے خیال میں...... الیکٹرانکس کا کباڑ اجمع کر رکھا تھا۔ یہ صرف اسی کا ہی خیال تھا۔ وگرنہ وہ شکور کے لیے تجربہ گاہ تھی۔

''مم...... میں...... کچھ نہیں...... کپڑے لینے آئی تھی۔'' وہ بڑبڑائی۔

''لے لیے......؟'' وہی ناک پر غصہ......

''جی'' ...... وہ منمنائی۔

''اب جاؤ''، شکور نے اسے ہاتھ سے نیچے جانے کا اشارہ کیا۔ اور وہ فوراً بھاگتی ہوئی نیچے اس طرح آئی کہ سانس بھی اپنے کمرے میں جا کر لیا تھا۔

☆☆☆

''کس سے ملنا ہے......؟'' دروازہ شہزاد نے کھولا۔ وہ کافی غصے میں لگ رہا تھا۔ اس کی پلکیں کچی نیند کی وجہ سے نیم وا تھیں۔

''شہلا سے''، سامنے نیلم تھی۔ جو بڑی ٹیپ ٹاپ سے تیار ہو کر آئی تھی۔ یہ سن کر شہزاد کی نیم وا آنکھیں پوری کھل گئی تھیں۔

''وہ امی اور آپا کے ساتھ مارکیٹ گئی ہیں۔'' اب کی بار وہ ناگواری سے بولا۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو...... میں نے اپنی گناہ گار آنکھوں سے تہمینہ آنٹی اور شہنیلا کو اکیلے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور ویسے بھی مجھے اسے کچھ شرٹس کے ڈیزائن دکھانے ہیں۔ جو کہ شہلا نے ہی منگوائے تھے۔ سوچ لو...... شہلا کو...... اگر میں نے کچھ بھی تمہارے بارے میں کہہ دیا تو تمہاری خیر نہیں ہے۔'' وہ اترا اترا کر بول رہی تھی۔

اور شہزاد نے کچھ توقف کے بعد سوچ کر راستہ دے دیا۔ پھر موبائل نکال کر شہنیلا کو میسج کرنے لگا۔

''آنٹی! السلام علیکم......'' سیڑھیاں چڑھ کر جب نیلم اوپر پہنچی تو فہمیدہ اپنے تخت پر بیٹھی سلائی کر رہی تھیں۔

''شہلا کہاں ہے؟'' وہ متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

UrduBooks.pk

''سو رہی ہے......'' فہمیدہ نے بڑی اطمینان سے جواب دیا۔

''اوہ! اسے کچھ ڈیزائن دکھانے کے لیے لائی تھی۔ اگر آپ اٹھا دیتیں تو......'' نیلم تھوڑا اونچا بولی تھی۔

''تھوڑا ہلکے بولو...... ابھی کالج سے آئی ہے۔ شام کو بچے جب ٹیوشن پڑھنے آئیں گے۔ تب اٹھے گی۔ اپنے ڈیزائن رہنے دو۔ شہیلا اور شہلا ہماری مرضی کے کپڑے پہنتی ہیں۔'' وہ بھی نروٹھے انداز میں بولی تھیں۔

ان کا موڈ دیکھ کر اس نے اٹھنے میں ہی عافیت جانی۔ سہج سہج کر چلتی ہوئی وہ سیڑھیوں کے پاس کھڑی ہوگئی تھی۔ اتنے میں شکور اوپر سے اترتا ہوا آیا۔ فوراً ہی اسے دیکھ کر رک گیا۔ ورنہ اس سے ٹکر لازمی ہوتا تھی۔

چست دیدہ زیب لباس، شوخ میک اپ اور پٹی جیسا دوپٹا گلے میں لٹکائے وہ کوئی ماڈل نظر آرہی تھی۔

''اسلام وعلیکم! شکور بھائی۔'' اس نے خوشی سے سلام کیا۔

جبکہ شکور نے بغیر رکے ہی اسے جواب دے کر نیچے اترنے میں ہی عافیت جانی فہمیدہ نے یہ منظر بہت ناگواری سے دیکھا تھا۔

☆☆☆

کالج کے کیفے میں شہلا اس وقت اپنے گروپ کے ساتھ موجود تھی۔ آج ٹریٹ رمشا کی طرف سے تھی۔ کیونکہ گزشتہ ہفتے ہی اس کی منگنی ہوئی تھی۔ ویٹر سب کی پسند کے آرڈر سرو کررہا تھا۔

''رمشا! تمہاری منگنی پر بڑا مزہ آیا۔'' طوبیٰ کھلکھلائی تھی۔

''اپنی انگوٹھی دکھاؤ...... شہلا کو...... وہ نہیں آئی تھی نا......'' آئمہ نے رمشا کو کہا۔

خوب صورت ڈائمنڈ سے مزین رنگ رمشا کے ہاتھوں میں جھلملا رہی تھی۔

''بہت پیاری ہے۔'' اس نے کھلے دل سے سراہا تھا۔

''شہلا! تمہاری رنگ کہاں ہے؟ وہ بھی بہت پیاری تھی۔'' رمشا نے اس سے استفسار کیا۔

''تمہیں معلوم تو ہے...... کہ مجھے جیولری پہننا پسند نہیں۔ اس لیے رکھ دی ہے۔'' وہ رسانیت سے بولی تھی۔

''پہنا کرو بابا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکی منگنی شدہ ہے۔'' نائمہ نے اس کا کان پکڑ کر کھینچا ــ سب ہنسنے لگے جبکہ شہلا صرف مسکرائی تھی۔

کالج سے واپسی پر اس کا موڈ بہت خراب تھا۔ کپڑے بدل کر بستر پر لیٹ گئی۔ فہمیدہ کے لاکھ پوچھنے پر بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ فہمیدہ یہ سمجھیں کہ شاید پڑھائی کا زور زیادہ ہے۔ اس لیے دوبارہ اپنے کاموں میں مصروف ہوگئی تھیں۔

شام کو جب اس کی آنکھ کھلی تو سات بجاتی گھڑی کو دیکھ کر فوراً باہر نکلی۔ اس کے ٹیوشن کے بچے......؟

باہر آئی...... تو شہیلا اور شہزاد کو بچوں میں سر کھپاتا دیکھ کر سکون کا سانس لیا تھا۔

''آگئیں...... شہزادی صاحبہ! ایک ہم ہیں۔ جنہیں کالج سے آکر اوپر بھیج دیا گیا کہ جا کر بچوں کو پڑھاؤ ورنہ شہلا کی نیند خراب ہوجائے گی۔'' شہیلا منہ پھلا کر بولی تھی۔

اور شہلا نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔

''تم تو میری پیاری بہن ہونا۔'' شہیلا ہنس دی تھی۔

''ایسے کام نہیں چلے گا شہلا آپی کوئی چائے شائے پلائیں تو ہم نیچے جائیں۔'' شہزاد مچل گیا۔ وہ فرسٹ ایئر میں تھا۔

''تمہیں پھینکنے کے لیے تو میرے دو ہاتھ کافی ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''اور دو میرے بھی۔'' شمائل نے لقمہ دیا تھا تو ایٹھ کلاس میں مگر شہزاد سے جیسے اس کا یارانہ تھا۔

UrduBooks.pk

اور سب ہنس دیے۔ فہمیدہ نیچے تھیں۔ انہوں نے ہی شہنیلا کو اوپر بھیجا تھا۔

شہزاد اور شمائل آمنے سامنے بیٹھے فرائز اور خستہ پاپڑوں سے ہاتھ صاف کر رہے تھے۔ جبکہ کچن میں موجود شہلا کپوں میں چائے نکالتے ہوئے اسے رمشا کی منگنی کے بارے میں بتانے لگی۔

اس کی آواز اور اس کا جوش وخروش اتنا تھا کہ اوپر سے آتا ہوا شکور ٹھٹک گیا تھا بہت دنوں بعد اس نے اس کی...... اس طرح کھلکھلاتی ہوئی آواز سنی تھی۔

''تمہاری رنگ کہاں ہے؟''

''رکھی ہوئی ہے......'' اس نے لاپروائی سے کہا۔ جبکہ اس کی بات پر شکور کا چہرہ بجھ سا گیا تھا۔

''اے لڑکی! ہم نے وہ رنگ تمہیں پہننے کے لیے دی تھی۔ رکھنے کے لیے نہیں۔ تم بھی لوگوں پر رعب جمایا کرو......'' شہنیلا اس سے خفا ہوئی تھی۔

''کیا رعب جماؤں...... میری منگنی بہت سادگی سے ہوئی تھی۔ بھلا اس بات میں لوگوں کے لئے کیا انٹرسٹ ہوگا۔'' وہ شانے اچکا کر سادگی سے بولی۔

اب وہ دونوں ریلنگ کے سہارے باتیں کر رہی تھیں۔ چائے کے مگ ان کے ہاتھوں میں تھے۔

''شکور بھائی! آپ کہاں جا رہے ہیں؟ آیئے ہمارے ساتھ چائے انجوائے کیجیے۔'' شہزاد نے آواز لگائی۔

جبکہ وہ کوئی جواب دیے بغیر جیبوں میں ہاتھ ڈالے نیچے اترتا چلا گیا۔ اور شہلا...... شہنیلا سے کہتی رک گئی تھی کہ تمہارا بھائی اتنا سڑیل کیوں ہے؟

☆☆☆

یہ ایک سیدھا سادا گھرانا تھا۔ جہاں رشتے داری اور تعلقات کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس لیے مزید استحکام پیدا کرنے کے لیے شہلا اور شکور کی منگنی کر دی گئی تھی۔

شکور کا صرف نام ہی پرانا تھا۔ مگر وہ اس وقت این ای ڈی سے الیکٹریکل انجینئرنگ کر رہا تھا۔ یہ اس کا آخری سال تھا۔ اپنے پراجیکٹ کی تیاری کے لیے وہ زیادہ تر وقت اوپر چھت والے کمرے میں گزارتا۔ جو شہلا کے نزدیک کباڑ ہاؤس تھا۔

اس گھرانے کے لوگ زیادہ دکھاوے کے قائل نہیں تھے۔ اس لیے ایک چھوٹی سی تقریب میں ان دونوں کو رنگ پہنادی گئی تھی۔

اس کے بعد بھی شہلا کی زندگی میں کوئی چارم نہیں آسکا تھا۔ شکور سنجیدہ مزاج پہلے بھی تھا۔ مگر اب اس سے مزید کترانے لگا۔ شروع شروع میں وہ تھوڑی خوش تھی۔ مگر جب اس کی ہم عمر لڑکیوں نے اس کے منہ سے شکور کا نام سنا۔ تو ہنس دیں۔

''یہ بھی بھلا کوئی نام ہوا۔ انیسویں صدی کا ہے۔ میرے دادا کا نام بھی شکور تھا۔''

اس طرح کی باتیں سن کر وہ دل مسوس کر رہ جاتی تھی۔

اس کی انگیجمنٹ رنگ بھی بہت پیاری تھی۔ مگر اس نے حفاظت کی غرض سے وہ بھی ڈبے میں بند کر کے رکھ دی تھی۔

''تمہیں عیدی پر کیا ملا......؟ تمہارے لیے کیا گفٹ آیا؟''

''ارے میری عیدی پر تو پورا خاندان جمع تھا...... سات کھانے بنائے تھے۔''

اب وہ کیا بولتی؟ کہ اس کی تائی امی نے بھی اسے اس کی مرضی کی شاپنگ اس کی پسندیدہ جگہ سے کروادی ہے۔ مگر گھر کے ماحول کی وجہ سے وہ بے تکا بولنے سے عاری تھی۔ اس وجہ سے وہ زیادہ وقت چپ رہنے لگی۔

اس کے علاوہ اس کے ساتھ FSC کرنے والی شہنیلا اب ہومیو پیتھک کالج جاتی تھی۔ اس لیے اسے جان سے زیادہ عزیز شہنیلا جو کیلی اور کزن کم بہن زیادہ تھی۔ اس کی مصروفیات اور سرگرمیاں تھوڑی مختلف ہوگئی تھیں۔ جبکہ وہ بھی بی ایس سی کر رہی تھی۔

UrduBooks.pk

ان دونوں کی علیحدہ مصروفیات کا فائدہ نیلم نے اٹھایا تھا۔ شوخ وچنچل نیلم نے بھی ان کے ساتھ ایف ایس سی کیا تھا۔ مگر دو پرچوں میں رہنے کی وجہ سے اب دوبارہ پیپرز دے رہی تھی۔ اس کا مشغلہ نت نئے ڈیزائن کے کپڑے پہن کر موبائل کا زیادہ سے زیادہ استعمال اور گھومنا پھرنا شامل تھا۔

کوئی بھی نئی بات ہوتی۔ مرچ مسالا لگا کر شہلا کے کانوں میں انڈیل دیتی اور شہلا کو اس کی ساری باتیں بہت پسند آتی تھیں۔

☆☆☆

آج نچلے پورشن میں بہت رونق تھی۔ اور کیوں نہ ہوتی شہداد بیگ اور شہید بیگ کی بہن شائستہ اپنے خاندان کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔

آمنہ فہد اور حرا تینوں ہی خوش مزاج تھے۔

شائستہ...... آمنہ کی شادی کرنے کے لیے پاکستان آئی تھیں۔ اور شادی کی تیاری کے لیے عارضی طور پر ایک گھر کرائے پر بھی لے لیا تھا۔ آج ان کی دعوت تھی۔

شہلا کچن میں شہنیلا کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ نیلم بھی بن بلائے مہمان کی طرح آگئی۔ آج اسے دیکھ کر کسی نے بھی تیوری نہیں چڑھائی تھی۔ اور شہلا کی تو وہ بہت اچھی دوست تھی سو ان دونوں لڑکیوں نے بھی اسے اپنے ساتھ کاموں میں لگالیا۔

بیف پلاؤ، وائٹ چکن، فرائیڈ فش، چپلی کباب، کھیر کسٹرڈ دو تین طرح کے سلاد، چٹنیاں اور رائتے اس گھر کے مکینوں کی خوش خوراکی کو نمایاں کر رہے تھے۔

ہال کمرے میں ایک طرف گھر کے بڑے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ جبکہ آمنہ اور فہد کو شہزاد اور شمائل نے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ شکور اور حرا بھی آمنے سامنے بیٹھے کچھ ڈسکس کر رہے تھے۔

شہنیلا کچن میں تھی۔ شہلا اور نیلم ٹیبل سیٹ کر رہی تھیں شکور اور حرا کو دیکھ کر نیلم نے شہلا کو ایک کہنی مار کر ان کی طرف اشارہ کیا تھا۔

الف لیلہ
ہزار داستانیں

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنھیں پڑھ کر بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں جنھیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں
-/300 روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں
فی کتاب -/1200 روپے
ڈسکاؤنٹ -/300 روپے
آج ہی -/950 روپے
منی آڈر ارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

شہلا یہ منظر دیکھ چکی تھی۔ تب ہی لاپرواہی دکھاتی ہوئی واپس کچن میں چلی گئی تھی۔ جبکہ نیلم نے منہ بسور لیا تھا۔ اس دعوت کا اختتام بہت اچھا ہوا تھا۔ کیونکہ شائستہ پھپھو نے شہلا کو اپنے فہد کے لیے باقاعدہ طور پر مانگ لیا تھا۔ جس پر سب گھر والے بہت خوش تھے۔ اور شہلا بھی بہت خوش تھی۔

☆☆☆

گرمی بہت زیادہ تھی۔ جنریٹر بھی نہیں چل رہا تھا۔ اسے اپنا اسائنمنٹ مکمل کرنا تھا۔ اس لیے کتابوں اور کاغذات کا پلندہ لیے چھت پر چلی آئی۔ شکور کے کمرے (کباڑ خانے) کے آگے شیڈ تھا۔ جو اس وقت کسی درخت کی طرح سایہ فراہم کر رہا تھا۔

لکھتے لکھتے وہ گردوپیش سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھی۔ تسلسل اس وقت ٹوٹا جب اسے کچھ گرنے کی آواز آئی۔ جب یکے بعد دیگرے دو تین پتھروں کی آوازیں آئیں۔ تو وہ متجسس ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ چاروں طرف نظر دوڑانے پر اسے دو تین پتھر نظر آئے۔ جن پر کاغذ لپٹا ہوا تھا۔ اس نے کاغذ کھول لیا۔

پہلا کاغذ! ”میں فقط تمہاری ہوں، تمہاری منتظر نیلم۔“

دوسرا! ”کل تم سے بات نہیں ہوئی مانو کسی کام میں دل نہیں لگا۔ پلیز مجھ سے آج بات کر لینا۔“

تیسرا! ”شکور! آخر تم اپنے گھر والوں کو بتا کیوں نہیں دیتے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ اور مجھ سے ہی شادی کرو گے۔“

یہ پڑھ کے شہلا کی سفید رنگت پیلی ہو گئی تھی اس سے پہلے کہ وہ کچھ مزید سوچتی قدموں کی چاپ سن کر واپس بیٹھ گئی اور بے دلی سے ورق گردانی کرنے لگی۔

اس کا اندازہ درست تھا۔ نیچے سے اوپر آنے والا اور کوئی نہیں شکور تھا۔

”تم اس وقت یہاں؟“ شکور اسے دیکھ کر حیرت سے بولا تھا۔

”جی! نیچے گرمی تھی اس لیے کام کرنے آئی تھی“ اس نے سر جھکائے جواب دیا تھا اور ویسے بھی اس وقت وہ شکور کی طرف نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

”میں نے جنریٹر چلا دیا ہے۔ جاؤ نیچے آرام سے جا کر پڑھ لو۔“ شکور نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا۔

”کیوں......؟ کیا میں یہاں نہیں پڑھ سکتی“ وہ ضدی انداز میں بولی۔

شکور کو اس کی بات سن کر اچنبھا ہوا تھا۔ اس نے......کبھی اس طرح بات جو نہیں کی تھی۔

”پڑھ لو مگر تمہارے یہاں ہونے سے میں ڈسٹرب ہو جاؤں گا“ اب کی بار وہ سادگی سے بولا تھا۔

مگر اس کی آخری بات سن کر وہ نیچے بھاگ گئی تھی“

☆☆☆

پوری رات اس کے کانوں میں نیلم کی باتیں گونجتی رہیں۔ ”مجھے لگتا ہے کہ شکور بھائی تمہیں پسند نہیں کرتے۔ شاید انہیں کوئی اور پسند ہو ورنہ ایسا بھی کیا وہ تو تمہیں لفٹ ہی نہیں کرواتے۔ اچھا ہی ہے، اگر تمہاری جان چھوٹ جائے۔ اتنا پرانا نام اور اتنے فرسودہ خیالات دیکھا نہیں اس حرا سے کیسے باتیں بنا رہے تھے۔ کبھی تم سے کی ہیں ایسی باتیں سوچ لو شہلا شادی ایک دفعہ ہی ہوتی ہے“ اپنی دانست میں وہ اس کو بہت اچھا مشورہ دے رہی تھی۔

انہی باتوں کو یاد کرتے، سوچتے، کروٹ بدلتے ہوئے بالآخر وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

☆☆☆

وہ سب اس وقت خوب صورت سے سبزہ زار میں موجود تھے۔ آج شہلا کی منگنی تھی۔ روشنیوں سے منور اور فریش فلاورز کی ارینجمنٹ سبزہ زار کی رونق میں چار چاند لگا رہے تھے۔

یہ سب شائستہ کی فرمائش پر ہوا تھا کیونکہ فہد ان

UrduBooks.UK

کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اور وہ اپنے سارے ارمان پورے کرنا چاہتی تھیں۔

شہیلا اور فہد تو اس تقریب کی رونق ہی تھے۔ مگر شہلا بھی پنک میکسی اور لائٹ سے میک اپ میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ شکور بھی ڈنر سوٹ میں وجیہہ اور منفرد نظر آرہا تھا۔

شہلا کو سرپرائز اس وقت ملا۔ جب شہیلا اور فہد کے فوٹو سیشن کے بعد شہزاد...... شکور اور شہلا کو اسٹیج پر لے گیا۔ سب کے سامنے شکور نے اسے رنگ پہنا دی تھی۔ دل تو چاہا کہ اسی وقت اس کے منہ پر دے مارے...... مگر بکھرتی مسکراہٹوں اور خوشی کو دیکھ کر سر جھکا دیا۔

"کیسا لگا ہمارا سرپرائز......؟" جب تھوڑا رش ختم ہوا تو شہیلا اس کو دیکھ کر بولی جبکہ وہ جواب میں مسکرا دی تھی۔

"اب تم سب کو بتانا کہ تمہاری انگیجمنٹ ایک نہیں دو دفعہ ہوئی ہے۔" شہیلا کا جوش دیدنی تھا کیونکہ یہ سارا اسی کا پلان تھا۔

☆☆☆

آمنہ آپی کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ جسے سب نے ہی انجوائے کیا۔ مگر شہلا اور شکور کے درمیان ابھی حالات بہتر نہیں تھے۔ کچھ شکور کی مصروفیات کچھ شہلا کی پڑھائی، ایگزامز کا خوف اور گھر داری...... اس کی توجہ انہی کاموں پر تھی۔ اپنے آپ سے بیگانہ آج کل وہ دو پاٹوں میں پس رہی تھی۔

فہمیدہ کی طبیعت خراب تھی۔ ورنہ وہ زیادہ تر کوکنگ خود ہی کر لیتی تھیں۔ شہلا کو کوکنگ بھی خود کرنا پڑ رہی تھی۔ اس رات بھی اس کے اور شمائل کے درمیان جھگڑا اسی لیے ہوا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" شمائل نے جب کل کے بچے ہوئے قیمہ آلو کو قیمہ آملیٹ میں تبدیل دیکھا تو پوچھے بنا نہیں رہ سکا۔

"میرا سر۔" وہ جھنجلا کر بولی تھی۔ "ہماری تو قسمت ہی خراب ہے۔ پھپھو اور شایان بھیا آئے تھے۔ تو روز روز کڑاہی اور قورمے پک رہے تھے۔ اور اب ہمیں باسی کھانا کھلا رہی ہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ انسان زہر کھا لے۔" شمائل ڈائیلاگ پر ڈائیلاگ مار رہا تھا۔

"ہاں! تو شایان کیڈٹ کالج سے آیا تھا اور پھپھو دبئی سے۔ تم بھی کہیں چلے جاؤ...... تمہیں بھی مرغے پکا پکا کر کھلا دوں گی۔" وہ اسے چمٹا دکھا کر بولی۔ تازہ پھلکا جو لے کر آئی تھی۔

"ٹھیک ہے...... جب آپ بھی نیچے سے شکور بھائی کے ساتھ آئیں گی نا تو میں بھی آپ کو اسی طرح کا باسی کھانا کھلاؤں گا۔" شمائل نے اب کی بار منہ پر باقاعدہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

شہلا کے تو سر پر لگی اور تلوؤں پر بجھی۔

"تم مجھے باسی کھانا کھلاؤ گے۔" وہ اس کے پیچھے بھاگی۔

"ہاں! اور شہیلا آپی کھائیں گی تکے اور مٹن بریانی۔" وہ بھاگا۔

"تم بھی میری شادی نیچے کر کے دکھاؤ۔ میں بھی نہیں کروں گی شادی نیچے میں ہی رہ گئی باسی کھانا کھانے کے لیے۔"

ایک قیامت اور بھگدڑ تھی۔ جوان دونوں بہن بھائیوں نے مچا رکھی تھی۔ چمٹے کا ایک گھاؤ تو شمائل کھا چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ اسے دوسرا چمٹا پڑتا...... شمائل کی ہی بدولت پھینکی گئی ٹی شرٹ پر اس کا پاؤں پھسلا تھا۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ اوپر سے آنے والے شکور نے اسے تھام لیا۔ ورنہ وہ پیر کے ساتھ ساتھ منہ پر بھی چوٹ کھا چکی ہوتی۔

ابھی شکور اسے پکڑے حیرانی سے صورت حال جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ شہید بیگ اور فہمیدہ بھی اندرونی کمرے سے باہر آگئے۔

اب شہلا کو صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ نچلی منزل سے تایا ابو اور تائی اماں بھی اوپر آگئے۔ جبکہ پیچھے شہزاد اور شہیلا بھی ہکا بکا تھے۔

UrduBooks.pk

شکور سے ہاتھ چھڑاتی ہوئی۔ دوپٹا سمیٹ کر آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ تایا ابو کے گلے لگ کر رونے لگی۔

"کیا طوفان سر پر اٹھا رکھا ہے تم دونوں نے؟" شہید بیگ غصے میں تھے۔

"شمائل تو چھوٹا ہے، شہلا تم تو بڑی ہو۔" فہمیدہ کو آج بیٹی پر غصے کے ساتھ ساتھ حیرت بھی تھی۔ مگر شہداد بیگ نے انہیں خاموش کروایا تھا۔

"میری بیٹی کو کسی نے تنگ کیا اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔" اور وہ روتے ہوئے بھی ہنس دی تھی۔

"فہمیدہ! تم اس سے اتنا کام کیوں کرواتی ہو؟" شہداد بیگ نے فہمیدہ سے استفسار کیا۔

"بھائی جان! ابھی نہیں کرے گی تو کب کرے گی؟ کل کلاں کو آپ اور باجی ہی مجھے کہیں گے کہ بیٹی کو کچھ نہیں سکھایا۔"

"سیکھ جائے گی سیکھ جائے گی۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ شہلا اور شمائل کو نیچے لے جاؤ، کھانا کھالیں گے۔ میں اور تمہاری امی اوپر ہی بیٹھیں گے۔" تایا ابو نے اب شہنیلا کو کہا۔

وہ نیچے جانا تو نہیں چاہ رہی تھی۔ مگر اسے جانا پڑا۔ شمائل شہنیلا کے ساتھ ساتھ نیچے اتر چکا تھا۔

"آپی! کیا پکا ہے؟"

"دال چاول...... ہونہہ...... نیچے بھی کڑکی چل رہی ہے۔ چلیں میں کھالوں گا۔ آپی کے باسی کھانوں سے تو بہتر ہے۔" اس نے کن انکھیوں سے نظریں گھما کر واپس اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"شہلا آپی! کیا سین تھا۔ بس موبائل کی کمی تھی۔" شہزاد نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی تھی۔ اور جب اس نے گھور کر دیکھا تو وہ بھی چپ چاپ نیچے اتر گیا۔

شہنیلا نے دال چاول کی جگہ برگرز اور کوک لا کر رکھ دی۔

"بھائی جان! لے کر آئے ہیں۔ چلو! پارٹی انجوائے کرتے ہیں۔" وہ شانے اچکا کر بولی۔

"بھائی جان خود کہاں ہیں......؟" شمائل بے چین ہوا تھا۔

"اوپر چلے گئے واپس۔" اس نے اسی طرح جواب دیا تھا۔

اور وہ پوچھتے پوچھتے رہ گئی کہ "تمہارے بھائی اتنے سڑیل کیوں ہیں؟"

☆☆☆

وہ دل ہی دل میں بہت پشیمان تھی۔ اس کا خیال تھا کہ تایا ابو اور تائی امی نے اس کی بات سنی ہو یا نہیں...... مگر شکور نے ضرور سنی ہوگی۔ کچھ اس دن کا بر گر اسے نمک حلالی کا کہہ رہا تھا کہ اس دن کے لیے شکور سے معافی مانگی جائے کہ میرا مطلب یہ تھا۔ اور وہ نہیں تھا غلطی صرف شمائل کی تھی۔ وہ کاغذ پر لکھے ہوئے نیلم کے ڈائیلاگ اور اپنی ناراضی بھول چکی تھی۔

مناسب الفاظ سوچتے ہوئے وہ نیچے اترنے لگی۔ فہمیدہ اور تہمینہ سسرالی رشتے داروں میں پرسے کے لئے گئی ہوئی تھیں۔ شہنیلا کا یہ سونے کا وقت تھا۔ اور شہزاد اس وقت کوچنگ سینٹر میں ہوگا۔

اس سے پہلے کہ وہ نیچے اترتی۔ بیل بجی تھی اور کسی نے دروازہ کھول دیا۔ ابھی وہ سوچ رہی تھی کہ نیچے اترے یا اوپر جائے...... پھر اس نے فیصلہ کیا کہ دیکھنا چاہیے کہ کون آیا ہے؟

اسی تذبذب میں مبتلا اسے جو آواز سنائی دی۔ وہ بلاشبہ نیلم کی تھی۔

اب یہ اوپر آئے گی تو میں شکور سے کیسے بات کروں گی؟

اسی لیے وہ واپس اوپر آنے لگی مگر نیلم شاید وہیں رک گئی تھی۔ اسے اچنبھا ہوا...... شہنیلا اس سے زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ اور شکور کو نیلم پسند نہیں کرتی تھی۔

زینے کو ہری بھری بیل نے اس طرح ڈھکا ہوا تھا کہ گرل تو چھپ ہی گئی تھی اس لیے اگر کوئی زینے پر کھڑا ہو۔ تو اسے آسانی سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

وہ آخری قدمچے سے دو تین زینے اوپر رہی

تھی۔ جب اسے شکور کی آواز آئی۔
"نیلم! تمیز سے بات کرو۔ میں تم سے بڑا ہوں۔"
"اور جو آپ نے میرے ساتھ کیا...... وہ کیا تھا؟" نیلم بولی تھی۔
"دھوکا......؟ جو تم خود اپنے آپ کو دے رہی ہو۔" اب کی بار شکور سختی سے بولا تھا۔
"دھوکا...... تو آپ مجھے دے رہے ہیں...... پہلے آپ نے ہی مجھے اپنی چکنی چپڑی باتوں میں پھنسایا اور جب میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ رشتہ بھیجیں تو مجھے اپنے پارسا ہونے کا بتا رہے ہیں۔ میں شہلا نہیں ہوں جو ہر بات پہ بہل جاؤں گی مجھے اپنا حق لینا آتا ہے۔" وہ تلملائی تھی۔
"جب تم میری بات سننا نہیں چاہتیں...... اور نہ ہی سمجھنا چاہتی ہو، تو مجھے بھی تم جیسوں سے اچھی طرح نپٹنا آتا ہے۔ اگر تم نے میرا نام کسی بھی طرح کسی کے سامنے لیا...... تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" شکور نے بھی اسے دھمکی دے دی۔ پھر دروازہ دھڑ سے بند ہونے کی آواز آئی۔ شہلا کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ الماری سے اپنی انگوٹھی کی مخملی ڈبیا نکالی اور واپس نیچے آگئی۔
شکور کو ڈھونڈتے ہوئے وہ اس کے کمرے میں آگئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اپنے بیڈ کے کنارے پر ٹکا ہوا تھا۔
"یہ لیں۔" اس نے ڈبیا اس کے ہاتھ میں تھمائی۔
"کیا ہے یہ؟" اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔
"میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔
"تمہارا دماغ تو صحیح ہے؟" شکور کو اس کی دماغی حالت پر شبہ ہوا تھا۔
"مگر کیوں......؟ آخر کوئی وجہ تو ہو......" وہ اس کے غصے میں اضافہ کر رہی تھی۔
"آپ اپنی مرضی اور پسند کی لڑکی سے شادی کر لیں۔ مجھ پر تایا ابو کی وجہ سے"...... اس سے آگے وہ کچھ بولتی...... شکور نے دروازے کی طرف انگلی اٹھائی...... اور کہنے لگا۔
"چلی جاؤ...... یہاں سے...... اس سے پہلے کہ میرا غصہ مزید بڑھ جائے۔" اس کی آواز تیز تھی۔
"آپ مجھ پر غصہ کرنے کا حق کھو چکے ہیں۔" اس نے بھی اپنی آواز بلند کی تھی۔
جس کا جواب اسے شکور کے تھپڑ نے دیا تھا۔ اس کا گال لال کر چکا تھا۔
"ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلی جاؤ......" شکور نے پھر اسے باہر کا راستہ دکھایا۔
دروازے کے باہر کھڑی شہیلا نے یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی شہلا بھاگتی ہوئی اوپر گئی اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔
اور شکور جو پچھلے چھ مہینے سے پریشان تھا۔ دل ہی دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

"اس دن ــ کیا ہوا تھا؟" شہلا کے اپنے تجزیے کے مطابق شاید کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوا۔ اس کے پیپرز کی ڈیٹ شیٹ آچکی تھی۔ اس لیے فہمیدہ نے اسے گھر کے کاموں سے تو رخصت دے دی۔ لیکن اسے ٹیوشن کے لیے آنے والے بچوں کو بھی خود ہی پڑھانا پڑھ رہا تھا۔ وہ جب سے نیچے نہیں اتری تھی۔ تب سے ان تینوں بہن بھائیوں میں سے کوئی اوپر نہیں آیا تھا۔ یہاں تک کہ دن رات اوپر نیچے کے چکر کاٹنے والے شکور نے بھی نیچے ہی ڈیرا جمایا ہوا تھا۔ البتہ شہلا کی پڑھائی سے بور ہو کر فہمیدہ اور شمائل زیادہ تر وقت نیچے ہی گزار رہے تھے۔
مگر اسے اتنا ضرور معلوم تھا۔ کہ نیچے کچھ نہ کچھ ایسی کھچڑی ضرور پک رہی ہے۔ جو اسے نہیں معلوم ہے لیکن وہ کیا کرتی؟ اپنی انا مار کر وہ نیچے نہیں جانا چاہتی تھی۔ اور جو کارنامہ وہ اپنے ہاتھوں سے سرانجام دے کر آئی تھی۔ اگر فہمیدہ کو معلوم ہو جاتا تو انہوں

نے اسے اتنی جوتیاں ماری تھیں کہ شاید وہ گنجی ہوجاتی مگر ان کا ہاتھ نہ رکتا۔

دل ہی دل میں وہ اپنے آپ کو سب کے سامنے جواب دینے کے لیے بھی تیار کر چکی تھی۔ مگر اس سے کسی نے جواب کیوں نہیں مانگا؟ اب تک یہ وہ نہیں جان پائی اس کا آخری پیپر تھا۔ کالج کے کینٹے میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اسے کالج سے واپسی پر دیر بھی ہوگئی۔

گھر پہنچی تو دروازے کے سامنے سامان سے لدا پھندا ٹرک دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید اپنے ننھے دماغ پر زور ڈالتی۔ شکور اس کے کانوں کے پاس آکر بولا۔

"یہ تمہارا ہی گھر ہے۔ جاؤ، اندر چلی جاؤ۔" وہ تن فن کرتی اندر پہنچی۔ تو تایا ابو اور تائی اسی کے منتظر تھے۔

"یہ سب کیا ہے آپ کہاں جارہے ہیں؟" وہ تایا ابو سے لپٹی۔

"اپنے گھر۔" وہ مسکرائے۔

"تمہارے تایا ابو نے نیا گھر بنوایا ہے۔ تو وہ وہیں رہیں گے نا۔" وہ اسے پیار کرتے ہوئے بولے۔ آخر وہ ان کی لاڈلی جو تھی۔

"تو کیا یہ آپ کا گھر نہیں ہے؟" اس نے افسردگی سے پوچھا۔

"میرا بھی ہے۔ لیکن یہ تمہارا گھر ہے۔" وہ تمہارا پر زور دے کر بولے تھے۔

"شہنیلا کہاں ہے......؟" اب اس نے شہنیلا کا پوچھا تھا۔

اور دروازے کے باہر کھڑے شکور کا دل کیا کہ اس کا گلا دبادے۔ اتنے دنوں سے پیکنگ ہوتی ہوئی نظر نہیں آرہی تھی۔ بھلا اب بھی شہنیلا کو کیوں یاد کررہی ہے؟

"بیٹا! وہ شہزاد کے ساتھ گئی ہے...... صفائی کرلے گی...... تو سامان آرام سے سیٹ ہوجائے گا وہ تمہارا ہی انتظار کررہی تھی۔ مگر تمہیں آنے میں دیر ہوگئی۔" تائی امی نے اسے تفصیل بتاتے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا! اب دروازہ بند کرلو جب تمہارے ابو آفس سے آجائیں۔ تو انہیں کھانا دے کر سونا میں شمائل کے ساتھ آجاؤں گی۔" فہمیدہ اسے سمجھاتی ہوئی چلی گئی تھیں۔

اور وہ جو ساتھ چلنے کی فرمائش کرنے والی تھی چپ چاپ اندر بیٹھ گئی۔ تایا ابو کا پُررونق گھر خاصا ویران لگ رہا تھا۔ اس کا نازک سا دل گھبرا گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ سب کیا گئے......؟ گھر کی رونق بھی ساتھ لے گئے۔ اس کے پریکٹیکل کی ڈیٹ بھی آگئی تھی۔ تایا ابو کے پورشن کی مرمت کروائی جارہی تھی کیونکہ شہید بیگ کو اب نیچے شفٹ ہونا تھا۔

فہمیدہ کا رویہ بھی اس کے ساتھ اب اچھا نہیں تھا۔ شاید وہ بھی اکیلی ہوگئی تھیں۔ پہلے ان کا زیادہ تر وقت نیچے گزرتا تھا۔ مگر ان کی کمپنی ان ہی کی اکلوتی بیٹی کی وجہ سے ختم ہوگئی تھی۔ یہ ان کا ذاتی خیال بھی تھا۔

آج کل وہ اس کی گھرداری پر زیادہ توجہ دے رہی تھی۔ کوکنگ سے فارغ ہوتی۔ تو اسے سلائی مشین پکڑا دیتیں۔ سلائی مشین سے اٹھتی تو دوبارہ کچن کا رخ کرنا پڑتا۔ شمائل اور شایان کی فرمائشیں بڑھتی جارہی تھیں۔ شایان کیڈٹ کالج سے پاس آؤٹ ہونے کے بعد ٹیسٹ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔

ایک انوکھی بات یہ ہوئی کہ نہ تو اسے کوئی تایا ابو کے گھر لے کر گیا۔ اور نہ ہی اس کی ہمت ہوئی کہنے کی جبکہ شہنیلا نے بھی کوئی چکر نہیں لگایا تھا تائی امی سے پوچھا تو ہنس کر کہنے لگیں۔

"وہ آج کل بہت مصروف ہے۔" اور پھر اس نے جیسے سب سے سمجھوتہ کرلیا تھا اور ایک ووکیشنل سینٹر جوائن کرکے کوکنگ اور اسٹچنگ کی کلاسز لینے لگی۔

urdubooks.pk

☆☆☆

ربیعہ اس وقت درد کے مارے کراہ رہی تھیں مگر اس وقت کوئی ان کی تکلیف دیکھنے اور سننے والا نہیں تھا۔ نیلم گھر میں ہوتے ہوئے بھی غیر حاضر سی تھی۔

یہ ربیعہ اور فیروز کا گھرانہ تھا۔ ان کے پانچ ہی بچے تھے۔ تین بیٹے اور دو بیٹیاں۔ ایک بیٹے اور بیٹی کی شادی کر چکی تھیں۔ فیروز ایک فیکٹری میں سپروائزر تھے اور دونوں بڑے بیٹے عاصم اور کمال بھی فیکٹری ہی جاتے تھے۔ چار سال پہلے ایک روڈ حادثے میں ہونے والے فیروز کے انتقال نے اس گھر کے مکینوں پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔

عاصم اور اس کی بیوی شمائلہ بجائے اس کے کہ ربیعہ کو سہارا دیتے اور اس گھر کی ذمہ داری اسی طرح اٹھاتے جیسے فیروز اٹھاتے تھے۔ خود غرضی کا مظاہرہ کر کے الگ ہو گئے تھے۔ ان کے خیال میں ان کے لیے ان کے دو بچے ہی کافی تھے۔

بڑی بیٹی نازیہ اپنے مسائل کا اتنا رونا روتی تھی کہ بعض اوقات ربیعہ کو ہی اس کی مدد کرنا پڑتی۔ رہ گیا کامل تو اس کی تنخواہ اور نچلے پورشن کے کرائے سے ربیعہ اپنے گھر کا خرچ چلا رہی تھیں۔

دو سال کے بجائے چار سال میں ایف ایس سی پاس کرنے والی نیلم اب ایک چھوٹے سے اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ اسکول کی تنخواہ اور ٹیوشن سے ملنے والی فیس کو وہ اپنے ڈریسز، میک اپ اور موبائل فون کے خرچوں پر پورا کر دیتی تھی۔ بڑوں کی خود غرضی اور چونچلے دیکھتے ہوئے ربیعہ نے سب سے چھوٹے ناصر کو درزی کی دکان پر لگا دیا۔ مگر وہ بھی اپنے بہن بھائیوں کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔

گھر کا زیادہ تر کام ربیعہ ہی نپٹاتی تھیں۔ ابھی بھی چارپائی پر پاؤں کے درد کا رونا رو رہی تھیں۔ مگر نیلم کہاں تھی؟ انہیں نہیں معلوم تھا۔ بہو زیادہ تر اپنا کمرہ بند رکھتی تھی۔ آخر کار وہ کراہتی ہوئی اندرونی کمرے میں گئیں جہاں نیلم کوئی انڈین مووی دیکھ رہی تھی۔

"نیلم! نیلم ......" جب پکارنے پر بھی انہیں جواب نہ ملا۔ تو انہوں نے ٹی وی بند کر دیا۔

"اماں! یہ کیا کیا؟" نیلم بگڑی تھی۔

"اتنی بدتمیز نہ بنو کچھ سلیقہ بھی سیکھو۔ کل کو کیسے بیاہوں گی تمہیں؟ کوئی شہزادہ آسمان سے نہیں اترے گا۔" وہ بھی غصہ ہوئیں۔

"کوئی شہزادہ آئے یا نا آئے شکور ضرور آئے گا اماں"۔

وہ اتراتی ہوئی دوبارہ صوفے پر دراز ہو گئی تھی۔

"کیا اول فول بک رہی ہے؟ تمہاری پھپھو نے تمہارا رشتہ شاہ رخ کے لیے مانگا ہے۔ اور میں نے ہاں کر دی ہے۔" وہ اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئی بولیں۔

"مجھے شاہ رخ پسند نہیں ہے۔ آپ پھپھو کو منع کر دیں۔" وہ قطعی انداز میں بولی۔

"کامل نے شادی شادی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ تمہاری چچی بھی شادی کرنے کو تیار ہیں۔ میں گھر میں کوئی نیا تماشا نہیں دیکھنا چاہتی۔ اس لیے جاؤ، اور روٹی پکا لو کامل آتا ہوگا۔"

اب کی بار انہوں نے رعب سے کہا۔ تو نیلم کو وہاں سے جانا ہی پڑا۔

ہفتے کے دن نیلم کچھ پرجوش تھی۔ پردے دھوئے، دیواریں، دروازے، رگڑ رگڑ کر صاف کیے شام تک گھر چندن سا صاف تھا۔ پھر پارلر چلی گئی۔

رات کو جب وہ اپنے کپڑے استری کر رہی تھی۔ تو ربیعہ اس کے پاس آ بیٹھیں۔

"خیریت تو ہے نیلم؟" وہ نہ سمجھتے ہوئے بھی بہت کچھ سمجھ رہی تھیں۔

"اماں! وہ کل شکور کی فیملی آ رہی ہے۔" وہ اپنی اماں کے قدموں میں بیٹھی تھی۔ یعنی اس نے ربیعہ کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اور ربیعہ دکھ بھری سانس بھر کر بیٹھ گئی تھیں۔

UrduBooks.pk

☆☆☆

فہمیدہ اور شہید بیگ شاپنگ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ شہلا، شایان اور شمائل انگلش مووی دیکھ رہے تھے۔تب ہی ڈور بیل بجی۔

''شایان! تم جاؤ۔'' شہلا نے شایان کو کہا۔ اور شایان نے شمائل کو کندھا ہلا کر باہر جانے کا اشارہ کیا۔شمائل دونوں کو گھورتا ہوا اٹھ گیا تھا۔جب شمائل کو گئے کافی دیر گزر گئی۔تو شہلا شایان سے کہنے لگی۔

''جا کر دیکھ تو آؤ...... آخر یہ کہاں رہ گیا ہے؟''

''آپی! میرا سسپنس نہیں خراب کریں۔آجائے گا۔'' شایان بھی اپنی جگہ سے ہلے بغیر بولا تھا۔

مگر شہلا کو بھی چین نہیں آیا۔اٹھ کر باہر کی طرف آئی۔

شمائل اور نیلم آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ نیلم نے اسے دیکھا تو ہاتھ ہلا دیا۔اور پھر باہر نکل گئی۔

''یہ کیوں آئی تھی؟'' شہلا اسے دیکھ کر غصہ ہوئی تھی۔

''کچھ نہیں آپی، ایک کام تھا۔'' شمائل مبہم انداز میں بولا۔

''کیا کام تھا؟'' وہ مشکوک ہوئی۔

''آپ تو میرے پیچھے ہی پڑ گئی ہیں۔وہ پوچھ رہی تھیں کہ تمہارا کیبل آرہا ہے یا نہیں...... میں نے کہا آرہا ہے تو کہنے لگیں پھر ہمارا کیوں نہیں آرہا؟''
اس سے پہلے کہ شمائل اسے کوئی اور رام کہانی سناتا۔اس نے شمائل کی بات درمیان سے کاٹی...... اور کہنے لگی۔

''ہاں! اور اسی طرح کیبل آنے یا نہ آنے میں تم دونوں دس منٹ تک باتیں کرتے رہے۔''

شمائل منہ پھاڑ کر ہنسنے لگا۔

''جب میری پیاری آپی کو معلوم ہے کہ میں بتانا نہیں چاہ رہا۔تو پوچھ کیوں رہی ہیں؟'' کہہ وہ اندر چلا گیا۔جب کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ شمائل کے منہ پر انڈے اور ٹماٹر کی برسات کر دے۔برے برے منہ بناتی ہوئی...... اور دل ہی دل میں کھٹکتی ہوئی وہ بھی ان کے ساتھ مووی دیکھنے لگی۔

☆☆☆

''مٹھائی کس کے گھر سے آئی ہے......؟'' وہ رس گلہ منہ میں ڈالتی ہوئی بولی۔

''نیلم باجی کے گھر سے۔'' شمائل نے جواب دیا تھا۔

''اس کا رشتہ پکا ہو گیا ہے۔جمعہ کو نکاح ہے۔'' فہمیدہ نے اسے بتایا۔یہ سن کر اسے رس گلہ حلق سے اتارنا مشکل ہو چکا تھا اس کے لیے۔

''کس سے؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''ظاہر ہے...... کسی لڑکے سے ہی ہو رہا ہوگا۔'' فہمیدہ نے خاصے سرد لہجے میں کہا تھا۔اور وہ چپ ہو گئی۔اسے معلوم تھا کہ اس کی امی کو نیلم زیادہ پسند نہیں ہے۔وہ جمعرات کا دن تھا۔اور شام کے کھانے کی تیاری کے لیے وہ کچن میں تھی۔دال کو بگھارنا تھا۔پیاز اور لہسن چھیل کر کاٹ رہی تھی کہ تب موبائل کی رنگ ٹون بجی۔نیلم کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے کال ریسیو کر لی۔وہ اسے اپنے نکاح میں انوائٹ کر رہی تھی۔

''دیکھوں گی...... اگر ممکن ہوا...... تو آجاؤں گی۔'' وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

''تمہیں لازمی آنا ہے۔بہانہ نہیں چلے گا۔'' وہ ہنسی تھی۔

''اتنی جلدی یہ سب کیسے ہوا؟ آئی مین نکاح پہلے منگنی بھی ہو سکتی تھی۔'' وہ جیسے اٹک اٹک کر بولی۔

''مجھے تو نہیں...... ہاں البتہ شکور کو بہت جلدی تھی...... چھ مہینے بعد رخصتی ہے۔دراصل...... تمہیں تو معلوم ہے کہ منگنی ایک کچا رشتہ ہوتا ہے۔جبکہ نکاح پھر بھی ریلائبل ہے۔'' نیلم بڑی سمجھ داری کی باتیں کر رہی تھی۔

اس کے بعد اس نے کیا کہا اور اس نے کیا سنا؟ اسے نہیں معلوم تھا۔پانچ منٹ بعد جب وہ دال میں

UrduBooks.PK

بگھار لگا رہی تھی...... تو فرائی پین اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ آدھا تیل اس کے نرم و ملائم ہاتھوں پر گرا، تو آدھا اس کے پاؤں جلا گیا تھا۔ اس کی چیخیں سن کر سب کچن میں آ گئے تھے۔

☆☆☆

وہ آنکھیں موندے سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے خوبصورت ہاتھ اور پیر کسی حد تک بچ گئے تھے۔ کچھ خوف اور کچھ اذیت اور صدمے سے وہ اسی وقت بے ہوش ہو گئی تھی۔ شہید بیگ اور شایان اسے اسی وقت اسپتال لے گئے۔ جہاں اسے بروقت ٹریٹمنٹ دے دی گئی۔ اب بھی وہ سکون آور ٹیبلٹ کے زیر اثر تھی۔

''یہ ابھی بھی سو رہی ہے۔'' یہ شہنیلا کی آواز تھی۔

''کم از کم ہمیں بتا ہی دیا ہوتا۔'' تائی خفا ہو رہی تھیں۔

''میں نے سوچا کہ آپ نیلم کے نکاح میں تو آئیں گے ہی تب ہی معلوم ہو جائے گا''۔ فہمیدہ نے تسلی دی تھی۔

''بچی آرام کر رہی ہے شور مت مچائیں...... جب اٹھے گی تو دیکھ لیں گے۔ تب تک نیلم کے گھر سے ہو کر آ جاتے ہیں''۔ شہید بیگ کی معرفت میں وہ سب اب نیلم کے گھر کی طرف چلے گئے تھے۔

جبکہ شہنیلا...... شہلا کے بیڈ کے دوسری طرف موجود صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ اور ٹیبل پر رکھے ہوئے رسالے کی ورق گردانی کرنے لگی تھی۔

شہلا کی آنکھ کھلی...... تو شہنیلا کو صوفے پر نیم دراز دیکھا کیا یہ واقعی میں شہنیلا ہے؟...... یہ اپنے بھائی کے نکاح میں نہیں گئی۔ اس نے سوچا۔ اور پھر رخ موڑ کر لیٹ گئی۔ یہ پروا کیے بغیر کہ اس کا پیر احتجاج کرے گا۔ بےزاری سے لیٹی ہوئی شہنیلا کی نظر اس پر پڑی۔ تو سمجھی کہ وہ اب تک سو رہی ہے۔ اور اسی حالت میں کروٹ بدلی ہے۔ وہ اٹھی۔

''اوہ...... اوہ...... یہ لڑکی بھی نا...... اپنا نقصان کرواتی ہے۔'' اور اس کا نازک سا پیر دھیان سے دوسرے پیر پر سے ہٹانے لگی۔

اس کے ہاتھ لگانے پر شہلا نے اپنے پیر کو جھٹکا دیا۔ اور کہنے لگی۔

''چھوڑو میرا پیر...... میں ٹھیک ہوں......''

''تو محترمہ جاگ رہی ہیں۔ اور ہم الو کی طرح اونگھ رہے ہیں۔'' شہنیلا کو اس پر سچ مچ غصہ آ گیا تھا۔

''کس نے کہا کہ آپ جاگیں۔'' اس نے بھی بےزاری دکھائی۔

''محترمہ! اپنے یہ ڈرامے بند کر دو...... سسرال والے زیادہ نخرہ نہیں اٹھائیں گے۔'' وہ اٹھلائی تھی۔

''میرے سسرال والے اٹھائیں گے''۔ وہ بھی اسی کی کزن تھی۔

''آپی! آپی! پولیس آئی ہے۔ شکور بھائی کو پکڑ کر لے گئی ہے۔'' شمائل نے دروازے پر آ کر کہا تھا۔

شہلا ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اوئے تمہیں کیا ہوا...... لیٹی رہو...... خبردار جو ہلیں...... میں ابھی آتی ہوں۔'' شہنیلا اسے ڈپٹتی ہوئی باہر نکل گئی۔

جبکہ وہ اسی حالت میں بیٹھی رہی...... مصیبت یہ تھی کہ اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا...... ورنہ دیکھ لیتی کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔

''شکر ہے کہ شکور پکڑا گیا...... خس کم جہاں پاک......'' شہنیلا نے واپس آ کر اس طرح لعنتیں اور ملامتیں کیں...... کہ اس کا دل ڈوب گیا...... بھلا کوئی اپنے کو ایسے کہتا ہے۔

''تم اپنے بھائی کو اس طرح کیوں کہہ رہی ہو۔'' اسے حقیقتاً برا لگ رہا تھا۔

''بھائی ہوگا تمہارا۔'' شہنیلا پھر چڑی تھی۔

پھر اسے نہ جانے کیا یاد آیا۔ وہ ہنسنے لگی۔

''ویسے چھ مہینے پہلے تم کتنی اچھی اور فریش

تھیں۔اپنی بے وقوفی سے کیا حالت بنالی۔آؤ! میں تمہیں ایک کہانی سناتی ہوں۔جو اس گھر میں ڈھائی لوگوں کو معلوم ہے۔"

☆☆☆

"ایک سال پہلے برابر والے گھر میں کام کرنے کے لیے شہر آنے والوں میں ایک شکور نامی لڑکا بھی شامل تھا۔پہلے اس نے اپنے ساتھ رہنے والے لڑکوں کے درمیان اپنے اخلاق و کردار کے ذریعے سکہ جمایا۔پھر آہستہ آہستہ محلے والوں کی تفصیلات بھی معلوم کرلیں۔چونکہ اس گھر میں جنریٹر وغیرہ تو تھا ہی نہیں اس لیے زیادہ تر وہ لوگ اپنا وقت چھت پر گزارتے تھے۔اور انہی دنوں شکور بھی زیادہ تر کام چھت پر کرتا تھا۔نیلم کے گھر میں بھی جنریٹر نہیں تھا۔تو جب بھی لائٹ جاتی وہ بھی چھت پر چلی جاتی تھی۔

شکور نے اپنا نام ...... شکور ہونے کا یہ فائدہ اٹھایا کہ اس نے نیلم کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

نیلم اسے تمہارا منگیتر اور میرا بھائی سمجھتی رہی۔نیلم کا نمبر لینے کے لیے اور اس سے محبت بھری باتیں کرنے کے لیے اس نے پتھر کا سہارا لیا۔

بعض اوقات یہ پتھر درمیانی چھت پر یعنی ان کی چھت پر گر جاتے تھے۔اور ان سے شکور اچھی طرح واقف تھا۔اسی لیے شہلا کو آنے سے منع کیا کرتا تھا۔نیلم سے نمبر لینے کے بعد شکور نے اس سے تصویریں کی فرمائش بھی کی۔جو کہ بے وقوف نیلم نے اسے واٹس ایپ کے ذریعے دے دیں۔

یہ سلسلہ تب مزید آگے بڑھا۔جب نیلم نے اس سے رشتہ بھیجنے کی فرمائش کی۔جس پر وہ تھوڑا پیچھے ہٹ گیا۔اور نیلم یہ سمجھی کہ شکور صرف وقت گزاری کررہا ہے۔اس لیے وہ موقع دیکھ کر شکور سے لڑنے چلی آئی۔

اس دن نیلم اور شکور کے درمیان ہونے والی گفتگو شہلا کے ساتھ ساتھ شہنیلا نے بھی سنی تھی۔

اور اس کے ردعمل میں شہلا، شکور کو انگوٹھی واپس دے آئی تھی۔

شہداد بیگ نے مستقبل کے پیش نظر کچھ سالوں پہلے ایک نئی بننے والی سوسائٹی میں بنگلہ بک کروالیا تھا۔جس کی چابی کچھ دنوں پہلے ہی شہداد بیگ کو ملی تھی۔

شہنیلا کے خیال میں انہیں اس گھر میں شفٹ ہوجانا چاہیے تھا۔یہ شہلا اور شکور کے نئے رشتے کے لیے بھی ضروری تھا۔

شہداد بیگ اور تہمینہ بھی اس دن شہلا اور شمائل کی لڑائی دیکھ کر نیم رضامند تھے۔مگر شکور ابھی تک راضی نہیں تھا۔مگر جب شہلا نے اس کے ہاتھ میں انگوٹھی دی۔تو اس کی نہ بھی ہاں میں بدل گئی۔

ادھر شکور نے نیلم کو اپنی باتوں میں اس طرح الجھایا تھا کہ وہ فی الحال خاموش ہوگئی تھی۔پھر ایک دن اس نے نیلم کو بتایا کہ وہ اپنی فیملی کو اس کے گھر رشتے کے لیے بھیج رہا ہے۔

جس پر نیلم بہت خوش تھی۔اور اس دن کا انتظار کررہی تھی۔جس دن شکور کے گھر والے اس کا رشتہ لے کر آتے۔

☆☆☆

دروازے پر دستک ہوئی۔اس سے پہلے کہ نیلم دوڑ کر جاتی۔ربیعہ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"نیلم! بے شرمی کی بھی حد ہوتی ہے ہر کام رسم و رواج کے مطابق اچھا لگتا ہے اندر چلو جب میں بلاؤں تب آنا۔"

دروازہ کھولنے پر جو مہمان خواتین اندر آئیں انہیں دیکھ کر ربیعہ کا شک درست ثابت ہوگیا تھا۔

یہ ان کے برابر میں رہنے والے شکور کے بجائے شکور کے گھر کے برابر میں رہنے والے شکور کے گھر والے تھے۔جنہیں ایک دن پہلے ہی اس نے آبائی گاؤں سے بلوایا تھا۔وہ ویسے ہی تھے جیسے کہ کوئی بھی ناخواندہ اور فیشن ایبل خاندان ہوتے ہیں۔نیلم جو کہ شہنیلا اور تہمینہ کی آمد کی منتظر تھی۔ان

خواتین کو دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔

صبح سے نہ جانے ...... کیا ...... کیا ...... پکا رکھا تھا۔ مگر اب اس کا نہ ان کے سامنے جانے کا موڈ تھا۔ اور نہ ہی ان کے سامنے کھانا پیش کرنے کا......

شوہر کی امانت کے طور پر موجود نیلم کی عزت سے شادی کرنا ربیعہ کی ذمے داری تھی۔ بہو کی طنزیہ نگاہیں سہتے ہوئے بھی رسم و رواج کے تقاضوں کو پورا کیا گیا تھا۔ ہر چیز کو انہوں نے اسی طرح کیا۔ جیسا نیلم چاہتی تھی۔ اور ان کی نظر میں یہ ہی نیلم کی سزا تھی۔

خواتین جن میں شکور کی والدہ بھابھی اور دو بہنیں شامل تھیں۔ انہیں نیلم بہت پسند آئی تھی۔ اور وہ ربیعہ کو ان کے بہو بیٹے کے ساتھ مدعو کر کے گئی تھیں۔

ان کی آمد نیلم کے گھر میں ایک طوفان لے آئی۔ بھائی، بھابھی کے طعنے و تشنے اور باتیں تو تھیں ہی...... کامل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے جان سے مار دیتا۔

نیلم اس رشتے سے صاف انکاری تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ ربیعہ باقاعدہ طور پر انکار کر پاتیں۔ اس فون کال نے نیلم کی جان خشک کر دی۔

شکور پر اس کی گالیوں، بددعاؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ بس یہ کہا۔ ''اگر تم نے اس رشتے سے انکار کیا۔ تو تمہاری وہ پیاری تصویریں جو تم نے مجھے اپنے پیارے ہاتھوں سے پوسٹ کی تھیں۔ انہیں اس طرح سوشل میڈیا پر پھیلاؤں گا۔ کہ تم اور تمہارا خاندان کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔''

مرتی کیا نہ کرتی اسے ربیعہ کو یہ بات بتانا پڑی اور اپنی بچی کھچی عزت کو بچانے کے لیے ربیعہ رسمی طور پر نہ صرف شکور کو دیکھ کر آئی تھیں۔ بلکہ انہیں نکاح کے لیے تاریخ بھی دے آئی تھیں۔ یہ اور بات ہے...... کہ انہوں نے بیٹوں کو کس طرح منایا...... یہ ان کا ہی دل جانتا تھا۔

نیلم اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود بھی اس رشتے کے لیے مزاحم تھی۔ مگر اس نے اپنے عمل سے کوئی ایسا کام بھی نہیں کیا تھا کہ گھر میں کوئی اس کی بات پر یقین کرتا۔

آخر سوچ بچار کے بعد اسے شکور سے مدد لینے کا خیال آیا۔ لیکن اس کا نمبر کس سے لیتی۔ شہلا سے وہ کوئی بھی بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اپنے آپ کو بے اعتباری کے مقام پر لانے والی وہ خود تھی۔

آخر کچھ سوچ بچار کر وہ اس دن گھر آئی تو دروازہ شمائل نے کھولا تھا۔ شمائل نے پہلے تو انکار کر دیا مگر نیلم نے اسے رام کر ہی لیا تھا۔

اور شکور تو ...... پہلے ہی شکور پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ نیلم کی مدد کرنے کا وعدہ وہ ایک شرط پر کر چکا تھا۔

''کون سی شرط......؟'' شہلا چونکی تھی۔

اس سے پہلے شہلا مزید بتاتی...... برابر والے کمرے سے فہمیدہ اور تہمینہ کی بلند آوازیں آنے لگیں۔

''غضب خدا...... اگر کوئی جہیز نہیں لے گا۔ تو کیا صرف اس بنیاد پر لڑکی کو بیاہ دو...... ایسے پڑوس کا کیا فائدہ؟ جو ایک دوسرے کے کام نہ آسکے۔''

فہمیدہ کی آواز میں غصہ اور رنج دونوں نمایاں تھے۔

''ربیعہ کو شکر کرنا چاہیے۔ نہ جانے کون سی نیکی کام آگئی۔ جو عین وقت پر پولیس نے چھاپا مار دیا...... چار بچوں کا باپ...... پہلی بیوی کی بغیر اجازت کے دوسرا نکاح...... توبہ...... توبہ کیا زمانہ آگیا ہے۔'' تہمینہ کا دل ابھی بھی ہول رہا تھا۔

''اس کی پھپھو راحت کا احسان ہے۔ کہ عین وقت پر اپنے بھائی کی عزت بچالی۔ اپنے بیٹے شاہ رخ سے نکاح پڑھوا دیا۔ اب اگر نیلم اپنے میاں کے پیر دھو دھو کر بھی پیے۔ تو کم ہے۔'' یہ تیسری آواز خالہ فردوس کی تھی جو شاید ان دونوں خواتین کے ساتھ ہی گھر میں آئی تھیں۔

''شہلا! چائے بنالو۔'' اب فہمیدہ اسے

بلا رہی تھیں۔

"چلو اب تم خود ہی ادھوری کہانی جوڑ لو میں چائے بنانے جا رہی ہوں۔" وہ اتراتی ہوئی چلی گئی تھی۔ جبکہ شہلا واقعی سوچ بچار میں گم ہو گئی۔

"اوئیں! میں کسی کی باتوں آ گئی...... اگر شکور ...... یا شہلا نے تائی امی یا تایا ابو کو میرے بارے میں بتا دیا ہوگا۔ تو پھر کیا ہوگا۔ میری انگوٹھی کہاں ہے۔ جب اپنے ہاتھ سے ہی انگوٹھی واپس کر دی۔ تو اب کہاں سے ملنے لگی۔ انگوٹھی۔" وہ اپنے ہی آپ کو ڈانٹنے لگی۔

"کیا معلوم......؟ میں نے وہ انگیجمنٹ رنگ نہ دی ہو وہ کوئی دوسری ہو۔ کم از کم اپنا دفاع تو کر سکوں گی۔"

وہ ایک چھوٹی سی امید کے سہارے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جس پر اس کے بائیں پیر نے احتجاج کیا تھا۔ مگر وہ پروا کیے بغیر الماری کھول چکی تھی۔ واپس بیڈ کی طرف آتے ہوئے اس کا ایک پیر توازن نہیں سنبھال سکا۔ اور جیولری بکس گر کر دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ نتیجتاً اس کے اندر موجود کچھ جیولری بیڈ پر اور کچھ کارپٹ پر بکھر گئی تھی۔

غصے سے لال ٹماٹر ہوتی ہوئی وہ بھی بیڈ پر بیٹھ گئی تھی اب شہلا کہے گی کہ میرا کام بڑھا دیا...... اور بیڈ پر موجود جیولری سمیٹنے لگی۔ دو تین رنگز وہ ایک طرف کر چکی تھی۔ مگر ان میں سے وہ کوئی بھی نہیں تھی۔

اب اسکا ارادہ کارپٹ پر بیٹھ کر جیولری سمیٹنے کا تھا۔ اور پر بیڈ پر بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ کی پہنچ میں موجود کچھ چیزیں وہ اٹھا چکی تھی۔

"کیا ڈھونڈ رہی ہو؟" ایک شناسا مگر بہت دنوں بعد سنائی دینے والی آواز پر جب اس نے سر اٹھایا۔ تو سامنے شکور کھڑا تھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ اسے دیکھ کر اداسی سے بولی۔ اور سمٹ کر بیڈ کے ایک طرف بیٹھ گئی۔

"کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے تم کہو تو میں تمہاری مدد کر دوں۔" وہ شوخی سے بولا۔

"مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔" اپنا جیولری بکس سمیٹتے ہوئے وہ غصہ ہوئی۔

"کہیں تم یہ تو...... نہیں ڈھونڈ رہی تھیں......؟ اس نے اپنی بند مٹھی اس کے سامنے کھولتے ہوئے کہا۔ شہلا کی منگنی کی انگوٹھی اس کی ہتھیلی میں جگمگا رہی تھی۔

"نہیں...... میں کیوں بھلا اسے ڈھونڈنے لگی۔" سٹپٹاتے ہوئے اس نے بڑی آسانی سے جھوٹ بولا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اسے دیکھ کر مطمئن ہو گئی تھی۔ اور شکور مسکرا دیا۔

"اچھا! ایک بات بتائیں۔ آپ نے نیلم کی مدد کیوں کی......؟ اور کس شرط پر کی تھی؟" اپنے دماغ میں کلبلاتے سوالوں کے جواب کے لیے اس نے بات بدل دی۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑا تھا۔" یہ ہمارے پڑوس کا معاملہ تھا اور اگر وہ نیلم کے ساتھ مخلص ہوتا۔ تو کوئی بات بھی تھی۔ مگر اسے تو جہاں بھی موقع ملا۔ اس نے یہی کام کیا۔ بہت ساری لڑکیوں کو وہ پہلے ہی بلیک میل کر رہا تھا۔ نیلم کی صورت میں اسے، اسی کے گھر میں رہنے کا موقع مل جاتا۔ اسی لیے وہ زیادہ پکی ہو گیا تھا۔ بس اس کے ساتھ رہنے والوں پر بہت محنت کرنی پڑی۔ تب جا کر اس کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ اور یہ معلوم ہوا کہ یہ صاحب تو چار بچوں کے باپ ہیں۔ پکی انفارمیشن کے ساتھ پولیس والوں نے پکڑا ہے۔"

شکور نے فخریہ انداز میں کالر کھڑے کیے تھے...... اور شہلا اسے ہنستا دیکھ کر یہ سوچ رہی تھی کہ شکور کا صرف نام ہی پرانا ہے۔ کام تو سارے نئے زمانے کے لڑکوں والے ہیں۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو......؟" وہ اس کے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرا کر بولا۔

"کچھ نہیں! آپ نے اپنی شرط کے بارے میں نہیں بتایا۔ کیا آپ نے اسے شاہ رخ سے شادی کرنے کا کہا تھا۔" آنکھوں میں اشتیاق لیے پوچھا تھا۔

"نہیں! بلکہ میں نے شاہ رخ کو راضی کیا تھا۔

UrduBooks.pk

کہ وہ پرانی تلخیاں بھول کر نیلم کو اپنا لے۔''

''کیا نیلم کو یہ بات معلوم تھی۔'' اس نے بے قراری سے پوچھا۔

''ہاں! میں نے نیلم سے کہا تھا کہ اگر تمہیں تمہاری غلطیوں کے باوجود بھی شاہ رخ اپنانا چاہے تو کیا تم مان جاؤ گی۔ تو اس نے مجھے جواب دیا کہ ہاں بس میری جان اس شخص سے چھڑوا دیں اور میں نے اس کی جان چھڑوا دی۔'' وہ پھر فخریہ لہجے میں بولا۔

''پھر اس نے مجھے یہ کیوں کہا کہ اس کی شادی شکور سے ہو رہی ہے۔'' اب اس نے شکور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ اور چہرے کا رخ پھیر لیا۔ تاکہ وہ اس کے بہنے والے آنسو نہ دیکھ سکے۔

اور شکور کے اندر چھناکے سے کچھ ٹوٹا تھا

''تمہاری اس سے کب بات ہوئی تھی؟'' وہ بوکھلا کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا تھا۔

''آپی کا ہاتھ جل گیا ہے۔ شمائل نے ہی بتایا تھا۔ شہلا کا موبائل بھی اسے کچن سے ہی ملا تھا۔ ریسیو کال میں آخری نمبر نیلم کا ہی تھا۔''

اب شکور سمجھ گیا تھا کہ اس کا ہاتھ کیسے اور کیوں جلا......؟ اس کے بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیاں متاثر ہوئی تھیں۔

''آئی ایم ریئلی سوری دراصل میں نے ہی اسے کہا تھا کہ وہ تمہیں ایسا کہے۔'' وہ سر جھکا کر بولتے ہوئے کارپٹ پر بیٹھ گیا تھا جبکہ وہ بیڈ کے کنارے ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی۔

''جب میرا نام کسی کے منہ سے بھی سننا پسند نہیں کرتیں تو انگوٹھی کیوں واپس کی تھی......؟'' بیڈ پر کہنی ٹکائے اس نے پوچھا تھا۔

''میں سمجھی۔ آپ مجھے پسند نہیں کرتے۔'' وہ بولتے ہوئے اٹکی۔

''یہ رشتہ میری ہی رضامندی سے ہوا تھا۔ اور مجھے لگا کہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ہمیں اسی طرح رہنا چاہیے۔ مگر تمہاری بے وقوفی نے سارا کام خراب کر دیا۔'' نرم لہجے میں بولتے بولتے آخر میں اس نے منہ کڑوا کر ہی کر لیا تھا۔

''آپ نے کسی کو یہ بات بتائی تو نہیں؟'' اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''نہیں! بتا کر مجھے اپنی منگنی ختم نہیں کرنی تھی۔ ویسے بھی یہ بات ڈھائی لوگوں کو معلوم ہے۔''

''ڈھائی لوگ؟ کون'' وہ الجھی۔

''ایک میں دوسری شہنیلا اور آدھی تم......'' وہ رعب سے بولا۔

''میں آدھی کیوں؟''

''کیونکہ تم اپنے آدھے دماغ کا استعمال کرتی ہو۔''

''اور آپ بددماغ ہیں۔'' وہ بدکی تھی۔

''جب جا رہے تھے......تو مجھے اپنے ساتھ نئے گھر بھی نہیں لے کر گئے۔ باقی سب نے دیکھ لیا......سوائے میرے'' وہ روٹھی۔

''ثابت ہو گیا نا کہ تم آدھے دماغ کا استعمال کرتی ہو۔''

''کیسے......؟''

''ایسے ہی لے جاؤں۔ بغیر بینڈ باجے کے۔'' وہ شوخ ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا شہنیلا اندر آئی۔

''بھائی! میں نے آپ کو خیریت پوچھنے کے لیے بھیجا تھا۔ پاکستان کا سالانہ بجٹ بنانے کے لیے نہیں۔ گھر کے سارے بزرگ نیلم کے گھر دوبارہ جا کر واپس آ رہے ہیں اس لیے یہاں سے جائیں۔'' شہنیلا نے اسے دروازے کا راستہ دکھایا۔

''میری رنگ۔'' وہ چیخی۔

''یہ لو......اپنی رنگ سنبھالو۔'' وہ مخملی ڈبیا بیڈ پر پھینک کر چلا گیا۔

''شہنیلا! تمہارا بھائی اتنا سڑیل کیوں ہے؟'' وہ بڑبڑائی۔

''اور شہلا تمہارے اتنے شکوے کیوں ہیں؟'' شہنیلا نے اسے آنکھیں دکھائیں اور پھر دونوں مل کر ہنسنے لگیں۔

*

سدرۃ المنتہیٰ

وہ میری آخری محبت تھی

سلیٹی بادلوں سے ڈھکے آسمان تلے، نیل رنگ پانیوں پر تیرتے، بچھے ہوئے پھولوں سے لے کر پانی میں پھینکے کنکر کی وجہ سے بنتے ہوئے بھنور نما دائروں میں بھی عکس تھے۔

اس کی یادیں تھیں

اور باتیں تھیں...... بے پناہ

وہ سگریٹ جلا کر تالاب کے کنارے کھڑے تھے...... پیچھے سے تارہ آئی تھی، جھلاتا ہوا لہجہ اور کچھ خفا خفا سا بھی۔

''آپ تالاب کو سگریٹ کے دھوئیں سے آلودہ کر رہے ہیں۔''

وہ مڑ کر دیکھنے لگے اس کی جانب اور مسکرا دیے۔

''میں خود آلودہ ہو چکا ہوں اندر سے، میرے اندر آلودگی ہی آلودگی ہے۔''

''آپ بھی اپنے سیوریج سسٹم کو ٹھیک کرنے والے دوست شوقین خان جیسی باتیں کر رہے ہیں منیب بھائی۔''

''شوقین خان تمہیں یاد ہے؟'' وہ مسکرا کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

مکمل ناول

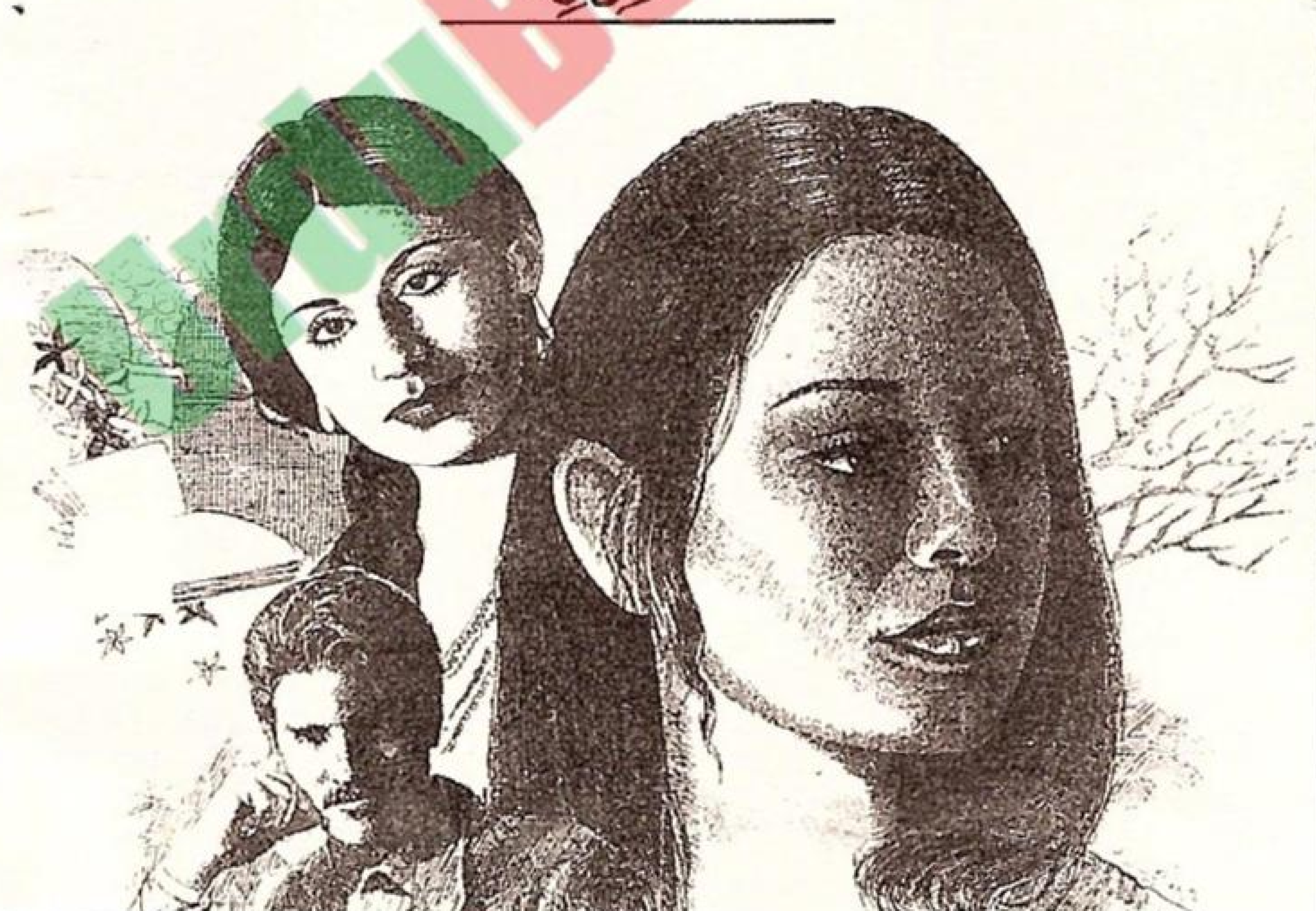

Saba

دوسری کرسی ابھی خالی تھی جس پر سے کچھ دیر پہلے ماہ روز اٹھ کر گئی تھی۔

تارہ کو پتا تھا ان دونوں کے درمیان صرف اس کے موضوع پر بات ہوئی ہوگی۔

تب ہی اندر آ کر ماہ روز کا رویہ کچھ عجیب تھا۔ الجھا ہوا پیچیدہ۔ اس کے نام کی طرح بے معنی یا پھر دہرا۔ وہ یہ سب اس سے کہہ نہ سکی۔ بس سوچتی رہی اور انتظار کرتی رہی کہ ماہ روز اس کے ساتھ کچھ بات کرے گی۔ کچھ کہے گی۔ کچھ پوچھے گی۔ عجیب اجنبی سا رویہ اپنایا ہوا تھا۔ جب سے تارہ اور ماہ روز کے درمیان بحث ہوئی تھی۔ تارہ مزید کشمکش و پیچ میں پڑ گئی تھی۔

ماہ روز کا رویہ مزید اکھڑا سا ہو گیا تھا۔ امی الگ خفا تھیں۔

اور بابا اسے بہلانے کی کوششوں میں مگن تھے۔ سب اسے خود سر اور لاپروا سمجھ رہے تھے۔ سب اسے اسے ضدی اور احمق سمجھ رہے تھے اور اسے لگ رہا تھا کہ کوئی اسے ابھی تک سمجھ نہیں پایا اور پھر کس کو سمجھاتی۔ ایک منیب بھائی تھے جو تب سے اسے جانتے تھے جب وہ پانچویں میں تھی اور جب اس کا ربڑ گم ہوتا تو بھی منیب بھائی کو پتا چل جاتا۔ شاپنر ٹوٹتا تو بھی ان ہی کو معلوم ہوتا۔ پنسل گم ہوتی تو بھی ان کو بتانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اور بغیر کچھ کہے چیزیں اس کی میز پر آ جاتیں۔ بستہ، کلر پنسلز اور ڈرائنگ بکس سے لے کر ٹیکسٹ بکس تک بھر دیا جاتا۔

یہاں تک کہ رات کو سوتے میں بار بار اٹھنے پر جو اسے بے وقت کی بھوک لگتی تھی اس کا علاج بھی موجود تھا کہ روزانہ بغیر یاد دلائے اس کے بستر پر تکیے کے پاس ایک بسکٹ کا چھوٹا پیکٹ موجود ہوتا اور رات کو اٹھ کر پانی کا گلاس لے کر وہ دو گھونٹ پانی پیتی اور بسکٹ کھاتی اور ماہ روز اسے برا سا منہ بنا کر ندیدی پیٹو بلی کہتی دوبارہ لیٹ جاتی۔ اپنے کمرے میں چین کی نیند سوتے ہوئے بھی اسے یقین ہوتا کہ منیب بھائی خوش ہو رہے ہوں گے کہ تارہ ان کے لائے ہوئے بسکٹ کھا رہی ہے اور یہ یقین مزید ان کی چہیتی ان سے عمر میں سات سال چھوٹی تارہ کو اور سر چڑھا جاتا، مغرور سا کر دیتا اور قدرے لاپروا۔۔ بھی۔

وہ اپنی ہر پریشانی منیب بھائی کے پاس لے کر آتی بلکہ لانے کی کیا نوبت آتی، وہ تو پہلے سے اس کے پاس موجود ہوتے۔ تارہ روئی اور وہ پریشان ہوئے۔ امی نے تارہ کو ڈانٹا تو وہ فکر مند ہو گئے، اس کی دل جوئی میں لگ گئے۔ تارہ نے کسی چیز کو پسندیدگی سے دیکھا اور وہ اس چیز کے حصول کی تگ و دو میں لگ گئے۔

البتہ تارہ نے اگر غلط چیز چنی تو تارہ سے پہلے وہ اندیشوں میں گھر جاتے۔ افسردہ ہو جاتے، یہاں تک کہ تارہ کو ہاتھ اٹھانا پڑتا۔ کسی کو کچھ منوانا ہوتا تارہ سے تو فریاد منیب بھائی کے پاس لے جائی جاتی۔ تارہ بھائی کو انکار نہ کر پاتی اور منیب بھائی تارہ کو ہر جگہ بچانے پہنچ جاتے۔ یوں تو ماہ روز بھی تھی جو تارہ سے چودہ مہینے عمر میں چھوٹی تھی خیال اس کا بھی رکھتے تھے چیزیں تو اسے بھی لا دیتے تھے مگر تارہ کے ساتھ ایک الگ طرح کی انسیت تھی۔ تھی۔

ایک تارہ اور ایک منیب بھائی، باقی سب دنیا دوسری طرف۔ یہی وجہ تھی کہ منیب بھائی جنہیں پیار سے وہ منی بھائی کہتی تھی اور ماہ روز جنہیں چڑانے کی خاطر منی بیگم کہا کرتی، وہ جب تک چڑتے رہے ماہ روز چڑاتی رہی۔ جب اس کے ساتھ خود بیٹھ کر ہنسے تو اس نے کہنا چھوڑ دیا۔

اور یہ فارمولا بھی خیر سے تارہ کا عطا کردہ ہی تھا جو کام آیا وہ تارہ کے لیے تب ہی سے اہم تھے اور سگوں سے زیادہ سگے تھے۔ یہ ایک الگ کہانی تھی کہ منیب بھائی نے کیسے ان کی زندگی میں اپنی جگہ بنائی تھی اور جب بن گئی تو ہر جگہ وہی تھے۔ ابو کے پیارے بیٹے، امی کے چاند، ماہ روز کے اسکواش

UrduBooks.pk

پارٹنر، اچھے دوست اور تارہ کے لیے ماں باپ کی طرح تحفظ۔ چھاؤں جیسے پُرسکون اور محبت جیسے میٹھے مہربان اور حساس۔

اسے پتا تھا وہ اس کی وجہ سے خاصے فکر مند ہیں۔ چپ ہیں۔ باوجود اس کے ان کی آنکھیں بولتی ہیں جو اربیہ کی وجہ سے پہلے ہی اداس رہا کرتی تھیں، ان میں تارہ کا دکھ مل جائے تو مزید افسردہ نظر آنے لگتی ہیں۔

وہ کئی دن سے ان کی خاموشی ملاحظہ کر رہی تھی۔ گھر میں اب تک سب اس سے اس موضوع پر بات کر چکے تھے اور وہ خاموش تھے۔ مگر تارہ اب چاہتی تھی کہ وہ اس سے بات کریں۔ پوچھ لیں۔ جتنے سوال ان کے ذہن میں اس کے لیے ہیں۔ سامنے آجائیں لیکن ان کی چپ تھی کہ ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہی۔

تب ہی وہ ماہ روز کے جاتے ہی باہر نکل آئی۔

حالات کی برہمی سے آخر کس حد تک بھاگا جائے گا۔ کیا کچھ سہا جائے۔ وہ آلودگی والی بات کہہ کر خود ہی ہنسنے لگے تھے۔

"کل شوقین کا فون آیا تھا تمہیں پتا ہے؟"

وہ اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے تھے۔

"مجھے پتا ہے۔ مگر یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ اس وقت مجھ سے شوقین کے موضوع پر بات نہیں کرنا چاہیں گے اور نہ ہی میں اس کی اور اس کی بیوی کے جھگڑوں کی ہمیشہ والی کئی بار سنی ہوئی داستان دوبارہ سننا پسند کروں گی۔"

وہ چاہ رہی تھی، وہ اب موضوع پر آجائیں۔

"کہہ تو ٹھیک رہی ہو مگر حیران کن اور اچھی بات یہ ہے کہ اس قدر جھگڑوں کے باوجود بھی وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں ایک بار بھی انہوں نے علیحدگی کا نہیں سوچا حالانکہ میں نے انہیں کہا بھی۔ اب روز روز کے جھگڑوں اور تلخیوں سے بہتر ہے کہ بندہ اپنے لیے کچھ الگ بندوبست کرلے اور سکون سے رہے۔ مجھے تو ان دونوں کی لڑائی بھی کبھی کبھار محبت کا ایک اظہار ہی لگتی ہے۔"

انہیں پتا تھا اس جملے پر وہ اچھلے گی۔ وہ ناگواری سے دیکھنے لگی۔

"آپ کے اپنے ـــــ فلسفے ہیں۔ کتابیں زیادہ چڑھ گئی ہیں آپ کے دماغ پر شراب کے نشے سے زیادہ کتاب کا نشہ خطرناک ہوتا ہے۔"

وہ تلخی میں بھی کبھی کبھار بہت اچھا بولتی تھی۔ وہ بڑے دل سے مسکرادیے۔ دل چاہا ہنسنے بھی لگ جائیں۔

"کیا بات کردی تارہ! غضب ہو تم بھی۔"

"میں تو غضب ہوں۔ آپ عجب بننے کی کوشش نہ کریں۔ کہہ دیں جو آپ کو مجھ سے کہنا ہے اور جو کچھ آپ سوچ رہے ہیں۔"

"تمہارے دماغ میں منفی اثرات کا ڈھیر جمع

بیوٹی بکس کا تیار کردہ
Herbal
سوہنی شیمپو
SOHNI SHAMPOO

اس کے استعمال سے چند دنوں میں خشکی ختم
گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
قیمت -/120 روپے
رجسٹری سے منگوانے پر اور منی آرڈر سے منگوانے والے
دو بوتلیں -/300 روپے تین بوتلیں -/400 روپے
اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔
بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ
بیوٹی بکس 53، اورنگزیب مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ، کراچی۔
دستی خریدنے کے لیے:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار کراچی۔ فون نمبر 32216361

UrduBooks.PK

ہو گیا ہے تارہ! اسے نکالو، صفائی کرواپنے ذہن کی۔"

"نہیں کرنی۔ جب دل کی صفائی نہ ہو سکے تو ذہن کی صفائی کس کام کی بھلا۔"

"دل کا کیا معاملہ ہے تارہ؟" ان کے پوچھنے کا انداز بھی عجب تھا۔

"دل کا معاملہ بہت برا ہے منی بھائی! دکھ دیتا ہے، تھکاتا ہے۔" وہ بھی ان ہی کے انداز میں بولی۔

"وہ تم سے بہت پیار کرتا ہے تارہ!"

"مجھ سے تو بہت سارے لوگ پیار کرتے ہیں بھائی۔ امی، ابا، ماہ روز، آپ...... جو مجھے ٹھیک سمجھتے ہیں وہ بھی اور جو غلط سمجھتے ہیں وہ بھی۔"

"تارہ! میں اس وقت صاد کی بات کر رہا ہوں صرف......"

"منیب بھائی! وہ شخص ایسا ہے کہ اس کی محبت پر تھوکا جائے۔"

"اس قدر تلخی......" وہ حیران ہوئے۔ "تم نے آج تک ایسی زبان استعمال نہیں کی تارہ!" افسوس حق بجانب تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔

"میں نے آج تک ایسا نہیں کہا منیب بھائی! کیونکہ آج تک میں نے صاد خان کو نہیں جانا تھا۔"

"تم اس سے بدگمان ہو گئی ہو تارہ!"

"میں نہیں ہوئی بدگمان منیب بھائی!"

"دیکھو وہ تمہارے ہاتھ کا بنا ہوا ناشتہ کھاتا ہے۔ رات کو تمہارے بغیر ڈنر نہیں کیا کرتا۔ گھر آکر سب سے پہلے تمہاری صورت دیکھنا چاہتا ہے اور تمہاری ساری ضروریات تمہارے کہنے سننے سے پہلے پوری کر دیا کرتا ہے۔ تمہیں ایک اچھا خرچا دیتا ہے۔ سونے سے پہلے تم سے پورے دن کی روداد پوچھتا ہے اور تمہاری کسی بے تکی بات پر بھی دیر تک ہنستا رہتا ہے۔ بے وجہ مسکرا کر تمہیں دیکھتا ہے۔ وہ چیز ڈائننگ ٹیبل پر نہیں رکھتا جو تمہیں ناپسند ہو، یہاں تک کہ اس نے سگریٹ پینا کم کر دی ہے۔ اگر ایک آدھ پیتا ہے تو بیڈ روم سے باہر پیتا ہے۔ وہ تمہارے کمرے کو آلودہ نہیں کرتا۔ یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ وہ تم سے ۔۔۔ بے حد، بے حساب محبت کرتا ہے اور کس قدر افسوس کی بات ہے بلکہ نہیں یہ دکھ کی بات ہے کہ تم نے کہا ہے کہ تم صاد خان کی محبت پر تھوکتی ہو۔ مجھے تو شدید دکھ ہوا ہے یہ سن کر۔" انہوں نے کہتے ہوئے سگریٹ بری طرح کرسی کی ہتھی سے مسل دی تھی اور پلاسٹک کی کرسی کی ہتھی پر ایک چھوٹا سا گول سیاہ دھبہ پڑ گیا تھا۔

ایسے دو چار دھبے اور بھی تھے اس کرسی کی ہتھی پر۔ ماہ روز نے کئی بار انہیں ایش ٹرے ہاتھ میں تھمائی تھی مگر بے سود اور تارہ نے کئی بار سگریٹ کے دھوئیں کی وجہ سے کھانستا تھا۔ ناگواری ظاہر کی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ وہ سگریٹ اس کے سامنے کم پیتے تھے اور تب ہی انہوں نے شادی کے شروع کے دنوں میں صاد کو کہا تھا کہ اگر بیڈ روم کی سلامتی چاہتے ہو تو کمرے کو آلودہ مت کرنا اور صاد نے بھی کسی سعادت مند بچے کی طرح ان کی یہ بات باندھ لی تھی گرہ سے۔

"وہ مجھے پسند کرتا تھا منی بھائی! محبت بہت دور کی بات ہوتی ہے، اگر اسے ہوتی تو انتشار نہ پیدا ہوتا۔"

"نہیں تارہ! ایسا نہیں ہے۔ تم بہت کم ظرفی کر رہی ہو۔ اپنے ظرف کو بڑا کرو۔ یہ بتاؤ جس دن تم گھر سے نکل رہی تھیں اس دن اس نے تمہارے ہاتھ کا بنا ہوا ناشتہ نہیں کیا؟" وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"تم نے بنایا تھا؟" وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

"رات ڈنر نہیں کیا تم دونوں نے ساتھ؟"

"نہیں کیا۔" وہ بولی۔

"سونے سے پہلے بات نہیں ہوئی؟"

"ہوئی تھی۔"

منیب کی سانس کچھ بحال ہوئی۔

"کیا بات ہوئی تھی؟"

"صرف ایک بات ہوئی تھی منیب بھائی!"

"اور وہ کیا؟"

''اور وہ یہ کہ...... ہم ایک دوسرے کے ساتھ نہیں چل سکیں گے۔ ہمیں چاہیے، ہم الگ ہو جائیں۔ اسی میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔''

''یہ تین جملے اس نے کہے تم سے؟'' وہ حیران تھے۔

''جی۔ اس نے کہے۔'' تارہ کا لہجہ اس بار بے تاثر تھا۔

''پھر تم نے کیا کہا؟''

''کچھ نہیں۔''

''کچھ بھی نہیں؟''

''اس نے دریافت نہیں کیا؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''اس کی ضرورت محسوس نہیں کی ہوگی اس نے...... کیونکہ وہ اپنی بات کر چکا تھا۔''

''اس سے پہلے کیا ہوا تھا تارہ؟ یہ تین جملے کہنے سے پہلے کیا ہوا تھا؟''

''مجھے تو صرف یہ یاد پڑتا ہے منی بھائی کہ اس نے اچانک ہی بات کرتے کرتے سوچ میں پڑ جانا شروع کیا تھا۔ پھر اس کا رویہ کچھ اجنبی سا ہونے لگا۔ پھر وہ بیڈ روم میں سگریٹ پینے لگا، مجھے کھانسی ہونے لگی اور وہ سگریٹ بجھاتا نہیں تھا۔ میں کمرے سے باہر نکل جاتی تھی، وہ بلاتا نہیں تھا۔ آدھی رات تک سگریٹ پھونکتا رہتا۔ صبح کے قریب جب میں کمرے میں آتی تو وہ سویا ہوتا اور پورا کمرہ سگریٹ کی بو سے بھرا ہوتا تھا۔'' تارہ کے لہجے میں افسوس تھا جو دکھ میں تبدیل ہوا تھا اور وہ خود بھی دکھ میں ڈوب گئے تھے۔

''تم نے اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی؟'' وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے پوچھنے لگے اور تارہ اتنی دیر میں پہلی بار ہنسی۔ وہ اور مایوس سے ہوئے اس کی ہنسی سے۔

''پھر کیا ہوا؟'' کس ضبط سے پوچھ رہے تھے۔ ان کے ساتھ تارہ کو بھی اندازہ تھا۔

''پھر یہ ہوا کہ اس نے وارڈ روب کا وہ حصہ کھول دیا جس حصے میں میرے کپڑے رکھے تھے اور سامنے ایک سوٹ کیس خالی کھلا تھا۔'' تارہ کا لہجہ تاریک ہو گیا اور منیب کا چہرہ۔

''اور میں نے وارڈ روب سے صرف وہ کپڑے نکالے جو میرے خریدے ہوئے تھے یا پھر میرے والدین نے خریدے تھے۔ اپنی ضرورت کی چیزیں ہینڈ کیری میں رکھیں۔ وہ کھڑا رہا، دیکھتا رہا۔''

''اس نے تمہیں روکا نہیں؟'' یہ سوال کرتے ہوئے منیب کا جیسے دل رک رہا تھا۔

''وہ مجھے کیوں روکے گا منیب بھائی! اسے اگر روکنا ہوتا تو وہ وارڈ روب کا دروازہ کیوں کھولتا۔ وہ میز پر جیب سے نوٹ نکال کر کیوں رکھتا۔ وہ مجھے سامان پیک کرتے ہوئے دیکھ کر چپ کیوں کھڑا رہتا اور پھر وہ باہر نکل کر ڈرائیور کو یہ کیوں کہتا کہ بیگم صاحبہ کو گھر چھوڑ آؤ۔''

''تم نے کچھ نہیں کہا اس سارے دورانیے میں؟''

تارہ نے آنکھوں کے گوشوں میں اٹکا پانی کا قطرہ بہنے دیا۔

''میں نے بس ۔ارڈ روب میں پڑی اس کی دلائی چیزیں وہیں رہنے دیں۔ میں نے اس کے دیے گئے پیسے ٹھکرا دیے۔ مجھے اس کی دی گئی بھیک کی ضرورت نہیں تھی۔ میں سامان لے کر اس کی گاڑی کے بجائے کیب میں چلی آئی حالانکہ اس کی گاڑی اسٹارٹ کھڑی تھی۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔''

وہ فکر مندی سے اسے دیکھنے لگے۔

''حالانکہ احتجاج تمہارا حق تھا۔''

''احتجاج۔'' وہ پھر سے ہنس پڑی۔ آنسوؤں سے بھری آواز کی ہنسی۔

''وہ وہاں ہوتا ہے جہاں پروا ہو۔''

''تمہارا اس کے ساتھ رشتہ تھا تارہ!''

''اس کا بھی میرے ساتھ رشتہ تھا منیب بھائی! اس نے اس رشتے کا پاس نہیں رکھا۔ میں اکیلے کیسے

UrduBooks.pk

اس رشتے کا پاس کرتی۔ کیسے کرتی بتائیں۔ یک طرفہ کچھ نہیں ہوتا' یہ آپ کو بھی معلوم ہے۔''

''تمہارے آنے کے بعد اس کی کوئی کال؟ کوئی میسج؟ کوئی اشارہ؟''

اس بار بھی تارہ کا دل چاہا وہ اس سوال پر ہنس دے مگر ہنس نہ سکی۔

''وہ اس قابل نہیں کہ میسج کرے، کال کرے۔ کوئی اشارہ دے' وہ اس قابل ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ جیسے وہ چھوڑتا ہے' اسے توڑ دیا جائے۔ جیسے وہ توڑ دیتا ہے، اس کی محبت پر تھوکا جائے۔ جیسے اس نے میری محبت پر تھوکا۔'' اور اس کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ اُمڈ کر نکلے جو اس نے بے دردی سے رگڑ دیے تھے۔

''محبت بہت بری چیز ہے۔ یہ ایک فریب ہے۔ یہ ایک دھوکا ہے۔'' وہ اندر چلی گئی اور منیب جیسے دھند میں رہ گئے۔ کچھ لمحوں بعد اٹھے۔

زمین پر گرے ہوئے سگریٹ کے بجھے ٹوٹے پر پاؤں رکھ کر آگے بڑھ گئے۔ اندر ماہ روز بھی دروازے کے پاس ہی۔ انہیں پتا تھا وہ پوچھے گی کہ دونوں کے درمیان کیا بات چیت ہوئی ہے۔ بجائے اس کے اس نے کہا۔

''منیب بھائی! آپ کا لیٹر آیا ہے۔''

''کدھر ہے؟''

''میرے پاس۔'' ہاتھ میں تھا۔

''کس کا ہے؟''

''آپ کی محبوبہ کے منگیتر کا۔''

''پڑھے بغیر پھاڑ دو۔'' کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

''پڑھ لیا۔'' وہ وہیں رکی تھی۔

''کیا لکھا ہے؟'' وہ بغیر مڑے رکے۔

''آپ کی محبوبہ اور اس کا منگیتر شادی کر رہے ہیں آپس میں۔''

وہ لمحہ بھر ہی رکے تھے۔ پھر اتنا کہا کہ

''پھاڑ دو۔''

''یہ کام آپ کا ہے۔'' وہ خط لیے کھڑی تھی۔

''تم کر دینا۔''

''میں تارہ نہیں ہوں۔'' وہ وہیں کھڑی تھی۔

خط کو کچن کاؤنٹر پر رکھا۔

''تم ماہ روز ہو۔ اسے پھاڑ سکتی ہو۔ پھاڑ دو۔'' وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔

''تارہ نے صاد کی محبت پر تھوکا ہے۔'' ماہ روز نے خط کے اوپر وزن رکھا اور ان کے پیچھے آئی۔

''تو......؟'' وہ مڑے، اس بار چہرہ دھواں تھا ان کا۔ ماہ روز یہی دیکھنا چاہتی تھی۔

''تو مطلب کہ وہ واپس نہیں جائے گی۔''

''اسے نہیں جانا چاہیے بلکہ صاد کو چاہیے کہ وہ اسے منانے آئے۔''

''وہ منانے نہ آیا تو؟''

''تو وہ نہیں جائے گی۔''

''مگر وہ نہیں گئی تو مر جائے گی منیب بھائی! محبت کرتی ہے وہ صاد بھائی سے۔ بکتی ہے کہ تھوکتی ہوں۔''

''یہ فیصلہ اسے خود کرنے دو۔''

''آپ چاہتے ہیں کہ اس کا گھر بگڑ جائے؟''

''نہیں ماہ روز! میں چاہتا ہوں کہ گھر کے ساتھ اس کا دل بھی آباد ہونا چاہیے۔ وہ اس کا دل برباد کر رہا ہے۔''

''اس سے بات کرنی چاہیے منیب بھائی!''

''فضول ہے ماہ! وہ اس پوزیشن میں نہیں۔ اس وقت بات کرنے سے بات بگڑے گی۔''

''بات چاہے بگڑے یا بنے۔۔ مگر اسے پتا لگنا چاہیے کہ اس نے جو تارہ کے ساتھ کیا ہے، وہ سب اسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔''

تارہ نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے ماہ روز کی آواز سنی۔ یہ وہی ماہ روز تھی جو کچھ دیر پہلے اسے برا بھلا کہہ رہی تھی۔ لڑ رہی تھی کہ گھر چلی جاؤ اور اس وقت وہ اس کی طرف داری میں لگی ہوئی تھی۔

یہ اس کی بہن تھی۔ تارہ کے اندر ایک احساس

UrduBooks.PK

اجاگر ہوا۔

''میں اس سے بات کروں گا۔''

''مگر بات کرنے کے لیے اس کے سامنے گیا تو کہیں اسے اکھاڑ نہ پھینکوں۔ دل چاہتا ہے ابھی جا کر اس کی خبر لوں اور لیتا اگر وہ تارہ کے ساتھ اتنے مضبوط رشتے میں نہ بندھا ہوا ہوتا۔ اس وقت ہمارا کوئی بھی عمل تارہ کی زندگی پر اثر انداز ہو سکتا ہے ماہ!''

''آپ گھر میں رہیں۔ امی ابو بھی چپ رہیں، اب میں اسے اکھاڑ کر آؤں گی اس کی جڑوں سمیت۔''

''تم وہاں نہیں جاؤ گی ماہ!''

''پھر کون جائے گا؟''

''ہم اسے بلاتے ہیں۔''

''ایک ٹیبل پر بیٹھ کر بات کریں گے۔'' اس نے سوچا۔

''چور کبھی عدالت میں پیش نہیں ہوتا منیب بھائی! چور پر چھاپا ڈالنا پڑتا ہے، وہ چور ہے، مجرم ہے۔ خود نہیں آئے گا، آپ جائیں اس کے گھر۔ وہ بھی بغیر بتائے۔''

''بغیر بتائے؟''

''ہاں بغیر بتائے تاکہ وہ فرار نہ ہو سکے۔''

''بغیر بتائے تو ڈاکو جاتے ہیں ماہ! تم چاہتی ہو میں اس کے گھر پر ڈاکا ڈالوں؟''

''ہاں میں چاہتی ہوں آپ چور کے گھر پر ڈاکا ڈالیں۔''

وہ مسکرائے تھے۔

''میں اس کے لیے ڈاکو بن جاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ کل ہی جاتا ہوں۔''

''اور خط کا کیا کروں؟''

''میرے ساتھ دوبارہ خط کی بات مت کرنا ماہ!'' کہتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ گئے۔ اوپر امی ابو کے کمرے کے ساتھ ان کا بھی کمرہ تھا۔

ماہ روز کچن کاؤنٹر تک آئی اور اس نے خط اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ خط کے اندر کوئی متبرک لفظ نہیں تھا۔ صرف اور صرف طوفان تھا

☆☆☆

''میں اسی لیے پسند کی شادی کے خلاف تھی۔'' مسز شہروز خفا سی بیٹھی تھیں۔ جب صاد گھر آیا۔

''مجھے معلوم تھا کہ ایسی شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں۔''

ان کی اپنی مثال سامنے تھی۔ جب ان کی پہلی شادی ناکام ہوئی تھی اور دو بچوں کو لے کر وہ کتنی اپ سیٹ ہو گئی تھیں۔ چھ سال میں علیحدگی ہو گئی تھی۔ وجہ ان کے شوہر کے بڑھتے ہوئے شکوک و شبہات تھے۔ وہ ایک بیمار ذہن آدمی کے ساتھ آخر کب تک گزارا کرتیں۔ سو خلع لے لی اور بچوں کو لے کر آ گئیں۔ شہروز صاحب ان سے عمر میں دس سال بڑے تھے اور اس وقت پینتالیس کے لگ بھگ تھے جب ان کی شادی ہوئی تھی شہروز سے انہیں صرف ایک بیٹا تھا صاد خان۔ اکلوتا، لاڈلا نخریلا سا، جس میں شہروز خان کی جان ہوتی تھی۔

مگر ان کے بچوں عمیر اور نایاب کو بھی انہوں نے صاد جتنا نہ سہی مگر پیار ضرور دیا تھا۔ یہاں تک کہ پڑھا لکھا کر ان کی شادیاں تک کرائیں۔

اسی دن سے مسز شہروز نے سوچ لیا کہ شادی کا فیصلہ ہمیشہ دانش مندی سے کرنا چاہیے۔ دونوں بچوں کی اپنی مرضی سے شادی کرائی تھی۔ عمیر کی ملازمت دوسرے شہر تھی، وہ شادی کے بعد بیوی کو لے کر وہیں شفٹ ہو گیا۔

چھٹیوں میں ملنے آتا تھا۔ ایک بھرپور خوش گوار زندگی گزار رہا تھا۔ نایاب کی بہت کم عمری میں شادی کر دی کیونکہ ان کے اندر وہی خدشہ بیٹھ گیا تھا جو ان کی ماں کے اندر بھی پلتا تھا کہ لڑکی کی عمر جتنی بڑھے گی۔ وہ اتنی لاپروا، خودسر اور ضدی ہو جائے گی۔

دوسرے معنوں میں باشعور اور بااختیار ہو جائے گی۔ یہ عمر نایاب پر آنے ہی نہ دی، کم عمری میں شادی کے فائدے اس کے ذہن میں ڈالے اور

بیاہ دیا، کچھ تو وہ تھی بھی معصوم سی پھر سترہ کی عمر میں جب شادی ہو کر گئی تو سسرال میں بھی ایڈجسٹ ہوگئی۔ یہ الگ بات تھی کہ اس ایڈجسٹمنٹ میں اسے کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

مگر بہرحال میاں نے جب شعور سنبھالا تو بیوی کا طرف دار بنا اور کچھ حالات بہتر ہوئے۔ اپنے تئیں انہوں نے اپنے کندھے سے دونوں بچوں کا بوجھ اتار دیا تھا۔

اب تیسرا صاد تھا جو تھا ہی ہتھیلی کا چھالا۔ اس کے لیے لڑکیوں کی کیا کمی تھی۔ پھوپھی، خالہ، چاچو سب ہی دینے کو تیار۔

خاندان بھر کی اس گورے چٹے تیکھے نقوش والے مضبوط قد کاٹھ اور خوش شکل خوبرو نوجوان پر نظر۔ سونے پہ سہاگہ اس کی تعلیم، ذہانت، ڈگری اور ادب و آداب۔ جس پر خوبروئی خوب۔ جچا کرتی اور کون نامہربان ہوتا۔

مسز شہروز دل ہی دل میں یا اللہ کرم کی تسبیح کرتی رہتیں۔ ارادہ تو اس کے لیے بھی یہی تھا کہ والدین کی مرضی سے کرے مگر شہروز صاحب نے شادی کے فیصلے کا اختیار پوری طرح بیٹے کو دیا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب تک جب اس کے بہن بھائی دس بارہ سالہ بچوں کے والدین بن بیٹھے تھے۔ وہ اکتیس سال میں کنوارا تھا۔ شہروز صاحب بہت کمزور ہوگئے تھے۔ بزنس صاد کے حوالے کر دیا تھا اور اب وہ بھی چاہتے تھے کہ صاد شادی کرلے جب کہ صاد نے پچوکی بیٹی چھوڑی۔ پھوپھی خود چل کر آئیں اور اس نے سب کے سامنے انکار کر دیا ماں لرز گئیں۔ بیٹے کی مجال دیکھ کر سمجھانا چاہا مگر شوہر کا دیا گیا اعتماد جو بیٹے کو ملا تھا سو کام کر گیا۔

دونوں بھائیوں میں خاندانی دشمنی پڑ گئی۔ پھوپھی، خالہ سب کی بیٹیوں کو مسترد کر دیا۔ اللہ جانے اس کی کیا ڈیمانڈ تھی۔

ماں، خائف باپ فکر مند تھے کہ اچانک ایک روز وہ گھر آیا اور ماں سے فقط اتنا کہا کہ ان صاحب کے گھر جانا ہے۔ پہلے نمبر کی بیٹی ہے ان کی تارہ۔ اس کے لیے رشتہ ڈالنا ہے۔

باپ کے لیے یہی غنیمت تھا کہ بیٹا شادی کر رہا ہے اور ماں اندر تک ہول گئی کہ لڑکی کون ہوگی۔ کیسی ہوگی۔ کہاں سے آئی۔ صاد کو کیسے ملی، پسند ہوئی۔

چکر چلا...... یاخدا...... وغیرہ وغیرہ۔

ذہن میں صرف اور صرف منفی خیالات کی ہلچل مچی تھی۔ صاد نے وہاں جا کر زیادہ بولنے، غیر ضروری بات کرنے سے بھی روکا تھا۔ یہ بھی خدشہ تھا کہ لڑکی کا کہیں صاد کے ساتھ رابطہ نہ ہو۔ سوچ سمجھ گئیں اور بڑی معصومیت سے رشتہ مانگ آئیں۔

وہ لوگ الگ حیران تھے کہ یہ کون عورت ہے جس نے آتے ہی رشتہ مانگا ہے بیٹے کا۔ بہرحال کچھ دن گزرے اور ان کے لیے ایک۔ حیرانی یہ ہوئی کہ لڑکی والوں کی طرف سے اقرار آگیا۔ شوہر خوش تھے ایک دن نہ ضائع کیا۔ صبح کو فون آیا ہے اور شام کو لڑکی کے گھر مٹھائی کے ٹوکرے لے کر پہنچ گئے۔

بچوں کو فون کر کے بھائی کی منگنی کی خوش خبری دی اور خود ہی ان سے بات کر کے شادی کی ڈیٹ بھی رکھ لی۔ ثمینہ بیگم شوہر کی جلد بازی پر کڑھتی رہیں۔ بیٹے کے اعتماد پر تاؤ کھاتی رہیں اور تارہ کو دیکھ آئیں۔ تو سو خدشے دل میں پال لیے۔ اچھے گھر کی لڑکی تھی۔ اچھا گھر، پڑھا لکھا گھرانہ انہیں چالاک گھرانہ محسوس ہوا۔ لڑکی کی بہن ماہ روز جو چھ سالوں سے منگنی کے بندھن میں بندھی تھی۔ اس کی اب تک شادی کیوں نہ ہوئی۔

لڑکا منیب جو بھتیجا تھا اور بیٹوں کی طرح پالا تھا۔ آخر اس کے ساتھ کیوں بڑی بیٹی کا رشتہ نہ کر دیا۔ کھاتے پیتے گھرانے کے لوگ تھے۔ لڑکی کا باپ پروفیسر تھا اور بیٹی جاب کر رہی تھی۔ انجینئر تھی،

جاب کرتی تھی، خود اعتماد تھی، خود سر بھی ہوگی۔

اب یہ کیا آ کر گھر سنبھالے گی اور ان کی ذمہ

داری اپنے سر لے گی۔ کئی خدشات سر اٹھاتے رہے، کئی واہمے بڑھ گئے مگر صاد کو کون کہتا۔ بس ہول اٹھتے رہے، فکر مندی رہیں اور بہو رخصت ہو کر گھر آ گئی۔

اس دن سے لے کر اب تک...... صاد تو خوش تھا۔ لڑکی بھی اچھی تھی، ان کی شکایتیں بھی جاتی رہیں۔ بہو گھر دیکھ لیتی تھی۔ جاب بھی کرتی تھی۔ ان کو اعتراض تھا، چپکے چپکے صاد کے کان میں جاب کے حوالے سے خدشات ڈالتی رہیں۔ پہلی بار صاد پر اثر ہوا اور بیوی کو گھر بٹھا دیا۔

پہلی بار وہ صاد کے کسی فیصلے سے خوش ہوئیں۔ اب سارا دن وہ گھر میں رہتی تھی۔ لوگ الگ تعریف کرتے کہ اتنی پڑھی لکھی خوش شکل، خوش مزاج، خوش اخلاق اور سلیقہ مند بہو ملی ہے۔ مختصری مدت میں بہو کے اخلاق کے چرچے ہونے لگے جو آتا وہ متاثر ہوئے بغیر نہ جاتا۔ سب تو ٹھیک تھا۔ ساس سسر کے ساتھ بھی اچھی تھی۔ شوہر کے ساتھ بھی اچھی ہی ہو گی۔ یہ انہوں نے سوچا پھر یہ اچانک کیا ہوا کہ اپنا سامان لیا اور گھر سے چلی گئی۔

ان کے تو پورے گھر کا نظام جیسے ڈسٹرب ہو گیا تھا ان چند دنوں میں۔ وہ وقت تو آیا ہی اب تھا جب وہ تمام ذمہ داریاں اس کے سر ڈال کر خود چین کی نیند سوئیں گی کہ تارہ گھر چھوڑ کر چلی گئی۔

وہ پہلے حیران۔ ہوئیں اس کے بعد پریشان ہو گئیں مگر جب تارہ کے گھر سے پتا چلا کہ اسے صاد نے بھیجا ہے تو چپ ہو گئیں۔ سوچا وہ آئے تو بات کریں گی۔ بزنس کے بہانے ٹور پر چلا گیا تھا اور رات ہی لوٹا تھا جب انہوں نے ناشتے پر اسے پکڑ لیا تھا۔

''مجھے پہلے ہی خدشہ تھا، پسند کی شادی کے یہی نتائج ہوتے ہیں۔''

''مجھے بھی کوئی شوق نہیں تھا۔'' یہ صاد کا اکھڑا ہوا جواب تھا۔

''شوق تو خیر تمہیں تھا۔'' انہیں ناشتہ زہر لگنے لگا۔

کیا بیٹے کی لاپروائی تھی۔ کیا بے فکری۔

''کل وہ لوگ آئے تھے۔ بھائی آیا تھا اس کا۔'' وہ بے دلی سے سنے گیا۔

''پھر؟''

''شکر ہے تم گھر پر نہ تھے۔ بہت غصے میں تھا وہ۔''

''غصے میں تھا، تو میں کیا کروں۔ مجھے بھی غصہ دکھانا آتا ہے۔''

''کہہ تو خیر وہ بھی ٹھیک ہی رہا تھا۔''

''کیا کہہ رہا تھا؟''

''کہہ رہا تھا تم تارہ کو لے آؤ معافی مانگ کر۔''

صاد اس بات پر ہنس دیا۔

''وہ آنا چاہتی ہے تو آ جائے، میں نہیں جا سکتا اسے لانے اور وہ بھی معافی مانگ کر۔'' کہتے ہوئے ہنسنے لگا۔

''آخر ہوا کیا ہے صاد! تم دونوں کے درمیان بتاؤ؟''

''کچھ نہیں ہوا امی!''

''کچھ تو ہوا ہے۔''

''دیکھو سب ٹھیک تھا۔ اتنا تو خیال رکھتے تھے تم اس کا۔ کیوں گئی ہے ایسے وہ بغیر بتائے۔'' وہ حقیقت بیٹے سے سننا چاہتی تھیں۔ وہ چپ رہا۔

''مجھے بتاؤ صاد!''

''کیا بتاؤں؟'' وہ بے فکری سے ناشتہ ختم کر کے پانی پی رہا تھا۔

''اس کے گھر والے کہتے ہیں تم نے اسے جانے کو کہا ہے؟''

''جب پتا ہے تو کیوں پوچھ رہی ہیں۔'' وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرنے لگا۔

''کیا وجہ تھی؟''

''کوئی وجہ نہیں ہے۔'' وہ اٹھا۔

''دل بھر گیا تھا تمہارا؟'' وہ بھی اٹھیں۔ صاد

نے کندھے اُچکائے۔
''پتا نہیں۔''
''حد ہو گئی صاد! اتنی اچھی لڑکی ہے وہ۔ ایسی کہاں ملے گی ہمیں، تمہارے لیے۔ تمہیں آخر اس سے شکایت کیا تھی؟''
''میں فی الحال اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہ رہا۔''
''صاد! یہ زندگی ہے بیٹا۔''
''مجھے پتا ہے۔'' وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ وہ اٹھیں اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔
''اسے لے آؤ صاد! اس بے چاری کا کوئی قصور نہیں ہے۔'' وہ رکا' ایک لمحہ ان کی طرف دیکھا بے یقینی سے اور کمرے میں اندر آ گیا۔ دروازہ کھلا تھا، وہ بھی آ گئیں۔
''مجھے اپنی بات کا جواب دو بیٹا!''
''میں نہیں جاؤں گا لینے اسے۔ ہر بار میرا یہی جواب ہوگا۔''
''مگر کیوں؟''
''اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ میں نے آپ سے کہا کہ وہ آنا چاہے تو آنے دیجیے گا۔ دھکے دے کر باہر مت نکالیے گا مگر اس کے گھر والے اگر یہ چاہتے ہیں یا پھر آپ کی ضد ہے کہ میں جاؤں اسے لینے تو یہ نہیں ہو سکتا۔''
''تو پھر میں لے آؤں اسے؟''
''وہ آپ کے ساتھ آنا چاہے تو لے آئیے۔''
والٹ چیک کرنے لگا۔ پھر دراز سے چیک بک نکالی۔ ایک چیک لکھ کر جیب میں رکھا، چابی اٹھائی۔ یہ سب اس کے باہر جانے کی تیاری تھی۔
''صاد! اگر وہ میرے ساتھ نہ آئی تو؟''
''تو میں کم از کم کچھ نہیں کر سکتا۔''
''تم مجھے آخر وجہ تو بتاؤ۔'' وہ التجائیہ بولیں۔
''امی...... پلیز...... جو کہنا تھا' سو کہہ چکا ہوں، بائے۔ ایک ضروری کام ہے، رات دیر ہو جائے گی۔
ڈیڈی کو بتا دیجیے گا۔'' کہہ کر نکل گیا۔ وہ سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئیں۔ شوہر سے بات کی تو وہ ان سے زیادہ مظلوم نظر آ رہے تھے۔
''کہہ دیا کہ چھوڑ دو اسے اس کے حال پر، وہ مس کرے گا تو لے آئے گا خود ہی۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' کہہ کر دوا لے کر سو گئے اور وہ تھیں کہ ملازموں کے جانے کے بعد اکیلی گھر میں پھرتی رہیں۔
فون کیا تو نایاب کی بیٹی بیمار تھی، وہ اس کے ساتھ لگی تھی۔ عمیر دفتر سے تھکا آیا ہوا سویا تھا۔ ان کی اس بہو سے بھی کچھ خاص بنتی نہیں تھی کہ بیٹھ کر دل ہلکا کرتیں سو فون رکھ دیا۔ بہن اپنے پوتوں میں مصروف تھیں۔ اس وقت تارہ ہوتی تھی جوان کے ساتھ مل کر ڈراما دیکھتی۔ تبصرہ کرتی، بات چیت کرتی تھی۔ تب تک بیٹھی رہتی جب تک صاد نہ آ جاتا اور وہ ہمیشہ دیر سے ہی گھر آتا تھا۔ تب تک یہ بھی تھک چکی ہوتیں تو جا کر سو جاتیں۔
شہروز صاحب تو آدھا دن اور پوری رات نیند کی دوائی کے زیر اثر بے ہوش پڑے رہتے۔ ایسی صورت حال میں انہیں لگ رہا تھا کہ وہ خود اپنی تنہائیوں کی ذمہ دار ہیں یا پھر یہ کہ وہ اپنی زندگی میں آنے والے دوسرے آدمی سے اتنا ڈرتی رہیں کہ اسے کھونے کے خوف سے کچھ نہیں کہا، کچھ نہیں کیا۔
شوہر ویسا ہی موڈی سخت دل اور خود پسند رہا اور بیٹے نے بھی وہی لباس پہن لیا اپنی شخصیت پر۔ انہیں پتا تھا یہ دو لوگ ہیں جو صرف اپنی ذات کے لیے جیتے ہیں۔ خیر وہ تو شہروز کی محبت نہ تھیں کہ وہ اس کی خاطر خود کو بدلتے مگر صاد کی آنکھوں میں تو انہوں نے بیوی کے لیے ایک چاہ دیکھی تھی۔
وہ تو سمجھی تھیں کہ وہ پورے کا پورا بیوی کا ہو بیٹھا۔ بیوی کا اسیر' بیوی کا چاہنے والا۔ یہاں تک ٹھیک تھا۔ یہ نہ ہوتا کہ بیوی کا خادم ہی بن جاتا۔ جیسے عمیر بن گیا تھا وقت کے ساتھ ساتھ مگر یہاں تو بڑی جلدی تختہ الٹ گیا۔

ابھی تو ابتدا تھی۔ ابھی تو سال مشکل کو ہونے آیا تھا، ابھی تو ان کی شادی کی پہلی سالگرہ بھی نہیں ہوئی اور صاد کا دل ابھی سے بھرنے لگا۔ وہ بھی اتنی اچانک...... اتنے حیرت انگیز طریقے سے' بغیر کسی ظاہری بڑی وجہ کے......

انہیں بس رات کی تنہائی کاٹ رہی تھی اور بیٹے کی ضد جو بھرپور جوان ہوگئی تھی۔ جس کے آگے بوڑھے شوہر تھے اور وہ تھیں جو بڑھاپے، نقاہت اور کمزوری کی طرف بڑھ رہی تھیں اور زندگی تھی کہ عجیب سی ہوتی جارہی تھی۔

انہیں یک لخت تارہ کا خیال آیا کہ وہ کیا سوچتی ہوگی۔ کیا واقعی وہ اپنی خوشی سے گئی ہے اور سوچنے لگیں کہ انہیں خود تارہ سے بات کرنی چاہیے۔ ہوسکتا ہے بات کا سرا انہیں سے مل جائے۔ ادھر وہ سوچتی رہیں اور ادھر رات کو لمحوں میں گزارتے ہوئے گھپ اندھیرا کیے تارہ بیٹھی تھی جس نے شیشے کی کھڑکی کے آگے پردہ ڈال دیا تھا اور کمرے میں ہلکی ہلکی خنکی تھی ایئرکنڈیشن کی اور ماہ روز بھی جو گہری نیند سو رہی تھی اور وہ تھی کہ جاگ رہی تھی اور اسے پتا تھا کہ دوسرے کمرے کی بتی جل رہی تھی تو سمجھو منیب بھائی بھی جاگ رہے ہوں گے۔

اور سگریٹ پھونک رہے ہوں گے اور اسے یاد ___ رہے ہوں گے۔ اربیہ کو۔ جوان کی محبوبہ تھی، جوان کی محبت تھی اور محبت بے وفا تھی۔

☆☆☆

کسی بھی احساس کو محسوس کرنے کے لیے آپ کو تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ محبت جیسا، سانولا سلونا اور سیدھا رشتہ بھی۔ کئی پیچ وخم میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

''میں تو اس کے ساتھ عجیب رشتے میں بندھ گیا ہوں۔''

یہ منیب اکرام کی ڈائری کا پہلا ورق تھا۔ جس پر آج سے چھ سال پہلے کی تاریخیں درج تھیں۔ محبت انوکھی ہی ہے، رشتہ بھی انوکھا تھا۔

یونہی تو نہیں کسی کے پیچھے بے مقصد، بے وجہ پھرا جاتا، کسی کی مسکراہٹ کے معنی یوں تو نہیں کھلنے لگتے، تاثرات کے اظہار، مدھر بولیاں بولنے لگ جائیں اور سحر زدہ عنایتیں مہربانیوں کے اندر کھلنے لگیں۔ ان کا گروپ میں شامل ہوجانا بھی عنایت تھا، اربیہ شفقت۔ دوسری لڑکیوں کی طرح کی ہی معمولی سی لڑکی تھی۔ سیدھی سادی۔ سانولی سلونی۔ سیاہ بالوں کو پشت پر بچھا دیا جاتا تو پشت نظر نہ آتی۔ مدھم لہجے والی، جس نے بلاوجہ نہ بولنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ سننا زیادہ، بولنا کم۔ بہت ضرورت کے وقت سوال کرنا۔ اپنے دھیان کو ہر وقت کام میں رکھنا۔

اس حد تک غائب الحواس کہ پاس سے کون گزر گیا۔ کس نے کس کو کیا اشارہ کیا۔ کس نے کس کو کہنی ماری۔ کوئی کس کو چوری چوری تاڑتا رہتا ہے اور کس نے اس کی اسائنمنٹ کے پوائنٹ دیکھ لیے ہیں۔ اسے کسی حرکت کا کوئی ادراک نہ ہوتا تھا۔ نہ پتا چلتا تھا۔

وہ اس قدر کھوئی ہوئی ہوتی۔ اپنے کام میں نہایت انوکھی اور پورا کام کرنے والی۔ بولتی تو کئی لہجے اور کتابوں کے درجے سب پر کھلنے لگتے تھے۔

پہلی بار وہ ان کے گروپ میں شامل ہوئی تھی اور پاس سے گزرتے ہوئے جب وہ مسلسل اسے دیکھے جاتا تو وہ اچانک ہی نظروں کی حدت کو محسوس کرکے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی، تب تک وہ نگاہ کا رخ بدل چکا ہوتا اور دھیمی مسکراہٹ سے اس کی طرف براہ راست دیکھنے کی ہمت شاید ہی پیدا ہوپاتی۔

اسی کے متعلق کھوج میں لگا ہوا ذہن کہیں کوئی جملہ بھی اربیہ کے متعلق سنتا تو ٹھہر سا جاتا۔ سماعتیں تیز ہوجاتیں۔

سعدیہ پاس سے گزر رہی تھی اور اربیہ کے بارے میں بے چاری کہتے ہوئے اس کے حالات پر افسوس کررہی تھی۔

وہ اس قدر افسردہ کیوں تھی، کسی ذہنی دباؤ کا

شکار تھی۔

ماں کی موت، باپ کی دوسری شادی اور دو لاپروا بہن بھائی۔ کی ڈھیر ساری فکروں نے اس کی نیندیں اڑادی تھیں۔ باوجود اس کے اس قدر توجہ سے کلاس اٹینڈ کرتی جیسے بی ایس کی کلاس میں فزکس کے علاوہ دنیا میں کچھ نہیں بچا اور اتنی حیرت انگیز کہ لائبریری میں آکر فلسفے اور کوانٹم فزکس کے اوپر غور کرتی، کتاب کھولتی تو کھو جاتی۔

اور وہ جو کتابوں سے کنی کترا کر نکلتا تھا، اس کی خاطر لائبریری میں پرانی کتابوں ـــــ کی خاک چھاننے لگتا، سب بہانے محبت گھڑنے لگی اور یہ تو وہ بھی جانتی تھی کہ کورس کے علاوہ کتب کو وہ لایعنی سمجھتا ہے۔

فلمیں دیکھنے کا شوقین فلسفے کی تمام فکروں سے فرار چاہتا ہے۔

باوجود اس کے وہ اس کی پسندیدہ کتب ہاتھ میں لیے جو گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے اسے جتانے کے لیے یا پھر اس کی توجہ پانے کی خاطر۔ یہ سب بھی محبت کی کچھ ادائیں ہیں۔

تبدیلی تو اس میں بھی آئی تھی کہ جن دنوں وہ ٹائیفائیڈ کی بدولت یونیورسٹی نہیں آرہا تھا تو لائبریری کے اندر بیٹھی کئی بار گردن اٹھا اٹھا کر وہ اردگرد دیکھنے لگتی۔

یہاں تک کہ کوئی خیال مسلسل اس کی توجہ بٹنے نہ دیتا اور وہ فزکس کے سارے فارمولے ادھر ہی رکھ کر اکتائے ہوئے انداز میں باہر نکل جاتی۔ جو بے چینی گروپ فیلو رمشا نے محسوس کی اور دیکھی۔ اس کتاب کے متعلق پوچھا جس کو کئی روز سے وہ لیے بیٹھی رہی تھی اور پلے کچھ نہ پڑا تھا۔

یہ پہلی بار ہوا تھا، رمشا نے جب کتاب پوچھی تو وہ نام ہی بتا سکی اور جب ٹاپک پوچھا تو سو بار الجھی۔ فارمولا تو یاد نہ تھا، رمشا ہنس پڑی۔

رمشا نے منیب کو فون کر کے صورتحال سے آگاہ کیا اور وہ جو گھر بھر کی ہمدردیوں پر گزارا کر رہا تھا۔ امی ابو تو پہلے ہی شدید پریشان تھے کہ اسی ٹائیفائڈ کی وجہ سے انہوں نے اپنا چار سالہ کاشی کھویا تھا۔ کاشی جو ماہ روز سے چھوٹا تھا دو سال، ٹائیفائڈ بہانہ تھا وہ صرف چار سال کی عمر لیے آیا تھا۔

کاشی کے جانے کے بعد شفیع صاحب بہت افسردہ ہوگئے تھے اکرام صاحب نے گیارہ سالہ منیب کو آگے کر دیا یہ کہہ کر کہ ”منیب تمہارا بیٹا ہے“ اور انہوں نے تو بس کہہ دیا مگر منیب نے جیسے دل پر لکھ لیا۔

آٹھ نو سال چھوٹی ماہ روز اور سات سال چھوٹی تارہ تو جیسے مرکز بن گئی تھی۔

وہ دل سے ڈھل گیا تھا اس فیملی میں اور جب اکرام صاحب کی باہر جاب ہوئی اور فیملی کو باہر بلایا گیا تو ماں نے ہر طرح سے منیب کو سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ چچا ابا کا بیٹا ہوں، ان ہی کے پاس رہوں گا۔

شفیع نے بچے کی ضد کے آگے ماں کو پریشان ہوتا دیکھا تو خود بھی پریشان ہوگئے اور بھابھی کو سمجھایا کہ بچہ والدین کے بغیر کیسے رہ سکتا ہے۔ آپ کو مس کرے گا تو لے آؤں گا۔ اکرام صاحب مطمئن تھے کہ بھائی کے پاس رہے۔ ان کے پاس باذل تھا، نینا تھی۔

وہ سمجھتے تھے کہ شفیع کو زیادہ ضرورت ہے منیب کی۔

ماں کے لیے بڑے بیٹے سے دور رہنا بڑا اذیت ناک سہی پر بیٹے کی ضد کے آگے ہار گئیں۔ جانے کے بعد کئی بار فون پر پوچھنے لگیں تو وہ خفا ہو گیا یہ کہہ کر کہ میں یہاں بہت خوش ہوں۔ مینا بیگم کو دلی لگاؤ ہو گیا تھا منیب سے۔

پہلے منیب۔ پھر بیٹا کہنے لگیں اور جب وہ بیٹا کہنے لگیں تو وہ بے ساختہ امی کہنے لگا۔ شفیع صاحب نے بڑی حیرت وحسرت سے اس کو دیکھا جو ہر وقت ان کے پاس بیٹھا بیٹوں کی طرح لاڈ اٹھواتا رہتا۔

بھتیجا بیٹا بن گیا تو بیٹے سے زیادہ پیارا محسوس

UrduBooks.pk

ہوتا تھا۔ جانے کیسے منیب نے چچا کے من کی بات پڑھ لی اور چچا ابا سے صرف ابا پر آ گیا۔

اب امی ابا ہی تھے اس کے لیے اور وہ امی ابا کے لیے سب کچھ تھا۔ کوئی فرمائش کرتا اتنے پیار سے کہ وہ تو نہال ہی ہو جاتے۔ آنکھ میں خوشی کے آنسو بھر جاتے۔ دل آباد ہو جاتا۔ خود ہی جاننے لگے تھے کہ بیٹے کی کیا ضروریات ہیں اور اس نے ایک بار حیرت سے ماں سے پوچھا تھا کہ ''امی! ابا کو ابھی بتاتا بھی نہیں اور انہیں پتا چل جاتا ہے کہ مجھے کس چیز کی ضرورت تھی۔''

وہ اس کی بات پر ہنس پڑیں۔ ہنستے ہوئے کہنے لگیں کہ ''ماں باپ تو سب جان جاتے ہیں بیٹا۔ وہ بھی جو تم انہیں بتاتے ہو اور وہ بھی جو نہیں بتاتے۔ وہ سب جانتے ہیں یہاں تک کہ بیٹا اگر کمبل میں گھس کر سونے کے بہانے دیر تک گیم کھیلتا ہے تو بھی ماں کو پتا چل جاتا ہے اور جب بچہ ہوم ورک اچھا نہ کرنے کی وجہ سے ٹیچر سے ڈانٹ کھاتا ہے۔ اس کا بھی ماں کو پتا ہوتا ہے اور باہر قلفی اور بوتل پیتا ہے گھر میں آکر کہتا ہے صرف جوس پیا تھا تب بھی ماں کو پتا چل ہی جاتا ہے۔''

اس وقت تو وہ واقعی ہراساں ہو گیا کہ اب تک کہ کیے گئے تمام کھیلوں کا ریکارڈ ماں باپ کے سامنے کھل چکا ہے مگر کچھ سالوں بعد سوچا کہ کمبل کے اندر ارتعاش اور گیم کا ہلکا سا ساؤنڈ سن کر بھی ماں کو کیسے نہ پتا چلے گا کہ بیٹا دیر تک سونے کے بہانے گیم کھیلتا رہا اور یہ کہ باہر قلفی اور کولڈ ڈرنک لینے کے بعد جو دو دن گلا خراب رہا جس کی وجہ سے دو بار ماں نے دوائی بھی پلائی تھی۔

یہاں تک کہ ٹیچر کی شکایتی کال اور نوٹ بک کے اندر لکھا نوٹس ماں نہ پڑھے۔ گی تو کون دیکھے گا۔ ہاں البتہ یہ حیرت انگیز بات تھی کہ اسے بھوک لگتی تھی اور ماں کھانا لے آتی۔

معمولی سا فکر مند ہوتا تو ماں سارا سارا دن پریشان رہتی۔ بہانے بہانے سے وجہ پوچھنے کی کوشش کرتی مگر یہ ادراک بہت میٹھا لگا جب وہ خود تارہ اور ماہ روز کی چھوٹی بڑی حرکات سے کئی اندازے لگا لیتا تھا۔

سب سے پہلے ماں تھی جس نے محبت کی لو کے احساسات کو اس کے چہرے سے بھانپ لیا تھا۔ کچن میں کام کرتے ہوئے جب اسے سامنے سے گزرتا ہوا دیکھ کر آواز دی اور وہ آیا تو بڑی رازداری سے پوچھنے لگیں۔

''کون ہے وہ؟''

''کون...... کون ہے؟'' وہ بوکھلایا۔

''وہی۔''

''وہی۔ کون؟''

''وہی...... کون ہے یہ تو تمہیں پتا ہے نا پگلے۔''

وہ ماں کی چالاکی بھری معصومیت پر ہنس پڑا۔

''کوئی نہیں ہے۔''

''لو۔ اب ماں کے ساتھ بھی جھوٹ بولا جائے گا۔ حد ہوگئی۔'' اور وہ ہنس دیا۔ جو ادراک نیا تھا اس کا کیسے اظہار کرتا؟

''مجھے تو کچھ نہیں پتا۔'' کھسیانا ہوا۔

''چلو جب پتا چلے تو مجھے بتا دینا۔ ایسا نہ ہو کہ لڑکی کوئی اور لے اڑے۔'' ہنسنے لگیں۔ ایسی ہنسی...... ایسی دوستی...... ایسی روشنی۔

کتنی خوشیوں کے چراغ جل اٹھے یک دم ہی...... جیسے بتیاں رات کے اندھیرے میں جاگتی ہیں۔

وہ جیسے جاگ اٹھا۔ سوچا تھا جلدی بتائے گا ماں کو۔ تارہ اس کی چھوٹی ماں تھی۔ کلاس لینے لگ جاتی۔

''یہ آپ اچانک فلم دیکھتے دیکھتے کدھر کھو جاتے ہیں؟''

''کیا...... کہ...... کہیں نہیں۔''

''کوئی ہڑبڑائے تو سمجھو دال میں کچھ کالا ہے۔''

یہ وہی ماہ روز تھی جس کی عنقریب کم عمری میں

Monthly Shuaa September 2018
UrduBooks.pk

ہی منگنی ہونے والی تھی۔ وہ دونوں کو گھورنے لگا۔ ٹالنے لگا ماہ روز تو جو سمجھتی سو کہہ دیتی۔ تارہ انہیں چھیڑتی تھی اور کتنا مزے کا لگتا تھا اس کے حوالے سے کسی کا چھیڑنا۔۔

ٹائیفائیڈ کے بعد یونیورسٹی آیا تو اس کے ہونٹوں کی اطمینان بھری دوستانہ مسکراہٹ نے کئی در کھول دیے تھے۔ اسی شام گھر آ کر اس کی خوشی چھپی نہ رہی تھی۔ ماں کے سامنے ہار مان لی۔ تارہ سے کھل کر اس کی باتیں کرنے لگا۔ سوتا تو آنکھیں نت نئے خواب بنتیں اور جاگتا تو خوابوں کی تعبیر کا انتظار شروع ہو جاتا۔

کام...... کام کے ساتھ تعلیم۔ سب چل رہا تھا اور سب کے ساتھ محبت تھی جس کے احساس کی موجودگی نے ہی جیسے چاروں چراغ جلا دیے تھے اور دل مدھم مدھم سرگوشیوں جیسا۔ ہوا کی نرم سرسراہٹ جیسا۔ خیال کی وسعتوں جیسا آوارہ اور جلتے بجھتے سگریٹ کی طرح جلتا، بجھتا، سلگتا ہوا۔ کئی پہروں کی خوشیوں کی تمناؤں میں وقت گزارنے لگا۔

تارہ نے کہا۔ ”اظہار محبت کر دو۔“

وہ ہنس پڑا تارہ کی بات پر۔

اس کی بھلا ضرورت ہی کیا تھی۔ سب کچھ تو سامنے تھا۔ کیا چھپا تھا۔ لوگوں تک آنکھوں کے پیغامات عیاں ہو گئے تھے۔ سرگوشیوں کے درمیان اریبہ کا نام اس کے نام کے ساتھ لیا جانے لگا۔ وہ ہراساں لڑکی اور سمٹ جاتی اور یہ جیسے تمغے جیتتا جا رہا تھا۔

وہ سمجھتا تھا کہ اریبہ جانتی ہے کہ منیب اس کے لیے کیا محسوس کرتا ہے اور یہ سب منیب جانتا ہے کہ اریبہ بھی اسے دل ہی دل میں چاہنے لگی ہے۔ ایک محبت تھی جو دھواں دینے لگی تھی۔ ہر جگہ بولتی تھی یہاں تک کہ ہونٹ چپ رہتے تھے۔

اسی سحر کے اندر روحیں خوش حال ہونے لگیں خواب پروان چڑھنے لگے اور سال بہت سارے یادگار لمحات چھوڑ کر آگے کھسک گئے۔ پاس آؤٹ کر کے گھر آیا تو ماں نے کہا کہ اس کے گھر لے جاؤ۔

اس کا خیال تھا، پہلے اریبہ سے خود بات کر لی جائے مگر ماں بضد تھی۔ بیٹے ابھی جوان ہوتے نہیں کہ مائیں بیٹوں کے حوالے سے خواب دیکھنا شروع کر دیتی ہیں۔

وہ ماں کو روک نہیں سکا تھا۔ ماہ روز کی بھی منگنی ہو چکی تھی۔ تارہ کا خیال تھا کہ منگنی تب ہی کی جائے جب شادی کا ارادہ ہو۔ یہ رشتے کو لٹکا کر رکھنے والا معاملہ برا ہوتا ہے۔ شفیع صاحب کا چھوٹا موٹا کاروبار بھی تھا جس کی تسلی تھی اور منیب جاب کے لیے کوشاں تھا۔

ان ہی دنوں کی بات تھی جب وہ اریبہ کو حیران کرنے کی خاطر مینا بیگم کو رشتے کے لیے ان کے گھر لے گیا۔ سوتیلی ماں کی اکھڑی زبان اور اریبہ کے باپ کا غیر ذمہ دار رویہ انہیں سخت برا لگا مگر مجبوری تھی۔ مینا بیگم سے جتنا اصرار ہو سکا اتنا کیا اور گھر لوٹ آئیں۔ نہ مہمانوں کی آؤ بھگت۔ نہ خوش اخلاقی، نہ سلیقہ۔ اس گھر میں کچھ نہیں تھا مگر اس گھر میں منیب کی پسند تھی۔ ان کے بیٹے کی خوشیاں تھیں۔

ان ہی دنوں اریبہ کو جاب مل گئی تھی ایک کالج میں فزکس لیکچرر کی۔ یہ اس کے لیے خوش قسمتی تھی اور پھر اریبہ کے گھر سے رشتے کا جواب آ گیا۔

منیب توڑے سا گیا جیسے ایک شکایت دہکنے لگی تھی۔ مینا بیگم شفیع صاحب کو لے کر دوبارہ گئیں اور مزید ان کی بداخلاقی اور بدتمیز رویے کو سہنا پڑا۔ تیسری بار جانے سے منیب نے انہیں منع کر دیا اور اس کے بعد وہ آخری بار گیا۔ اریبہ کے کالج اس سے ملنے اور عجیب سا لگا اس کا جملہ کہ یہاں میں پڑھانے آئی ہوں منیب۔ لوگوں سے ملاقاتیں میرے کردار کا نقشہ کیا پیش کریں گی اس کا آپ کو اندازہ ہونا چاہیے۔

منیب دکھی دل لیے واپس لوٹ آیا تو مطلب یہ کہ اس انکار میں اریبہ کی رائے بھی شامل تھی۔ ماں کو کہا کہ اریبہ کا نام اب اس گھر میں کوئی نہیں لے گا۔

Monthly Shuaa September 2018

تارہ کو تسلی دی کہ وہ اسے بھلا دے گا۔ ماہ روز کو کہا کہ بھول بھی گیا اور اندر ہی اندر کوئی سراغ تھا جو بے منزل رہا۔

کوئی راستہ تھا جو ویران رہا۔ کوئی دریا تھا جو دکھ پی کر پانی چڑھا رہا تھا اور وہ اندر سے، باہر سے۔

اداس۔۔ مایوس۔۔ ملول سا گھل رہا تھا۔ جیسے پانی میں برف گھلتی ہے

☆☆☆

''اسے اندازہ نہیں کہ وہ کتنی خوش قسمت ہے۔'' علینہ نے چائے کا کپ اسے تھماتے ہوئے کہا تھا۔

آج بہت سالوں بعد وہ پھوپھی کے گھر آیا تھا۔ پھوپھی تو کسی شادی میں گئی ہوئی تھیں۔ پھوپھا بھی گھر پر نہ تھے۔ حمیدہ بھابھی ان کا بیٹا عدیل اور علینہ گھر پر تھے۔ حمیدہ بھابھی کچھ دیر بیٹھی رہیں پھر اٹھ کر بچے کے رونے کا بہانہ کر کے چلی گئیں۔

وہ اٹھ کر جانے ہی لگا تھا کہ علینہ اس کے لیے چائے بنا لائی اور اسے بیٹھنا پڑ گیا اور اس طرح پورے ساڑھے تین سال بعد اس کی علینہ سے ملاقات ہوئی تھی۔

اس سے پہلے آخری ملاقات تب ہوئی تھی جب پھوپھو کو دیکھنے وہ ہسپتال گیا تھا۔ ماں کے ساتھ زبردستی گیا تھا اور چند منٹ بیزار سا بیٹھ کر چلا آیا تھا۔

اس کے بعد آخری بار پھوپھو کو دیکھا تھا جب پھوپھو گھر آئی تھیں صاد اور علینہ کی شادی کی بات کرنے کے لیے اور اسی وقت بغیر کسی لحاظ کے اس نے انکار کر دیا تھا اور تب پہلی بار پھوپھو ان کے گھر سے روتی ہوئی نکلی تھیں اور قسم کھا کر گئیں کہ آئندہ اس گھر میں قدم نہیں رکھیں گی۔

پھوپھو صحت یاب بھی ہو گئیں۔

شہروز بہن کو دو بار منانے بھی گئے مگر بے سود۔ نہ وہ بیٹے پر اپنی چلا سکے۔ نہ بہن کی جذباتی بلیک میلنگ کام آئی اور بہن بھائیوں کے درمیان اختلافی خاموشی در آئی۔

صاد کی شادی میں بھی وہ شریک نہیں ہوئی تھیں اور ابھی یہاں سے گزرتے ہوئے اسے اچانک ہی خیال آیا کہ پھوپھو سے مل لے۔ ہو سکتا ہے اسے دیکھ کر ان کی خفگی کچھ کم پڑ جائے۔

کچھ اپنا مطلب بھی تھا کہ باپ کی زمین میں پھوپھی کا حصہ بھی تھا۔ جو وہ اب بہن کو دینا چاہتے تھے

اور صاد چاہتا تھا کہ پھوپھو یہ زمین انہیں بیچ دیں کیونکہ اس زمین پر صاد نے پولٹری فارمز لگائے ہوئے تھے

پھوپھو کے بیٹے نے کچھ ماہ پہلے انہیں کھڑکایا تھا پھر دوبارہ کچھ سختی سے پیش آیا۔ کچھ جھجک ان کی کاروباری حیثیت اور پیسے کی وجہ سے تھی کہ اگر کورٹ تک چلے گئے تو پیسہ پانی کی طرح بہانا پڑے گا اور شہروز خان اتنی آسانی سے انہیں ان کا حق نہیں دیں گے۔

ضد میں آ گئے تو تماشا بھی ہو گا اور خرچا بھی اور خرچا کرنے کی توفیق ان کے حالات انہیں نہیں دے رہے تھے۔ ابھی تک یہ لوگ سوا سو گز کے گھر میں مقیم تھے۔ ابا ریٹائرڈ تھے۔

احسن کی کلرک کی ملازمت تھی اور علینہ پچھلے چار سال سے ماسٹرز کلیئر کیے مختلف پرائیویٹ اسکولوں میں پڑھاتی آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر حمیدہ بھابھی کا رویہ تو نارمل تھا اور علینہ کے لہجے میں بھی باوجود شکایت کے اپنائیت کی بھی جھلک تھی۔

بھابھی کے جانے کے بعد وہ اس سے تارہ کے متعلق پوچھنے لگی۔

''سنا ہے تمہاری بیوی بہت حسین ہے۔''

اور صاد کو پھر سے مخصوص کلمات سننے پڑے جو وہ تب سے سنتا ہوا آ رہا تھا جب سے تارہ کو بیاہ کر گھر لایا تھا۔ وہ کہتے ہوئے اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

وہ مسکرا دیا۔

''کیا کر رہی ہو آج کل؟''

"وہی ٹیچنگ۔ تمہاری بیوی کی طرح انجینئر تھوڑا ہی ہوں۔"

"اوہ۔۔" بس وہ یہی کہہ سکا۔

"اور جی ڈی سی میں کام کرتی ہے نا؟"

"چھوڑ دی اس نے جاب۔" وہ کپ خالی کر چکا تھا

"ہیں...... واقعی؟" وہ حیران ہوگئی۔

"ہاں۔۔"

"تمہارے کہنے پر؟"

"ظاہر ہے۔"

"واہ۔۔ بڑا رعب رکھتے ہو اس پر۔۔"

"ہاں بالکل۔۔ وہ تو رہنا چاہیے۔ شوہر تو پھر شوہر ہی ہوتا ہے نا۔"

وہ ہنس پڑی اس بات پر۔

"ہنس کیوں رہی ہو۔۔ میں غلط کہہ رہا ہوں کیا؟" وہ چڑ گیا۔

"نہیں۔۔ کہہ تو ٹھیک رہے ہو۔۔ مگر اتنی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔۔ بڑے گھر کی بھی ہے بات مان لی۔۔ اتنی اچھی نوکری۔ روز روز تو نہیں ملتی نا۔"

"ہم۔ یہ بات اپنی جگہ۔۔ مگر اسے کیا ضرورت جاب کی۔۔ میرے پاس پیسے کی کمی تو نہیں۔"

"ہاں، اب یہ تو خیر نظر آتا ہے۔" وہ طنزیہ مسکرائی تو صاد کی مسکراہٹ مدھم پڑ گئی تھی۔

"خیر۔۔ یہ بتاؤ پھوپھو کب آئیں گی؟ مجھے ان سے ملنا ہے۔"

"دیر ہو جائے گی شاید رات ہو جائے۔۔ تب تک بیٹھے رہو گے کیا؟" خاصا چبھتا ہوا انداز تھا۔

"نہیں۔ دوبارہ آجاؤں گا۔"

"اچھا۔۔۔ مرضی ہے تمہاری۔۔ مگر وہ بات نہیں مانیں گی تمہاری۔"

"کون سی بات؟" وہ چونک گیا۔

"جو بھی منصوبہ تم سوچ کر آئے ہو۔"

"تمہیں کیسے پتا کہ میں کسی منصوبے کے تحت آیا ہوں۔" وہ ہنس پڑا۔

"اتنا تو تمہیں بھی جانتی ہوں ڈیئر کزن! کہ تم بے وجہ تو ہم غریبوں کے گھر نہیں آسکتے اور وجہ بھی وہ جس میں تمہارا فائدہ ہو۔ نقصان کا سودا تو کبھی کیا نہیں تم نے۔ سودا بھی فائدے کا، لڑکی بھی فائدے کی، شادی بھی فائدے کی۔" وہ شادی والی بات پر اسے زچ کرنا نہیں چھوڑ سکی۔ وہ پھر سے ہنس پڑا۔

"فائدہ۔ اگر فائدے کا سوچتا تو تارہ سے اتنی بڑی جاب نہ چھڑواتا۔ پتا تھا تم جیسے لوگ ایسا ہی سوچتے ہیں۔ بس یہیں تک سوچ جاتی ہے تم لوگوں کی۔"

"تمہاری سوچ بتا رہی ہوں کزن۔ بچپن تمہارے ساتھ گزرا ہے میرا۔ آتے جاتے کھیلی ہوں تمہارے ساتھ۔ کئی کئی دن ہم ایک گھر میں رہے ہیں۔ بڑے خان کے گھر۔ تمہیں نہیں جانوں گی تو...... حد کرتے ہو تم بھی صاد خان!"

"بڑی ہوشیار ہوگئی ہو کزن۔" وہ مسکرایا۔

"کچھ عقل دوسروں کے حصے میں بھی آئی ہے۔ خاندانی نہ سہی۔ مگر...... خیر...... تو لے آؤ کبھی اپنی بیوی کو بھی ہمارے گھر۔"

"میری بیوی کا ذکر تمہیں بہت پسند ہے۔" مسکرایا۔

"ظاہر ہے اب تم سے منسوب ہے۔ ہم بھی دیکھیں۔ کون ہے وہ خوش نصیب۔۔ جو تمہارے حصے میں آئی ہے۔۔" پہلا جملہ اس کا اچھا لگا تھا۔

"خوش نصیب تو خیر وہ ہے۔ اس میں کوئی شک ہی نہیں ہے مگر۔۔ میں فی الحال چلتا ہوں۔"

"اپنی بیوی کو سلام کہنا اور اسے بتانا کہ وہ خوش نصیب ہے۔" عجیب لہجہ تھا علینہ کا۔ وہ سمجھ نہ سکا۔ طنز تھا یا شکایت کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

"چلتا ہوں۔ پھوپھو سے کہنا کہ پھر آؤں گا۔"

"وہ تو مجھے بھی پتا ہے کہ تم دوبارہ آؤ گے۔ ہاں البتہ اسے لے آنا۔"

"کسے لے آؤں؟" جاتے ہوئے رکا، جان

بوجھ کر پوچھنے لگا۔

''اپنی بیوی کو۔''

''بہت شوق ہے تمہیں اس سے ملنے کا۔''

''ظاہر ہے۔ تمہاری بیوی ہے۔ دیکھنی چاہیے، پھر تعریفیں بھی تو سنی ہیں اس کی۔'' وہ ہنس پڑا۔ کھوکھلی ہنسی تھی۔

گھر گیا تو یاد آیا کہ تارہ نہیں ہے کمرے میں اور رات بیٹھ کر تسلی سے اس نے سگریٹ پی اور سوچتا رہا۔

اسے پتا تھا کہ وہ کچھ ہی دن میں خود ہی رابطہ کرے گی۔ اتنا تو اندازہ تھا کہ ''محبت کرتی ہے۔ پتا تو یہ بھی تھا کہ خود بھی کرتا ہے۔ یاد آیا کہ اس کے دوست کی بیوی نے جب تارہ اور اس کی دعوت کی تھی اور اسے کوئی تین بار کہا تھا کہ تم خوش نصیب ہو صاد تمہیں ایسی بیوی ملی اور جب ایک بار تارہ کو کہا کہ تم بھی خوش نصیب ہو کہ تمہیں ایسا شوہر ملا تو وہ ہنسی تھی۔

بے ساختہ ہی ہنسی۔ اس کی ہنسی عجیب تھی۔ کھنکتی ہوئی۔ رنگ دار لہجوں جیسی مگر اس وقت وہ کسی خاص خیال کے تحت ہنسی تھی۔ مگر رات کو اس کی طرف دیکھ کر جب مسکرائی تو محسوس ہوا کہ وہ اس کی اسیر ہو چکی ہے ایسے ہی جیسے بعض لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ایسے ہی جیسے اس کی زندگی میں آنے والوں کو خوش نصیب کہا جاتا ہے

اس وقت کمرہ پورا سگریٹ کے دھوئیں سے بھر گیا تھا۔ اسے یاد آیا پچھلے ماہ جب وہ سگریٹ پینے کے لیے کمرے سے باہر جا رہا تھا تو تارہ نے اس کا بازو پکڑ کر کہا تھا۔

''تم یہ چھوڑو گے نہیں؟''

وہ کندھے اچکا کر مسکرایا۔ بیوی بھی عجیب سی چیز تھی۔ اتنی عزیز کہ دل چاہے کہ ایک دنیا اس پر قربان کر دو اور جب کھٹکنے لگے تو دل چاہے کہ اپنی دنیا سے اسے نکال باہر کرو اور کچھ ہی دنوں میں۔ اس نے وارڈروب کھول کر اس کے سامنے کر دی اور وہ اپنے کپڑے اٹھا کر چلی گئی۔ بس اتنا سا سفر تھا اس کی زندگی کا۔ حیرت زدہ سا، عجیب سا، پیچیدہ سادہ سوچ رہا تھا۔

ایک لمحے کو دل کیا اسے میسج کرے پھر سیل فون ہی اٹھا کر بستر پر دے مارا اور آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔

سگریٹ کی ایش ٹرے بھر گئی۔

یہاں تک کہ خود اسے بھی ہلکی سی کھانسی ہونے لگی تو ادھورے ٹوٹوں سے بھرے ایش ٹرے کو لات ماردی وہ کارپٹ پر بکھر گئے۔

ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اٹھا شرٹ کے بٹن کھولے۔ بوٹ موزے اتار کر ایک جگہ ڈال دیے اور داڑھی کھجاتا ہوا بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ ایئر کنڈیشنر کی خنکی بڑھ رہی تھی اور ٹھنڈ کے احساس سے سرسراتے ہوئے بھی کروٹ بدل کر سو رہا تھا۔

تارہ تو ہر رات اس کے اوپر کمبل ڈال دیتی تھی رات گئے۔ جب وہ سو جاتا گہری نیند اور ٹھنڈ بڑھ جاتی تھی، اس کے موزے اتارتی پیروں سے، بوٹ اپنی جگہ پر رکھتی تھی۔

صبح کے لیے کپڑے نکالتی اور چھوٹے موٹے کام کر کے کب آ کر سوتی تھی۔ اسے کم ہی پتا چلتا تھا۔ بس وہ صبح اٹھتا تو اسے بستر پر سویا ہوا دیکھتا اور اس کے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرتا تو وہ آنکھیں ادھ کھلی کر کے اسے دیکھنے لگتی۔

پھر پوری آنکھیں کھول کر مسکرا دیتی۔ وہ بھی مسکرا دیتا۔ کچھ تو تھا اس رشتے میں۔ کوئی احساس میٹھا سا جو یک لخت ہی ہاتھ سے کھسکنے لگا تھا۔

☆☆☆

شادی کی پہلی سالگرہ تھی اور وہ اس موضوع پر کسی سے بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ البتہ فون کی طرف بار بار توجہ جا رہی تھی۔ شاید لاشعوری طور پر وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ لاؤنج میں آ گئی۔

باہر لان میں منیب بھائی سگریٹ پیتے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ جب [illegible]

[illegible]

سگریٹ اور لایعنی سوچوں میں گزر جاتا تھا۔

وہ چاہتے ہوئے بھی باہر نہ جا سکی کہ آج کسی بھی سوال سے وہ گھبرا رہی تھی۔

آج پورا دن گزر گیا۔ فون نہیں بجا۔ شام ہو چکی تھی۔ شفیع صاحب کمرے سے باہر آئے اور اسے چپ بیٹھا دیکھ کر قریب آ گئے۔

"تارہ۔"

"جی ابا۔"

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں ابا۔" معصومیت کی انتہا تھی۔

"بور ہو رہی ہو؟"

"جی شاید۔"

"آج سالگرہ ہے نا؟"

"پتا نہیں ابا۔"

"اسے بلائیں؟"

"نہیں ابا۔"

"کہیں باہر چلیں؟"

"نہیں ابا۔"

"فون کریں؟"

"نہیں ابا۔"

وہ چپ ہو گئے ایک سا جواب سن کر۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے تارہ بیٹا! جی ابا، ہاں ابا، نہیں ابا، پتا نہیں ابا...... اس کے علاوہ کیا بولنا بھول گئی ہو؟" وہ بہت افسوس سے اسے دیکھنے لگے۔

"نہیں...... ابا......" وہ پھر سے کہتے ہوئے جھجکتی۔

"ماہ روز...... ماہ روز......" آواز پر وہ سیڑھیاں اترتی ہوئی آئی۔

"آئی ابا......"

"جی ابا؟" وہ ان کے پاس آئی۔

"یار! کیا مسئلہ ہے تم لوگوں کے ساتھ؟ تمہاری ماں کچن میں، یہ یہاں، تم کمرے میں۔ منیب لان میں۔ ایک چھوٹے سے گھر میں ہر کوئی الگ الگ پھر رہا ہے۔"

"میں کیا کروں ابا۔ امی کی اپنی مصروفیات ہیں۔ یہ اپنی دنیا میں کھوئی ہوئی ہے۔ منیب بھائی کو اپنے روگ نہیں چھوڑ رہے۔"

"ٹھیک ہے بھئی شادیاں سب کی ہوتی ہیں دنیا میں۔ ناراضیاں بھی ہوتی ہیں۔ سب ہوتا ہے مگر ایسا حال کہیں نہیں ہوتا اور ادھر منیب بھائی کو دیکھیں۔"

"بھئی اب لڑکی نے ٹھکرا دیا تو کیا ہو گیا۔ ایک لڑکی پر دنیا ختم تو نہیں ہو گئی نا۔ لگتا ہے کوئی اس گھر میں مر گیا ہے۔"

"توبہ ہے ماہ روز! سوچ سمجھ کر بولا کرو۔" پہلی بار تارہ نے ٹوکا تھا۔

"میں اگر چپ ہو جاؤں تو اس گھر میں کوئی بولے ہی نا۔ اور معاف کیجیے گا ابا جی! آپ کو بھی سنڈے کے سنڈے ہی ہماری یاد آتی ہے۔ ورنہ گھر آتے ہی سو جاتے ہیں۔ شام میں بھی اکثر باہر ہوتے ہیں۔ بزنس نہ ہوا سر درد ہو گیا۔ ہر کسی کو یہاں اپنا کام سر پر سوار رکھنے کی عادت ہے، سوائے میرے۔" ماہ روز کو تو بولنے کا بہانہ چاہیے تھا۔

"اچھا۔ میں نے تمہیں یہ ساری باتیں سننے کے لیے نہیں بلایا۔ جاؤ اپنی ماں کو بلاؤ، میں گاڑی نکالتا ہوں۔ ہم کہیں باہر جائیں گے۔ بس بہت ہو گیا۔"

"بلاتی ہوں۔ اس کے اندر سے بڈھی روح کو ذرا نکالیے۔" وہ کہتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

"چلو بھئی، بڈھی روح نکالو اپنے اندر سے۔ میں اپنے جوان بیٹے کی سوکھی شکل کو ذرا دیکھ لوں۔ اٹھو، کمرے سے گاڑی کی چابی لاؤ تم۔" اسے کہہ کر اٹھ گئے۔ وہ ان کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

کمرے میں تنہائی تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے آیا تھا۔

آج کی تاریخ منہ چڑا رہی تھی۔ اس نے فون دیکھا امید تھی کہ وہ کال کرے گی۔ آج ڈنر پر ماں نے پوچھا تھا۔

"تمہاری شادی کی سالگرہ ہے آج صاد؟"

UrduBooks.pk

''اچھا؟'' وہ اچھا انجان بنا تھا۔
''تو پھر کیا پلان ہے؟''
''کس چیز کا؟''
''سیلیبریشن کا اور کس چیز کا؟''
''کس چیز کی سیلیبریشن؟'' وہ ان کے سامنے کچھ زیادہ ہی کٹھور بن جاتا تھا۔ ایسے ہی پیش آتا ماں سے جیسے باپ کو پیش آتے ہوئے دیکھا تھا۔
''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔''
''ضرورت کیوں نہیں؟ ضرورت ہے۔''
''آپ نے اور ابا نے کبھی سالگرہ منائی شادی کی؟''
انہوں نے واقعی نہیں منائی تھی۔
اس وقت شہروز صاحب اپنے ڈرائیور کے ساتھ میڈیکل چیک اپ کے لیے نکلے ہوئے تھے اور ڈنر پر یہ دونوں ماں بیٹا ساتھ تھے۔
''مگر تم کر سکتے ہو۔''
''میں کیوں کروں؟''
''صاد! تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے بیٹا؟''
''کوئی مسئلہ نہیں امی۔ آپ خاموشی سے کھانا کھائیں اور مجھے بھی کھانے دیں۔''
''تم اس سے بات تو کرو بیٹا۔''
''کیا بات کروں امی؟''
''اس سے بات کرو کہ گھر آجائے۔''
''میں کیوں کہوں اسے اور کس لیے کہوں، جسے آنا ہے وہ خود آئے، دیٹس اٹ اور آپ بھی آئندہ پریشان نہ ہوئیے گا اس معاملے میں۔''
''میں نہیں ہوتی۔ مگر تم لے آؤ اسے، اپنا گھر بناؤ بیٹا۔ اپنی فیملی بناؤ۔''
''ٹھیک ہے۔۔ سن لیا۔۔۔'' وہ پلیٹ کھسکا کر اٹھا۔
''اب کہاں جا رہے ہو تم۔ کھانا تو کھالو۔''
''آپ کو ہمیشہ کھانے پر ہی یہ بحث لے کر بیٹھنا ہوتی ہے۔''
''تم کھانے پر ہی میرے ہاتھ لگتے ہو۔ میں کیا کروں۔''
''دیکھیے امی۔ اسے آنا ہوگا' تو وہ آجائے گی۔ آپ زیادہ سر پر سوار نہ کریں اس معاملے کو اور ہم بہت بار اس پر بحث کر چکے ہیں۔ اب مزید نہیں پلیز۔'' وہ کہہ کر اٹھ کر چلا آیا۔
اور وہ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی تھیں انہوں نے سوچ لیا کہ بس اس بار وہ خود جا کر بہو کو لے آئیں گی۔ ان باپ بیٹے سے بات کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔
وہ چینج کر کے آیا تو فون بجا، دو تین منٹ بجنے دیا پھر دیکھا تو فون تارہ کا نہیں تھا۔ لمبی سانس لی۔ نامعلوم نمبر تھا، فون ریسو کیا۔
''ہیلو۔'' دوسری طرف علینہ تھی۔ غیر متوقع۔
''اوہ۔۔ تم...... کیسی ہو؟''
''ٹھیک ہوں۔۔ تم کیسے ہو؟''
''میں بھی ٹھیک ہوں۔''
''تمہارے پاس میرا نمبر کہاں سے آیا؟''
''بہت پہلے سے تھا۔'' اس کی آواز خاصی بھلی معلوم ہوتی تھی فون پر۔
''علینہ ہی ہونا؟''
''ہاں۔۔ تمہیں یقین نہیں آرہا؟''
''نہیں۔۔ یقین تو آگیا۔۔''
''خیر۔۔ کیسے فون کیا؟''
''بڑی جلدی میں لگتے ہو؟''
''ہاں۔۔''
''ظاہر ہے۔۔''
''کیوں ظاہر ہے؟'' پوچھنے لگی۔
''آج میری ویڈنگ اینی ورسری ہے۔''
''اوہ۔۔''
''تو تمہاری بیوی تمہارا انتظار کر رہی ہوگی؟''
''ہاں۔۔ بالکل کر رہی ہوگی۔''
''تو تم کدھر ہو ابھی؟''
''کہیں باہر ہوں۔''
''کیوں؟''

UrduBooks.pk

"ایسے ہی کام تھا، کچھ دیر میں نکلوں گا۔"

"پھر تم لوگ ڈنر کے لیے جاؤ گے؟"

"ظاہر ہے، ڈنر کے لیے جائیں گے۔"

"چلو اچھا ہے۔" اس کی آواز بجھ سی گئی۔

"تم بتاؤ۔ فون کس لیے کیا۔"

"مجھے کچھ کام تھا تم سے ساتھ۔ آئی ہوئی ہوں تمہارے شہر۔ سوچا تھا تم سے مل لوں۔ وہ پراپرٹی کے بارے میں بات کی تھی اماں کے ساتھ۔"

"اچھا۔ شکریہ۔ پھر کیا کہا پھوپھو نے؟"

"ان کو کچھ ایشوز ہیں۔"

"وہ تو شروع سے تھے۔ نیا کیا ہے؟"

"ظاہر ہے جیسا سلوک ماموں نے رکھا تھا تو ہونے ہی تھے۔"

"تم نے یہ یاد دلانے کے لیے زحمت کی ہے؟" وہ بدلحاظ ہوا تھا۔

"تم ابھی تک بدلے نہیں۔ حد ہے۔ کیسے برداشت کرتی ہوگی تمہاری بیوی تمہارا یہ تلخ لہجہ۔"

وہ اس بات پر بے ساختہ ہنسا۔

"ہنس کیوں رہے ہو۔۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔"

"ہاں۔۔ کہہ تو ٹھیک رہی ہو۔ مگر اسے میرا یہ لہجہ بھی اتنا ہی پیارا ہے۔"

"بہت چاہتی ہے تمہیں؟"

"بہت زیادہ۔۔"

"تم بھی چاہتے ہو اسے؟" پوچھتے ہوئے لہجہ گھٹ سا گیا۔

"ظاہر ہے۔ وہ چاہے گی تو میں بھی چاہوں گا۔"

"اچھ......ا......اچھی......بات ہے۔"

"ہمم۔ یہ تو ہے تو اب میں رکھوں فون؟ جانا ہے، وہ انتظار کر رہی ہوگی۔"

وہ دو لمحے چپ رہی۔۔

"مطلب کہ ہم نہیں مل رہے؟"

"کل تک چلی جاؤں گی میں صاد۔"

"اچھا...... مگر آج تو......" سوچ میں پڑ گیا۔

"زیادہ وقت نہیں لوں گی بے فکر رہو۔"

"اچھا۔۔۔ چلو ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ کہاں ملوں؟"

اس نے اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ کا بتا دیا۔

☆☆☆

"مسکراہٹ کتنی مہنگی ہو جاتی ہے بعض دفعہ۔"

سی سائیڈ پر ماہ روز، مینا بیگم اور شفیع صاحب کو محظوظ کر رہی تھی۔ اپنی باتوں اور حرکتوں سے اور اس نے سوچا کہ جب سے شادی ہوئی ہے وہ تو ماں باپ کو کوئی مسکراہٹ تک نہ دے سکی۔

منیب اس کے ساتھ آ بیٹھے۔

"چلو بے وفاؤں کو بھول جائیں۔"

"اچھا۔ آپ نے تو کہا تھا کہ آپ بھول گئے اسے۔"

"بھول ہی گیا تھا، کل پھر یاد آ گئی۔"

"کل کیا ہوا؟"

"کل اپنے منگیتر کے ساتھ گھوم رہی تھی۔ بڑی خوب صورت لگ رہی تھی۔ خریداری کر رہی تھی شادی کی۔"

"اچھا...... چلیں اچھا ہے۔"

"آپ بھی اپنے لیے کوئی منگیتر ڈھونڈ لیں اب۔ خریداریاں کرتے رہیں اس کے ساتھ مل کر۔ وہ بھی کبھی ایسی کسی جگہ پر دیکھے گی تو جلے گی، جل کر کوئلہ ہو جائے گی۔"

"دفع کرو۔" ہنسنے لگے۔ "چلو ہم بھی ادھر چلیں۔"

"کدھر؟"

"جدھر امی ابا ہیں۔"

"ماہ روز ہے۔ دیکھو ماہ کتنی اچھی ہے۔"

"ہے نا۔ کبھی اس نے عتیق سے کوئی توقع نہیں رکھی، کبھی اسے غیر ضروری اہمیت نہیں دی۔ مجھے تو

... رشتے سے خوش بھی

ہے کہ نہیں۔"

"میں خود بھی اس بات پر حیران ہوتی ہوں۔ اسے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔ وہ فون کرے، نہ کرے۔ یاد کرے، نہ کرے۔ تحفہ بھیجے، نہ بھیجے۔ ملنے آئے، نہ آئے۔"

"اچھا ہے نا۔ اچھی بات ہے سب کچھ اپنے وقت پر جچتا ہے۔"

"ہم شاید غیر ضروری حساس ہیں منیب بھائی؟"

"پتا نہیں تارو۔ چلو اٹھو۔ ہم چلتے ہیں۔"

وہ اسے لے کر امی ابا کے پاس گئے۔ کچھ دیر بعد وہ سب ایک ساتھ ڈنر کرنے لگے۔ پھر آئس کریم کھانے چلے گئے — رات دیر سے گھر لوٹے۔ لوٹتے وقت ابا اور ماہ روز کی موسیقی پر بحث ہونے لگی۔

ماہ روز تیز میوزک لگا دیتی۔ ابا پھر غزل لگا دیتے، وہ پھر ہاتھ بڑھا کر بدل دیتی۔

امی، تارہ اور منیب پیچھے بیٹھے تھے۔ ابا اور ماہ روز کی مقابلہ بازی چلتی رہی۔ بالآخر ماہ روز جیت گئی، ابا جان بوجھ کر ہار گئے۔

گھر پہنچے تو رات کے ڈھائی بج رہے تھے، ابا، امی اپنے کمرے میں چلے گئے۔ منیب بھائی اپنے کمرے میں۔ کہہ تو رہے تھے کہ آج سگریٹ پیے بغیر ہی سو جاؤں گا۔ مگر اسے یقین تھا وہ ایک آدھ سگریٹ ضرور پییں گے۔

ماہ روز بھی لطیفے سناتی ہوئی سو گئی۔ رات صبح کے چار بجے میں ڈھل گئی اور صاد کا کوئی میسج۔۔۔ کوئی کال۔۔ کوئی آواز، کچھ نہیں آیا۔ کچھ بھی نہیں اور اس نے فون کی خالی اسکرین دیکھ کر سوئچ آف کر دیا اور سوچا کاش کہ زندگی کو بھی ایسے ہی سوئچ آف کر سکتی کہ پھر نہ انتظار رہتا، نہ شکایت رہتی، نہ صاد خان رہتا، نہ محبت رہتی۔

☆☆☆

وہ رات تین بجے لوٹا تھا۔ ماں ابھی تک جاگ رہی تھیں۔

"کہاں سے آئے ہو صاد! اتنی دیر...... صاد؟"

"دوستوں کے ساتھ تھا امی۔ آپ سو جائیں۔ کیوں جاگ رہی ہیں، اتنی دیر تک۔"

"تمہارا انتظار کر رہی تھی۔"

"ڈیڈی آئے؟"

"ہاں آ گئے۔"

"صاد سنو!"

"جی سنائیں۔"

"کل میں اسے لینے جاؤں گی۔ پلیز منع مت کرنا۔"

"اچھا۔" وہ کوٹ کندھے پر لیے رک سا گیا۔

"لے آئیے گا۔"

ماں کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

"تم......؟"

"نہیں...... میں نہیں جاؤں گا۔" کہہ کر کمرے میں چلا گیا۔ وہ کچھ مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں آ گئیں اور وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔

علینہ کے ٹیکسٹ تھے۔

ایک خوب صورت شام جو تمہارے ساتھ گزری۔ وہ مسکرایا اور اسمائلی بھیج کر فون رکھ دیا۔

وہ بہانے بہانے سے اسے ڈنر کی ٹیبل پر روک رہی تھی۔

پہلے چائے...... پھر ڈنر...... پھر گھومنا پھرنا۔ بار بار خود ہی کہتی تمہاری بیوی تمہارا انتظار کرتی ہوگی۔ پھر کہتی کہ اچھا ہوا تم نے فون آف کر دیا۔ کیا ہوا اگر ایک شام ہمیں بھی مل گئی تو کیا ہوا۔

رات دو بجے تک وہ ساتھ رہے، دو بجے اسے دوست کے گھر چھوڑا اور گھر آ گیا۔ عجیب محسوس ہو رہا تھا اسے۔ تارہ تو اسے بس پسند آئی اور مل بھی گئی۔ مگر یہ لڑکی...... کیوں اس کی طرف اچانک اس قدر کھنچ رہی تھی۔ بستر پر لیٹا تو اس کا فون تھا۔

"ہیلو۔"

UrduBooks.pk

''اب کیا ہوا؟'' وہ جھلایا۔ جیسے لڑکوں کے فون آنے پر لڑکیاں جھلاتی ہیں۔
''کچھ نہیں ہوا۔ نیند نہیں آرہی۔''
''تو میں کیا کروں پھر؟''
''مجھ سے باتیں کرو۔''
''وہ تو کر کے آیا ہوں۔''
''مزید باتیں کرو۔''
''تھک گیا ہوں۔''
''چلو میں بولتی ہوں، تم سنو۔''
''اوہ۔۔اچھا۔''
''وہ جاگ رہی ہے کیا؟''
''نہیں، سوگئی ہے۔'' صاد نے خالی تکیے کی طرف دیکھ کر کہا۔
''پھر مجھ سے بات کرو نا۔''
''اچھا کرو۔۔۔سن رہا ہوں۔''
''تھینک یو صاد!''
''کس بات کے لیے؟''
''اپنی شام دینے کے لیے۔''
''ارے۔۔یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں۔۔''
''میرے لیے بڑی بات ہے۔۔'' عجیب سحر برسار ہا تھا لہجہ۔
''اچھا۔واقعی۔''
''ہاں۔۔واقعی۔۔صاد!''
''ہمم......''
''تم خوش ہونا؟''
''میں سمجھا نہیں۔۔''
''اپنی بیوی کے ساتھ۔''
''ظاہر ہے، خوش ہوں۔۔''
''اچھا'' سوچ میں پڑگئی۔
''کیا سوچ رہی ہو؟''
''کچھ نہیں۔۔''
''پھر فون رکھیں؟''
''نہیں نا۔''
''صبح ہو رہی ہے یار! صبح دفتر جانا ہے اور تمہیں جاب پر۔۔''
''پھر۔۔کیا ہوا؟''
''پھر یہ کہ کچھ دیر سونے دیجیے میڈم!''
''اچھا۔۔۔چلو بخش دیا۔'' کہنے لگی تو وہ ہنسا۔
''چلو شکریہ۔۔اب سو جاؤ۔''
''کل بات کرو گے؟''
''کل کیوں؟''
''ایسے ہی۔۔۔۔''
''اچھا۔۔؟'' شوخی سے مسکرایا۔
''ہاں۔'' وہ ہلکا سا ہنسی۔
''ہاں کروں گا۔''
''روز بات کرو گے؟''
''روز کا نہیں کہتا۔ بیوی بگڑ جائے گی یار!''
''اچھا کل کرو گے نا؟''
''ہاں کل تو لازمی کروں گا۔ چلو گڈ نائٹ۔۔''
''گڈ نائٹ!''

☆☆☆

مسز شہروز، تارہ کو لینے آئی تھیں۔ تارہ خاموش تھی اور شفیع صاحب برہم۔ منیب چاہ رہا تھا وہ چلی جائے۔ ماہ روز بھی یہی سوچ رہی تھی مگر جب منیب نے تارہ کی آنکھوں کو دیکھا اس شکوے کو محسوس کیا جو حق بجانب تھا تو چپ رہ گیا۔
''اسے چاہیے تھا کہ وہ آتا۔'' وہ بس یہی کہہ سکا۔
''ہم بڑے ہیں۔''
''ہم۔آئے ہیں۔ یہ کافی نہیں کیا؟'' مسز شہروز بولیں۔ شہروز صاحب تو جب سے آئے تھے اکڑ کر بیٹھے تھے۔
''اچھے گھر کی بچیاں گھر چھوڑ کر نہیں بیٹھ جاتیں۔''
لہجہ دھیما مگر زہر سے بھرا تھا۔
''معاف کیجیے گا صاحب! مگر اچھے گھر کے لڑکوں کا بھی کم از کم یہ رویہ نہیں ہوتا، جو صاد بیٹے کا رہا ہے۔'' شفیع صاحب برہمی سے بول رہے تھے۔ مینا

بیگم نے دھیمار ہنے کا اشارہ کیا انہیں۔
"آپ ہماری بہو کو بلائیں۔" ان کا لہجہ رعب دار تھا۔
تارہ مل کر چلی گئی تھی۔
"ضرور بلائیں گے مگر آپ ہمارے داماد کو لائیے۔ ہمیں قصور تو بتائے ہماری بیٹی کا۔" مینا نے شفیع صاحب کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔
"وہ مصروف ہے۔"
"ہم لینے آئے ہیں۔"
"آپ بہو سے کہیں چلنے کی کرے۔"
لہجہ وہی اکڑ بھرا۔
"آپ کی بہو ہماری بیٹی ہے۔ کوڑے سے نہیں اٹھائی ہم نے۔ آپ صاد کو بھیجیں، ہمیں کچھ بات کرنی ہے۔ پھر ظاہر ہے بھیجیں گے ہی، بیٹی کا گھر نہیں خراب کرنا مگر ایک اصول ہوتا ہے۔"
"وہ نہیں آئے گا۔"
"تو پھر ہماری بیٹی بھی نہیں جائے گی۔" شفیع صاحب جیسے بات ختم کر کے اٹھے۔ شہروز نے بیگم کا سہارا لیا۔
"اٹھو بیگم!"
وہ پریشان ہو گئیں۔
"ارے نہیں۔ آپ پلیز ہماری بات سنیں۔" کہنے کو آگے بڑھیں مگر شوہر نے آنکھیں دکھائیں۔
"بس۔۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ اب یہ خود لے آئیں گے اپنی بیٹی کو۔۔۔" وہ بے بسی سے شوہر کے اشارے پر چلیں اور ادھر مینا بیگم نے سر تھام لیا۔ ماہ روز چپ رہ گئی منیب افسردہ اور تارہ بس دیکھتی رہی۔ شفیع صاحب کے چہرے پر دکھ تھا، غصہ تھا وہ تارہ کے سامنے گزرتے ہوئے رکے، اسے ساتھ لگایا مگر کچھ کہہ نہ سکے۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔

☆☆☆

دیکھتے ہی دیکھتے چار ماہ ہو گئے۔
گھر میں ماہ روز کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس گھر میں ایک نارمل بندی ماہ روز ہی تھی۔ باقی سب غیر ضروری حساس یا پھر مضبوط تھے۔ شفیع صاحب بڑے بڑے دکھوں کو ایسے پی جاتے تھے جیسے پانی پی لیا ہو۔ ماہ روز کا سر گود میں لئے بیٹھے رہے۔
"ابا۔۔"
"جی بیٹا!" وہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ وہ بچپن میں بھی اکثر ان کی گود میں سر رکھ لیتی تھی۔
کوئی دو تین بار ابا کہنے کے بعد اصل فرمائش کہتی۔۔
"ابا۔۔۔"
"جی میرا بچہ۔۔۔"
تیسری بار جواب کچھ زیادہ لگاوٹ بھرا آتا۔
"آپ خوش ہیں نا؟" بغیر سر اٹھائے ہوئے کہا۔
"میں خوش ہوں بیٹا۔"
"اس لیے کہ میری شادی ہو رہی ہے؟" اس بار سر اٹھا کر پوچھا۔
"ہاں۔ اس لیے کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔"
"ابا۔ بیٹیوں کی شادی کی خوشی زیادہ ہوتی ہے یا بیٹے کی شادی کی؟" بڑا معصومانہ سوال تھا، وہ مسکرا دیے۔
"سارے بچوں کی شادیوں کی خوشی ہوتی ہے، بیٹے کی شادی کی پہلے خوشی ہوتی ہے۔ جب تک اس کی شادی نہیں ہو چکی ہوتی اور بیٹی کی شادی جب ہو رہی ہوتی ہے تو ماں باپ سخت فکر مند ہوتے ہیں مگر جب ہو جاتی ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔"
"آپ تارہ کی شادی پر بھی اتنے ہی خوش تھے نا؟"
"ہاں۔۔۔ میں تارہ کی شادی پر بھی اتنا ہی خوش تھا۔" وہ کہتے ہوئے جیسے ڈوب سے گئے۔
"تارہ کا گھر بس جائے گا ابا۔ آپ فکر نہ کریں۔ بس وہ ذرا غیر معمولی حساس ہے۔ ذرا ذرا

سی بات دل پر لے لیتی ہے نا۔۔۔"

"ہاں میرا بچہ۔ مجھے یقین ہے۔" کہتے ہوئے ان کے یقین میں اتنی کمزوری کیوں تھی۔۔۔ وہ سوچنے لگی۔

"ابا۔۔"

"جی بچہ۔۔"

"ابا جی۔۔" پھر سے پکارنے لگی۔

"جی میری جان۔۔"

"ابا! تارہ کو کون سمجھائے۔ اسے سمجھانے میں تو منیب بھائی بھی ناکام ہو گئے ہیں۔"

"اسے خود سمجھنے دو ماہ۔ وہ سمجھ جائے گی۔ مجھے لگتا ہے وہ اچھے وقت کا انتظار کر رہی ہے۔"

"ابا۔۔"

"جی بچہ؟"

"ابا اگر میں کبھی روٹھ کر آؤں تو؟"

"اللہ نہ کرے ماہی!" وہ جیسے تڑپ ہی اُٹھے تھے۔

"ایسی باتیں تو نہ کرو بچے۔"

"ابا۔ فرض کریں نا۔۔"

"ابا کو پریشان کر رہی ہو۔" وہ خفا سے ہو گئے۔

"ارے...... آپ مجھے مت رکھیے گا۔ آپ مجھے کہیے گا نکلو یہاں سے، جاؤ...... اپنے گھر جاؤ۔"

"یہ میں تمہیں نہیں کہہ سکتا۔ کیوں کہ مجھ سے زیادہ یہ گھر تم تینوں کا ہے۔ باپ اپنے بچوں کے لیے گھر بناتا ہے تو میں گھر کی مالکن کو کہوں کہ نکلو؟ مرواؤ گی کیا۔" وہ بالکل آرام سے بیٹھ گئے دوبارہ اور معتدل ہو گئے۔

"مگر آپ مجھے کہہ دیجیے گا۔ تاکہ میں ایسا نہ کرسکوں۔ جو تارہ نے کیا ہے۔"

"تارہ بے قصور ہے ماہ۔" ایک باپ اپنی ایک بیٹی کے آگے دوسری بیٹی کی حمایت کر رہا تھا۔

"مجھے پتا ہے ابا مگر...... اسے چاہیے تھا وہ لڑتی صادے۔"

"پتا ہے مجھے اگر عتیق کہے گا کہ تم جاؤ۔ میں تب بھی نہیں جاؤں گی۔ میں اس سے لڑوں گی، جھگڑوں گی۔ اس کے گھر پر قبضہ کر کے بیٹھ جاؤں گی۔ اسے نکال دوں گی مگر میں وہیں رہوں گی۔"

"یہ ہوئی نا بات ماہی۔ مجھے تم سے یہی توقع ہے اور ایسا ہی کرنا۔ عتیق کی ایسی کی تیسی۔" وہ بھی ہنس دیے تھے۔ تارہ راہ داری میں کھڑی ان کی گفتگو سنتی رہی تھی اور اس کے ہونٹوں پر بھی مدھم مسکراہٹ تھی۔

"ابا۔۔" ماہ روز پھر سے گھٹنوں کے پاس بیٹھ گئی۔ چہرہ ابا کی طرف تھا۔

"جی میرا چندا۔" ابا کا لہجہ شہد جیسا میٹھا تھا۔

"ابا۔" ماہ روز کی آنکھیں یک دم بھر آگئیں۔

"ابا جی۔۔"

"جی ابا کی جان۔ کیا ہوا۔ کیا چاہیے میرے بچے کو؟" وہ بچوں کی طرح چمکار کر بولتے تھے۔

"ابا۔ مجھے تارہ کا بہت دکھ ہے۔" ماہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ابا اپنی انگلیوں سے پونچھنے لگے۔

"ابا۔" آواز درد میں ڈوبی تھی۔ اس بار وہ بغور ماہ روز کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"رونا مت ماہی!"

"ابا میں نے تارہ کو رات کو اٹھ کر روتے ہوئے دیکھا ہے۔"

ابا کی آنکھیں بھر آئیں۔

"ابا۔ وہ بہت دکھی ہے اندر سے۔ میں نے اس کی آنکھوں کو پڑھا ہے، دیکھا ہے۔ باتھ روم میں آنکھیں رگڑ کر باہر آتی ہے۔ اتنی جلدی وہ تھک گئی ہے ابا۔" ماہ روز کی آواز لگتا تھا کہرام برپا کر دے گی، ابا رو دیے۔ تارہ راہ داری سے دبے قدموں واپس لوٹ گئی۔

"ابا......" ماہ روز نے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔

"تارہ کے ساتھ اس نے کچھ برا کیا ہوگا ابا۔" آنسو ان کی آنکھوں سے بے اختیار بہہ نکلے۔ ان چار

UrduBooks.pk

مہینوں میں وہ پہلی بار روئے تھے کسی کے سامنے۔

☆☆☆

ماہ روز کمرے میں آئی تو تارہ نے اپنا سامان پیک کیا ہوا تھا۔ سوائے چند جوڑوں کو چھوڑ کر جن میں سے دو تقریبات کے لیے بنوائے تھے۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ماہ روز حیرت میں پڑ گئی۔ اسے کیسے الہام ہوا۔

''کیا تم بھی ڈراموں کی ہیروئنوں کی طرح دروازوں کے پیچھے کان دیے باتیں سننے لگی ہو تارہ بیگم۔'' وہ بہت سنجیدگی سے ماہ روز کو دیکھنے لگی اور پھر اپنے دو جوڑے جو پریس کیے تھے وہ ہینگ کر کے الماری میں رکھے۔

''بات کا جواب بھی نہیں دو گی کیا؟'' ماہ روز اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ پیلے رنگ کے جوڑے میں ملبوس ہاتھوں میں گجرے تھے۔ چہرے پر پیلاہٹ بھری سادگی۔ ہر ایک نقش دھلا دھلایا سا۔ سفیدی اور پیلاہٹ کا ملا جلا تاثر۔ پیشانی پر بکھرے بال اور بالوں میں لگا موتیے کا پھول۔ سب کچھ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ نکھرا ہوا روپ۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟ اتنی بھی حسین نہیں لگ رہی۔'' وہ مسکرائی تو اس کے چہرے پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

''بہت حسین لگ رہی ہو تم۔ خدا کرے ہمیشہ لگتی رہو۔ عتیق کو تصویریں بھیجوں؟''

''اب اس میں بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا۔''

''ایک بار نہیں سو بار بھیج دینا۔ مگر مجھے میری بات کا جواب دو۔'' وہ بھی ماہ روز تھی نام کی پکی، کام کی پکی۔

''کس بات کا جواب دوں؟''

''باتیں سن کر آئی ہو نا ہماری۔''

''ہاں۔۔ سن کر آئی ہوں۔''

''پھر؟''

''ڈراموں کی ہیروئن کی طرح؟''

''نہیں۔۔ فلموں کی ہیروئن کی طرح۔۔'' وہ روکھے انداز میں کہتی ہوئی بیٹھ گئی تو ماہ روز بھی اس کے سامنے کرسی کھینچ کر آ بیٹھی۔

''یہ تھیلا کس خوشی میں تیار کیا ہے تم نے؟''

''گھر جا رہی ہوں ماہ روز!''

''کون سے گھر؟''

''صاد خان کے گھر۔'' لمبی سانس بھری۔

''ابھی کہاں پر ہو؟''

''امی ابا کے گھر۔''

''تمہارا گھر کون سا ہے؟''

''پتا نہیں۔ شاید صاد خان کا گھر۔ شاید امی ابا کا گھر...... شاید...... کوئی گھر نہیں۔''

''غلط بات مت کرو تارہ۔ ہمارے ماں باپ نے ہمیں سطحی سوچ سے ہٹ کر پالا ہے اور سب کچھ ہمارے لیے بنایا ہے۔ یہ گھر جتنا میرا ہے، تمہارا ہے، منیب بھائی کا ہے۔ امی کا بھی شاید بعد میں ہوگا۔ چلتی تو یہاں ہماری ہے۔''

''یہ باتیں چار مہینے بعد کرنا تو پوچھوں گی تم سے ماہ روز بیگم۔''

''اچھا چھوڑو نا۔ باتوں کو دل پر نہ لو۔ سامان کھول دو ابھی۔ امی ابا اداس ہو جائیں گے ورنہ، ایک ہی وقت میں دو بیٹیوں کی رخصتی سہار نہیں پائیں گے۔''

''تمہاری شادی ہو جائے اس کے اگلے روز جاؤں گی ماہ۔ جانا تو آخر ہے نا۔''

''وہ ضد کہاں گئی کہ صاد خود منانے آئے۔''

''وہ نہیں آئے گا ماہ روز۔ وہ کبھی نہیں آئے گا۔ اسے پروا نہیں ہے، نہ معاشرہ اسے برا بھلا کہہ سکتا ہے، نہ اس کے گھر والے اسے مجبور کر سکتے ہیں۔ سب اعتراضات ایک عورت کے سر تھوپ دیے جاتے ہیں۔

میں نے سوچا تھا ماہ روز کہ میں اپنی انا پر قائم رہوں گی۔ جب میری کوئی خطا ہی نہیں تو میں کیوں جھکوں۔ کس کے آگے جھکوں۔ اس سیلفش

UrduBooks.pk

(خود پرست) بندے کے آگے جس نے ایک بار بھی مجھے نہیں بلایا۔"

"اس نے تمہیں مس تو کیا ہوگا تارہ! تکلیف تو اسے بھی ہوئی ہوگی۔ دکھ تو وہ بھی گزرا ہوگا۔ محبت تو اسے بھی تھی تم سے۔ تمہیں یاد ہے نا جب تم شادی کے بعد پہلی بار یہاں آئی تھیں اور وہ رات دیر سے تمہیں لینے آیا تھا۔ کیسے تمہاری کیئر کرتا تھا، کیسے آگے پیچھے پھرتا تھا۔ اس کی ماں نے بتایا تھا کہ تم اسی کی پسند ہو۔ کتنا خوش تھا وہ۔ پھر سوچا تم نے کہ کھوٹ کہاں سے آیا؟ کس طرح آیا؟ کبھی وجہ پر سوچا؟"

"بہت دفعہ سوچا ماہ روز۔ بہت دفعہ سوچا مگر کوئی رخ نہیں ملا۔ کوئی وجہ نہیں ملی، کوئی کوتاہی نہیں ملی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میری کوئی غلطی ہوتی تو سمجھ میں آتی۔"

"بس تمہاری ایک ہی غلطی تھی تارہ! جب اس نے کہا تھا نا کہ ہمیں الگ ہونا چاہیے، اس وقت تم اسے اپنی رائے بتا دیتیں کہ میں الگ ہونا نہیں چاہتی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ تمہارا کوئی امتحان لے رہا ہو۔"

"پاگل ہو گیا ماہی! وہ امتحان کیوں لے گا۔ پاگل نہیں ہے، وہ جانتا ہے میں اس سے کتنی محبت کرتی ہوں۔"

"چلو تمہاری کوئی غلطی نہیں تو اس سے وجہ تو پوچھتیں نا۔ بغیر لڑے آ گئیں۔ حد ہے۔ جھگڑتیں، برا بھلا کہتیں اسے۔ اس نے کہا الگ ہو جانا چاہیے تم نے مان لیا۔ اس نے کہا کہ جاؤ تو آ گئیں۔ اس نے وارڈ روب کھولی تو کپڑے اٹھا لیے تم نے اپنے...... اور پھر جب ان دنوں میں تم سے کہہ رہی تھی چلی جاؤ تو تم مجھ سے لڑ پڑیں۔ نہ اس خبیث کو فون کیا، نہ برا بھلا کہا، ایسے انجان بن گئے تم دونوں ایک دوسرے سے جیسے تم دونوں کے درمیان کوئی رشتہ ہی نہ تھا۔ حد ہو گئی۔"

"بس یہی بات ماہ روز یہی کہ میں اگر ایسی ہوں تو وہ اس سے بھی بڑھ کر نکلا۔ ایک بار مجھے فون نہ کیا، برا بھلا نہ کہا، احساس نہ دلایا۔ کوئی چھوٹا سا ٹیکسٹ میسج بھی کبھی کبھار بہت بڑی فیلنگ ڈس کلوزڈ کرتا ہے۔ اس نے تو وہ ٹیکسٹ بھی نہیں کیا۔ آیا بھی نہیں، اصرار بھی نہیں، معذرت نہیں، احساس بھی نہیں، ادراک بھی نہیں۔ مگر کچھ تو ہوتا...... جو مجھے اس کی طرف سے محسوس ہوتا، کچھ تو ہوتا ہی اور میری یہ غلطی تھی کہ میں انتظار کرتی رہ گئی کہ وہ آئے گا منانے مجھے۔"

"مگر اس کے پیرنٹس تو آئے تھے تارہ۔ تم چلی جاتیں یہی اچھا تھا۔"

"اس کے پیرنٹس آئے تھے، میں ان کی عزت کرتی ہوں مگر جب ان کے بیٹے کو میری ضرورت نہیں تو میں کیسے جاتی۔"

"اچھا چلو چھوڑو۔ اب کیا سوچا ہے۔ تم غصے میں منہ اٹھا کر جاؤ گی پھر کیا ہوگا؟ کیا ہوگا اس کا ری ایکشن۔"

"جو بھی ہو ماہ! میں اب ایک بار تو جاؤں گی۔ امی ابو بہت پریشان ہیں میری وجہ سے۔ ایک بار تو جاؤں گی پھر اس کا جو بھی رویہ ہو۔ اس کی پروا کیے بغیر۔" افسردہ بھی تھی اور اداس بھی۔

"چلو تم نے کوئی فیصلہ تو کیا۔ اب ایک پٹی منیب بھائی کو بھی پڑھا دو کہ اپنے بوسیدہ روگ سے نکلیں اور شادی کے لیے راضی ہو جائیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی مل جائے گی انہیں۔ بچپنے پر اترے ہوئے ہیں۔"

"ابھی آرام کرنے دو۔ کل مہندی کا فنکشن ہے، تم خود تو عیش کر رہی ہو ایک جگہ بیٹھے بیٹھے۔ ہمارا کام کر کر کے اور لوگوں کو مصنوعی مسکراہٹ دے دے کر برا حال ہو جاتا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے... سو جاؤ اور سنو تارہ! تم نے اچھا فیصلہ کیا ہے۔" وہ مسکرائی اس کی بات پر۔

"پتا نہیں ماہ! بس کیا ہے، اب دیکھتے ہیں وقت کیا نتائج دیتا ہے۔"

☆☆☆

وہ ماہ روز کی شادی کے اگلے دن گھر سے نکل

UrduBooks.pk

رہی تھی۔ شفیع صاحب نے منیب کو گاڑی کی چابی دی کہ اسے چھوڑ آئیں۔

"آؤ گی کب پھر؟" شفیع صاحب کچھ دل گرفتہ سے تھے۔

"شفیع! اسے جانے تو دیں۔" مینا بیگم چڑ گئیں۔

"جلدی آؤں گی ابا۔" وہ خود بھی بہت مایوس تھی۔

منیب نے راستے میں اسے آئس کریم کھلانے کے لیے آئس کریم پارلر کے سامنے گاڑی روکی۔

"یہ آپ سب لوگ میرے ساتھ ایسے کیوں بی ہیو کر رہے ہیں جیسے میں کہیں بہت دور جا رہی ہوں اور سالوں بعد میری واپسی ہونی ہے۔" وہ گاڑی میں ہی بیٹھی تھی۔ جب منیب آئس کریم لے آئے۔

"پتا نہیں۔ تمہارے شوہر سے کچھ بعید نہیں ہے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ پھر چھوڑے نہ چھوڑے۔"

"آپ شادی کر لیں منیب بھائی! امی ابا بہت اکیلے ہو گئے ہیں۔"

"میں کر لوں گا شادی۔" انہوں نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

"وہ تو مجھے بھی پتا ہے۔ آپ کے لیے کوئی لڑکی دیکھوں؟"

"تم سے یہ کام نہیں ہو سکے گا۔"

"ماہ روز کو پیچھے لگا دوں؟"

"وہ تو بس توبہ ہے۔" کہتے ہوئے ہنسنے لگے۔ وہ بھی ہنسنے لگی۔ گھر پہنچی تو عجیب انداز میں دل لرز رہا تھا۔ گیٹ پر ہی ہلکی سی کپکپاہٹ محسوس ہوئی۔ اتنے عرصے بعد لوٹنا، دو سال بہت ہوتے ہیں کسی کو دور کرنے کے لیے۔ عادتیں ختم ہو جاتی ہیں، سوچیں بدل جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ بندے بدل جاتے ہیں جو مر جاتے ہیں ان کا سوگ مدھم پڑ جاتا ہے اور جو زندہ بچھڑ جاتے ہیں بھلا دیے جاتے ہیں۔ اسے پتا تھا اس گھر کے رہنے والے بھولے نہ بھی ہوں تو ان کے اندر اسے خوش آمدید کہنے والا جذبہ ہرگز نہیں ہو گا۔

اس پر اس کا لوٹنا جیسے کوئی مجرم بالآخر نادم ہو کر لوٹتا ہے۔ اپنی تمام غلطیاں سر تسلیم خم کر کے لوٹتا ہے۔ وہ بہت فکرمند تھی اندر ہی اندر۔

"آپ چلے جائیں۔" گاڑی گیٹ کے پاس رکی۔ وہ ہارن دینے لگے تھے جب تارہ نے کہا۔

"میں اندر چلی جاؤں گی۔" وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگے۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں گا تارہ۔"

"نہیں، منیب بھائی! آپ جائیں۔ میں چلی جاؤں گی۔" وہ دیکھ رہے تھے کہ وہ گھبرا رہی تھی۔

"ہرگز نہیں۔" انہوں نے ہارن دیا، گیٹ کھلا۔ گاڑی اندر بڑھا لے گئے۔

"تمہیں لاوارثوں کی طرح نہیں بھیج سکتا اندر۔" وہ بگڑ گئے تھے۔ گاڑی روکی اور پہلے خود نیچے اترے پھر اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ اتری دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ تارہ کا بیگ لے کر اندر آئے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے اس کے ساتھ، سامنے کوئی نہ تھا۔ ملازم نے بتایا کہ بیگم صاحبہ صاحب کے ساتھ ہسپتال گئی ہیں البتہ صاد صاحب ہیں گھر پر۔ منیب بھائی نے ملازم کو اسے بلانے کی ہدایت دی۔ تارہ اس گھر میں مہمانوں کی طرح بیٹھی تھی جہاں بھی بیاہ کر آئی تھی اور جس گھر کو اپنا سمجھا تھا۔ صاد کمرے سے باہر نکلا بے ترتیب بال، ہلکی سی شیو میں بھی وہ خوبرو لگ رہا تھا۔

اسے دیکھتے ہی جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ جہاں کھڑا تھا ویسے ہی کھڑا رہا۔

"السلام علیکم!" منیب نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"وعلیکم...... السلام......" بغیر گرم جوشی کے ڈھیلے انداز میں ہاتھ ملایا۔

"تارہ کو لے آیا ہوں۔" انہیں کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کیا کہیں۔

"بہت جلدی خیال آیا۔" وہ تو نشتر ہی چبھوتا تھا۔

URDUBOOKS.PK

"جو تمہیں کبھی آنا نہیں تھا۔" منیب بس اتنا کہہ سکے۔ وہ بے دلی سے کھڑا رہا۔ خاموشی سے ایک نگاہ تارہ پر ڈالی۔

وہ دو سال بعد بھی اتنی ہی حسین لگتی تھی آنکھوں کے گرد بس حلقوں کا اضافہ تھا جن کی وجہ سے اس کا چہرہ تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ اس نے زبردستی نظر ہٹائی۔ اسی وقت کمرے سے علینہ نکلی تھی اور انہیں سامنے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ علینہ...... نئی نویلی دلہن جیسا روپ لیے۔ نکھری نکھری سی۔ باوجود اس کے تارہ کی شخصیت کے سامنے وہ دب جاتی تھی، دونوں مقابل کھڑی تھیں، تارہ حیران تھی۔

صاد کی طرف ہی دیکھے جارہی تھی، بے یقینی...... مانا کہ وہ خود سر تھا، مانا کہ وہ بے پروا تھا، مگر ایسا بھی کیا۔

"یہ کون ہے؟ تارہ...... تمہاری بیوی؟" علینہ کو جیسے دھچکا سا لگا تھا۔ صاد اسی جگہ کھڑا تھا۔

"آپ کون ہیں؟ آپ کی تعریف؟" منیب نے پوچھا تھا۔

"میں ظاہر ہے، صاد کی بیوی ہوں۔" عجیب جتانے والا انداز تھا اس کا۔ تارہ صرف صاد کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی یہ شخص کس حد تک دغاباز ہوسکتا ہے اور صاد کسی ایک جگہ نظر نہیں ٹکا پایا بظاہر ــــ اس کا رویہ بہت لاپرواہانہ تھا۔

"تو ظاہر ہے۔ یہ بھی ان کی بیوی ہیں، جنہیں دو سال پہلے یہ بیاہ کر لائے تھے اس گھر میں۔" منیب کا لہجہ بہت کٹیلا تھا۔

"مگر اب ان دونوں کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے۔ کس حوالے سے آپ منہ اٹھا کر یہاں آئی ہیں۔" وہ اس بار تارہ سے مخاطب تھی۔

"ظاہر ہے صاد کی بیوی کی حیثیت سے ہی آئی ہے۔" اس بار بھی تارہ کے بولنے سے پہلے ہی منیب بھائی بول پڑے تھے۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے؟" وہ مڑی صاد کی طرف۔ صاد بت بنا کھڑا تھا۔

"میں کیا سن رہی ہوں صاد؟ یہ آدمی کہہ رہا ہے کہ یہ لڑکی اس گھر میں تمہاری بیوی کی حیثیت سے آئی ہے؟"

"تم کمرے میں جاؤ۔ میں بات کرتا ہوں ان سے۔"

"مجھے میری بات کا جواب دو۔" وہ تقریباً چلائی۔

"شٹ اپ۔ شٹ اپ۔ آہستہ بولو۔ اندر جاؤ۔" وہ اس سے زیادہ بلند آواز میں چیخا تھا۔

علینہ کچھ لمحوں کے لیے حیران رہ گئی۔

"تم نے کہا تھا تم نے اسے چھوڑ دیا ہے۔" اس کی آواز میں اب دکھ تھا، شکوہ تھا۔ عجیب کرب تھا۔

"میں نے کہا تھا چھوڑ دیا۔ چھوڑنے کا مطلب ضروری نہیں کہ وہی ہو جو تم سمجھ رہی تھیں۔ دیکھو تم اندر جاؤ۔" اس بار اس کی آواز نرم تھی۔ وہ چالاکی سے کام لے رہا تھا۔ وہ اسے دکھ سے دیکھنے لگی۔

"اسے کہو یہ واپس چلی جائے ورنہ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔" دھمکاتی ہوئی کمرے کی طرف جارہی تھی اور ایسے دیکھتی جارہی تھی جیسے چھوڑوں گی نہیں کسی کو اور منیب بھائی، تارہ کی طرف ایسے دیکھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں کہ "دیکھو یہ عورت ہے...... اسے دیکھو اور پھر اپنی بزدلی کو دیکھو۔" تارہ تو خود پہ حیران تھی۔

صاد کو جاننے کے باوجود بھی وہ خدا جانے اس سے ہمیشہ اچھی امید کیوں رکھ لیتی تھی۔

"دو سال بعد میری زندگی اجیرن کرنے کا خیال تمہیں کس نے دلایا؟" وہ تارہ سے مخاطب تھا۔

"دو سال تک تمہیں ہوش نہیں رہا کہ تمہاری بیوی کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟" منیب بھائی ہمیشہ کی طرح بول پڑے اس کے حق میں۔

"تم سے بات کر رہا ہوں میں۔" وہ منیب کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے تارہ سے ــــ

UrduBooks.pk

مخاطب تھا۔

''تمہیں مجھے چھوڑنا ہی تھا صاد! کم از کم بتا تو دیتے۔ اطلاع تو کر دیتے۔ چھوڑنا ہی تھا تو پوری طرح چھوڑ دیتے۔'' وہ اب بھی دکھی تھی۔

صاد کو نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ محسوس ہوا تھا۔

''ظاہر ہے تم نے لوٹنا نہیں تھا۔ مجھے شادی کرنی پڑی۔''

''کیوں تم نے لوٹنے کا کہا تھا اسے؟'' منیب اسے خونخوار نظروں سے گھورنے لگے۔

''کیوں میرے والدین نہیں آئے تھے اسے لینے کے لیے؟'' وہ اب پتے کھیل رہا تھا۔

''والدین کے ساتھ شادی نہیں ہوئی تھی اس کی، تمہارے ساتھ ہوئی تھی۔ تم آئے تھے؟ کوئی خبر کوئی فون، کوئی میسج تک بھی نہیں۔ تم جیسے مرد ہوتے ہیں جو کسی عورت کو اپنے ساتھ باندھ کر یوں چھوڑ دیتے ہیں اور اس جیسی مسکین عورتیں ہوتی ہیں جو شعور رکھنے کے باوجود بھی صابر بن کر انتظار ہی کرتی رہتی ہیں شوہروں کے لوٹنے کا۔''

صاد نے کندھے اچکائے۔

''بہر حال مجھے نہیں اندازہ تھا کہ اس کا لوٹنے کا کوئی ارادہ ہے۔ میں نے شادی کرلی۔ اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔'' اس وقت وہ تارہ کو گھٹیا ترین آدمی لگا تھا دنیا کا۔ دل چاہ رہا تھا وہ اس پر تھوک دے۔ اس کی محبت پر تھوک دے۔ جس کا دعوا اس نے شادی کے بعد کیا تھا اور خود کو صاد خان کہلاتا تھا۔

''تم نے آج تک اسے نکالنے کی وجہ بتائی؟'' منیب بھائی بڑی مشکل سے خود پر ضبط کیے ہوئے تھے۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ صاد خان کے گھر میں کھڑے ہو کر اس کا منہ توڑ دیں۔

''یہ خود ہی گئی تھی۔''

تارہ نے حیرانی سے دیکھا اسے۔

''تم نے مجھے جانے کے لیے نہیں کہا تھا؟''

''میں نے صرف یہ کہا تھا کہ اب ہمیں الگ ہو جانا چاہیے۔ ہم ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔''

''تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے صاد خان؟''

''میں اپنی بات کر رہا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ ہم نہیں رہ سکتے ایک ساتھ۔'' وہ صاف جھوٹ بول رہا تھا، اس کی آنکھوں سے دکھ رہا تھا۔

''جھوٹ مت بولو صاد!'' وہ ٹوٹ سی گئی تھی اس کے نت نئے روپ دیکھ کر۔

''میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔ ٹھیک ہے تم خود گئیں تو آنا بھی خود ہی چاہیے تھا۔ اگر نہیں آئیں تو میرا کیا قصور۔''

اتنی معصومیت۔ اتنا بھول پن۔ تارہ حیران تھی۔ منیب کا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔ تارہ نے ان کا بازو پکڑ لیا تھا۔

''منیب بھائی! رہنے دیں۔''

''تم چلو گی یا مزید کوئی تماشا رہتا ہے بننا؟'' وہ دکھ اور اذیت بھرے انداز میں تارہ سے مخاطب تھا۔

''آپ جائیے۔ میں فی الحال یہاں ہوں۔''

''تم پاگل ہو تارہ! اس بے غیرت آدمی کے پاس رکو گی؟''

''شٹ اپ منیب! میرے گھر میں کھڑے ہو کر تم مجھے بے غیرت کہہ رہے ہو۔ وہ میں ہوں یا کہ...... تم۔ ایک تو تم لوگوں کو دو سال بعد ہوش آیا ہے، اوپر سے میرے ہی اوپر چڑھ دوڑے ہو۔ حد ہو گئی۔''

''لعنت بھیجو اس خبیث پر اور چلو۔'' منیب تارہ سے مخاطب تھے۔

''تم پھر حد سے بڑھ رہے ہو۔'' صاد کا انداز للکارنے والا تھا۔

''حد میں تو تمہیں نہیں رکھا ہم نے۔ تب ہی یہ صورت حال دیکھنی پڑ رہی ہے۔'' وہ بپھر کر آگے بڑھا تھا دو قدم کہ تارہ آگے آ گئی۔

''کچھ تو حیا کر لو صاد! کچھ تو لحاظ کر لو۔ مجرم بھی ہو اور اکڑ بھی رہے ہو۔ میرے سامنے میرے بھائی کو بے عزت کر رہے ہو۔'' تارہ پہلی بار بولی تھی۔

''اپنے بھائی سے کہو کہ عزت چاہتا ہے تو شکل گم کرے اپنی یہاں سے۔ ابھی اور اسی وقت۔'' منیب

UrduBooks.PK

کچھ کہنے لگے جب تارہ نے انہیں روکا اشارے سے۔

"آپ جائیے۔ میں آجاؤں گی۔ فکر نہ کریں اس بار لوٹوں گی تو بات کرکے، اپنا جرم پوچھ کر اور دوسروں کا جرم ثابت کرکے۔ آپ جائیے۔" منیب بے یقینی سے اسے دیکھنے لگے۔

"تارہ! تم یہاں اکیلی......"

"مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ جائیں۔ امی ابا کو فی الحال کچھ نہ بتائیے گا۔ میں خود آکر بتاؤں گی۔" یہ ایک دم سے تارہ اتنی باہمت کیسے ہوگئی، وہ سوچنے لگے۔

"تارہ......تم......"

"منیب بھائی! پلیز۔" وہ بے چارگی سے نکل گئے۔ صاد نے اپنا کالر ٹھیک کیا۔

"کیا جرم ثابت کروگی تم مجھ پر؟"

"جرم ایک ہو تو بتاؤں۔ خیر جلدی کیا ہے، ابھی یہیں ہوں۔ میرے کمرے میں رکھا ہے اسے تم نے؟"

"اس کا بیڈروم الگ ہے۔" وہ چاہتے ہوئے بھی اسے لوٹ جانے کا نہیں کہہ پارہا تھا۔

"تمہارے رکنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے ویسے مگر......مرضی ہے تمہاری۔ دل جلانا چاہو تو رک جاؤ۔ ہاں مگر علینہ کی ذمہ داری میں نہیں لے سکتا۔ وہ کچھ بھی کرسکتی ہے۔" وہ اسے علینہ سے ڈرا رہا تھا۔ اس بار تارہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"شکریہ کہ تم نے میرا کمرا اسے نہیں دیا۔"

"وہ اپنی جگہ الگ بنانے کی عادی ہے۔ کسی اور کی چیزوں پر حق جمانا جائز نہیں سمجھتی۔ خوددار ہے وہ۔"

"اچھا۔ کمال ہے ویسے۔ کسی اور کے بندے پر حق جمانا جائز ہے۔" اس نے سوٹ کیس اٹھالیا۔ کمرے کی طرف بڑھی اور وہ وہیں صوفے پر بیٹھ گیا کچھ دیر کے لیے۔ اس کے لیے یہ صورت حال غیر متوقع تھی۔

الجھے ہوئے دماغ کے ساتھ امی ابا کے انتظار میں وہ وہیں بیٹھ گیا۔ دوسری طرف علینہ نے کمرے میں توڑ پھوڑ مچائی ہوئی تھی

☆☆☆

وہ کمرے میں آئی تو ہر شے جوں کی توں موجود تھی۔ فرنیچر، اشیاء اسی طرح یہاں تک کہ وارڈروب میں اس کے جوڑے اور ضرورت کی چیزیں ثابت پڑی تھیں۔

ایسے۔۔ جیسے ابھی تک کسی نے کسی چیز کو ہاتھ تک نہ لگایا ہو۔

کمرے میں گرد کا نام ونشان تک نہ تھا۔ جس سے ثابت تھا کہ روزانہ نہیں تو ہفتے میں ایک بار اس کمرے کی صفائی کروائی جاتی ہے۔ صاد کی کچھ اشیا ایش ٹرے سمیت مختلف جگہوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ ایش ٹرے میں سگریٹ کے بجھے ہوئے ٹوٹے موجود تھے۔

اس نے اٹھا کر دیکھا، لگتا تھا آج ہی پیے گئے ہیں۔ وہ ٹوٹے پھینک کر بستر کی طرف آئی۔ بے شکن چادر دھلی دھلائی ہوئی۔ اس نے تکیے کے کور پر ہاتھ پھیرا اور بیٹھ گئی۔

سب کتنا عجیب لگ رہا تھا۔

فون بجنے لگا تھا۔ دیکھا تو منیب کا تھا۔ اس نے ریسیو کیا۔

"میں اپنے بیڈروم میں ہوں منیب بھائی۔ آپ فکر نہ کریں۔ نہیں اکیلی ہوں۔ آپ گھر جائیں پلیز اور امی ابا کو کچھ نہ بتائیے گا۔ میں خود آؤں گی۔ صاد سے ایک بار مجھے بات کرنی ہے، بغیر دکھ اور غصے کے۔ بغیر کسی جذبات کے۔ میں اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی۔ نہ غصہ کرنا چاہتی ہوں۔"

آواز میں نمی تھی۔

"مگر ایک بار تو پوچھوں گی اس سے کہ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔"

منیب پتا نہیں کیا کہہ رہے تھے۔ وہ بس خود بولے گئی۔

زندگی میں وہ ہوتا کم ہی ہے جو آپ سوچتے ہیں۔ وہ سوچتی تھی تو الجھ جاتی تھی۔ وہ اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ کیبنٹ کھولے تو اس کا دو سال پرانا شیمپو اسی حالت میں آدھی شیشی غیر استعمال شدہ پڑی تھی۔ صابن ایکسپائر، فیس واش اور کلینزنگ لوشن

UrduBooks.pk

سب اسی طرح تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے وہ واش بیسن کاؤنٹر پر رکھے ہوتے تھے اور اب کیبنٹ میں پڑے تھے۔ بیسن کے پاس ایک فریش سوپ اور شیمپو پڑا ہوا تھا۔ یہ صاد ہی استعمال کرتا تھا۔ مطلب وہ اس کمرے میں آتا رہا ہے مگر اس سب کا کیا فائدہ۔ کیا حاصل......

واش روم سے باہر آئی تو باہر کی آوازوں سے اندازہ ہوا، شاید وہ لوگ آگئے۔ اس نے سر پر دوپٹا لیا اور انہیں پریشان کرنے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

''تم نے کہا تھا تم اسے چھوڑ چکے ہو؟'' وہ کمرے میں اندر آیا تو آدھا کمرا الٹا پڑا تھا۔ کپڑے بکھرے، چادر نیچے لٹک رہی تھی سرک کر، ایش ٹرے الٹی پڑی تھی۔ سنگھار میز پر پرفیوم کی شیشیاں لڑھک کر گرگئی تھیں اور میک اپ کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح چلا رہی تھی۔

''ہوش میں آؤ علینہ! یہ کیا جاہلانہ طریقہ ہے بات کرنے کا۔'' اس نے گریبان چھڑاتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

''میں جاہل ہوں۔ تم جھوٹے ہو، دھوکے باز ہو۔''

''اچھا ٹھیک ہے، میں ہوں...... میں ہوں دھوکے باز، جھوٹا فریبی۔ مرا تو میں جا رہا تھا نا تم سے شادی کرنے کے لیے۔''

''ہاں مر رہی تھی...... میں ہی مر رہی تھی تم پر۔ ظالم، مگر جھوٹ تو نہ بولتے۔''

تارہ ان کے کمرے کے پاس آکر رک گئی۔ وہ چاہ رہی تھی وہ تحمل سے بات کرلے ان سے مگر علینہ کا شور سن کر رک گئی۔

''تو مت کرتیں میرے ساتھ شادی۔ پتا تو تھا کہ شادی شدہ ہوں، جکڑا ہوا ہوں۔ کیوں آئیں میرے پیچھے۔ کیوں نہیں چھوڑا پیچھا میرا تم نے۔ چھوڑ دیتیں۔ مت آتیں باتوں میں میری۔'' اسے اپنے آپ کو بچانا آتا تھا، وہ یہی کام کررہا تھا۔

''ہاں میں غلط تھی۔ غلط تھی میں پر کیا کرتی۔ محبت کرتی تھی تم سے۔ تم جیسے سفاک اور سیلفش انسان سے محبت کر بیٹھی تھی۔''

اس کے بعد وہ بول نہ سکی اور تارہ دروازے کے پاس رک نہ سکی۔ اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ وہ کیسی عجیب وغریب صورت حال سے دوچار ہونے آرہی ہے اس گھر میں۔

ساس اسے احساس دلا چکی تھیں کہ اس نے دیر کردی ہے لوٹنے میں اب کوئی فائدہ نہیں۔ سسر نے خفگی سے اس کے سلام تک کا جواب نہیں دیا۔ ملازم اسے مہمانوں کی طرح ٹریٹ کررہے تھے اور یہ شخص، یہ فریبی اور دھوکے باز شخص...... اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کو کیا کہے۔

وہ کمرے میں چلی آئی، رات کا کھانا اسے کمرے میں بھجوادیا گیا۔ گھر کے افراد کی طرح میز پر بلایا نہیں گیا تھا۔ اس حالت میں رکنا بے وقوفی تھا اور خاموشی سے چلے جانا بھی بے وقوفی تھی کہ صاد کے ساتھ اپنے رشتے کو اب اسے کوئی سے موڑ تو دینا ہی تھا اور اس کے لیے اس سے بات تو ہر حال میں کرنا تھی۔ اس سے کھانا نہیں کھایا جارہا تھا۔ اس نے ملازم کو کہا کہ کھانے کی ٹرے واپس لے جائے اور باہر نکل آئی۔

دم گھٹ رہا تھا جیسے۔ بالکنی کی طرف نکل گئی۔ یہاں اکثر وہ کھڑی ہوکر صاد سے باتیں کرتی تھی۔

''کیسی ہو؟'' وہ اچانک ہی آیا تھا پیچھے سے۔ تارہ نے مڑ کر بس ایک بار یقین کرنا چاہا کہ وہ کھڑا ہے۔

''کیسی نظر آرہی ہوں؟''

''مجھے الجھاؤ مت تارہ!''

''تم نے مجھے دو سال الجھا کر رکھا ہے صاد!''

''اب کیا چاہتی ہو؟'' وہ بے بسی سے بولا۔

''چاہ رہی تھی۔۔۔ مگر، اب کچھ نہیں رہا چاہنے کے لیے۔ تمہیں الزام دینے کا بھی فائدہ نہیں۔ جو سمجھنا نہ چاہے اسے کیا سمجھانا۔''

''اتنی ہی بد دل تھیں تو لوٹی کیوں ہو؟''

''کیا کروں صاد! مشرقی والدین کی بیٹی ہوں

UrduBooks.pk

ناں۔ انہوں نے کہا شوہر کہتا ہے نوکری چھوڑ دو، تو چھوڑ دینی چاہیے، میں نے چھوڑ دی۔ تم نے کہا نہیں رہنا چاہیے، میں نکل گئی۔ اگر اس رات کے بعد ایک رات بھی ٹک جاتی صاد خان! تو تم مجھے روزانہ گھر سے نکل جانے کا کہتے۔ روزانہ میں ایک بے غیرت زندگی گزارتی، اسی دن نکل گئی۔ تب بھی قصوروار میں ہی ٹھہری، تمہاری نظر میں بھی۔ تمہارے گھر والوں کی نظر میں بھی اور جب اپنے گھر والوں کی نظر میں بھی ٹھہری تو پھر سے تمہارے گھر آگئی۔ لو دیکھو۔ کتنی بے بس ہوتی ہے یہ مشرقی لڑکی۔ پڑھی لکھی، باشعور، سمجھ دار، خوب صورت...... سب کچھ ہے مگر نصیب اچھا نہیں۔" وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور بول رہی تھی۔

"مجھے تمہاری طرح زیادہ بولنا نہیں آتا۔ بس اب جو ہے سو ہے۔ ان حالات میں رہنا چاہتی ہو تو رہ سکتی ہو۔ البتہ اگر تمہاری یا تمہارے گھر والوں کی طرف سے ایسی کوئی ڈیمانڈ آئی کہ میں علینہ کو چھوڑ دوں تو ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"ایسا کیوں نہیں ہو سکتا صاد! تم مجھے چھوڑ سکتے ہو تو علینہ کو بھی چھوڑنا تمہارے لیے آسان ہی ہوگا۔"

"نہیں ہے آسان۔ محبت کرتی ہے وہ مجھ سے مر جائے گی۔" دکھی لہجہ تھا اس کا قابل ترس قابل رحم۔ وہ پھیکی مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے نظر پھیر گئی۔

"تم...... اگر رہنا چاہو تو رہ سکتی ہو۔"

"مر جائے گی تمہاری بیوی مجھے گھر میں دیکھ کر۔ جب سے آئی ہوں چیخ رہی ہے، رو رہی ہے۔ اسے وہ سب آتا ہے، جو مجھے نہیں آیا۔ رونا، چیخنا، اپنا حق لے لینا، جو مجھے نہیں آسکا اور جو مجھے آتا ہے وہ شاید وہ نہ سیکھ سکے۔ صبر کرنا، انتظار کرنا، راستے سے خاموشی سے ہٹ جانا۔"

"میں سمجھا تھا کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔"

"میں بھی سمجھی تھی کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ میں بھی غلط تھی صاد! ہٹ گئی منظر سے، اب بھی ہٹ جاؤں گی۔ فکر نہ کرو۔ بس بولنا آ گیا ہے مگر لڑ لڑ کر ہر روز تم سے اپنا حق نہیں لے سکتی۔ جیسے آئی تھی ویسے چلی جاؤں گی۔ پہلے اس امید کے ساتھ گئی تھی کہ تم منانے آؤ گے' اب کی بار یہ امید نہیں ہے تو کوئی فیصلہ ہو کر ہی رہے گا۔ کاغذات بھجوا دو یا زبانی کلامی آزادی دے دو مرضی ہے تمہاری۔" آج جیسے وہ دل پر آرا چلا گئی تھی، کہہ کر کمرے میں چلی گئی۔ وہ جہاں تھا' وہیں کھڑا رہا اور رات پچھلے پہروں سے کھسکتی رہی۔

☆☆☆

شفیع صاحب دفتر سے سیدھے صاد کے گھر چلے گئے تھے اور اسی وقت اتفاق سے منیب بھی وہاں پہنچے ہوئے تھے اور صاد بھی موجود تھا۔

صاد کی دوسری شادی کی خبر پر اس لڑکی نے ہنگامہ مچائے رکھا تھا۔ وہ خود پہلے حیرانی پھر پریشانی اور پھر کسی نتیجے پر پہنچنے کی سوچ رہے تھے۔ انہوں نے تارہ سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اس کے چہرے پر بھی اسی الجھن کے آثار تھے مگر وہ علیحدگی کا فیصلہ کر چکی تھی۔ صاد کا خیال تھا کہ وہ دو بیویاں رکھ سکتا ہے

دونوں کو ایک خوش حال زندگی دے سکتا ہے۔ خوش حال زندگی تو دے سکتا تھا مگر جذباتی وابستگی اور چھوٹی موٹی ناانصافیاں جو انسان کو تھکا دیتی ہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی ایک عمر سفر کرے، سفر میں رہے۔

ضرورتیں تو وہ بھی پوری کر سکتے تھے اس کی اور وہ خود بھی اتنی تو سکت رکھتی ہی تھی۔

بیٹی مضبوط ہوئی تو انہیں بھی ذرا حوصلہ ہوا۔ اس بار کمرے سے اپنی تمام اشیا کا وجود مٹا دیا، پھنکوا دیں، اٹھوا دیں۔ وہ سب کچھ خالی کر کے جا رہی تھی اور اسی لیے جب وہ گھر سے نکل رہی تھی۔ گئی تو وہ پہلے بھی تھی اور دو سال اس کی زندگی میں غیر موجود رہی تھی مگر جانے کیوں۔ صاد کا دل اسے چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں ہو رہا تھا مگر دوسری طرف علینہ تھی جسے اس نے خود اپنایا تھا۔ تارہ کو خود جانے کے لیے کہا تھا۔

پہلی بار تارہ کی وارڈروب اس نے خود کھولی تھی اور اس بار وہ وارڈروب کی درازوں میں تارہ کے استعمال کی چیزیں تلاش کر رہا تھا۔ اسے پہلے تارہ کا

URDUBOOKS.PK

افسردہ، مایوس اور اب شکایت بھرا مگر مضبوط اجنبی رویہ دکھ دے رہا تھا۔ یہ اس کی بھول تھی کہ دکھ دینے سے واپس نہیں ملتے۔ وہ طاقت کے زعم میں سب کر جاتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا تھا اس کو کہ یہ عورت جب دوبارہ اس کے گھر سے جا رہی ہے تو اپنے ساتھ چند گنی چنی استعمال شدہ چیزوں کے علاوہ کچھ اور بھی لے کر جا رہی ہے۔

جیسے کچھ بہت بڑی طاقت، جیسے دل کا سکون یا پھر یہ کہ دل۔

☆☆☆

دو سال گزر گئے تھے۔ محبت کا اصل مقصد حصول نہیں ہوتا، رسائی بھی نہیں ہوتا۔

البتہ محبت کا احساس محبت کرنا ضرور سکھا دیتا ہے۔ لیپ ٹاپ کی اسکرین چمکی تھی اور دو تصاویر لڑھکتی ہوئی نیٹ ورک کی لہروں پر سوار ہو کر اس تک پہنچیں۔ منیب بھائی اپنی بیوی سعدیہ کے ساتھ کھڑے تھے، مسکراتے ہوئے۔

تارہ نے انہیں بتایا کہ اصل محبت نہ بھی ملے تو ہمیں خود آگے بڑھ کر محبت کو محسوس کرنا ہوتا ہے۔

"اربیہ نے آپ کی قدر نہیں کی، کوئی بات نہیں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ محبت کی قدر کریں۔ سعدیہ خود بڑھی ہے آپ کی طرف۔ اس نے ہاتھ تھامنا چاہا ہے آپ کا۔ اسے انکار آپ کی حماقت ہی نہیں غلطی بھی ہوگی پھر دل کا دکھ تو آپ جانتے ہیں نا۔ اس کے دل کو دکھ دے کر آپ کو کیا ملے گا منیب بھائی۔"

خود محبت سے چوٹ کھا کر آئی تھی، شکستہ ہو کر اور انہیں مشورہ دے رہی تھی۔ منیب بھائی نے تارہ کا پاس رکھا اور سعدیہ سے شادی کر لی۔

اکرام صاحب نے بھی شرکت کی، ماں نے بھی۔ بہت عرصے بعد وہ ان سے ملے تھے۔ باذل اور اس کی بیوی نہیں تھے۔ باذل کا رویہ فیملی کے ساتھ کیا ہے اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا۔ باذل شادی کر کے نا صرف الگ ہو گیا تھا بلکہ کئی کئی دن بعد صورت دکھاتا تھا۔ اس کے پاس وقت نہیں تھا، وہ اپنی زندگی جینا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے اور اس کی فیملی کو زیادہ ڈسٹرب کیا جائے۔

اکرام صاحب بہت کمزور اور نڈھال سے لگ رہے تھے۔ شفیع صاحب نے انہیں واپس پاکستان سیٹل ہونے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ خود بھی یہی سوچ رہے تھے مگر دونوں بچوں کی وہاں شادی کروائی تھی۔ کاروبار بھی وہیں تھا۔

شفیع صاحب کو محسوس ہوا کہ انہیں کسی کی ضرورت ہے، بیٹے اور بیٹی کی شادی کے بعد وہ لوگ ان سے زیادہ تنہا زندگی گزار رہے تھے۔ تارہ کو بھی محسوس ہوا تھا۔ تارہ نے باپ سے مشورہ کیا۔ انہیں دل پر پتھر رکھنے کو کہا۔

مانا کہ منیب کو انہوں نے بیٹے کی طرح پالا تھا اور وہ اسے خود سے دور نہیں کر سکتے۔ مگر انصاف کا تقاضا یہی تھا کہ اب منیب کو اپنے ماں باپ کے ساتھ رہنا چاہیے۔ منیب بہت مشکل سے راضی ہوئے مگر بہرحال باپ کی حالت پیش نظر تھی اور شادی کے دو ماہ بعد شفیع بیٹے اور بہو کو خود لے گئے اکرام کے پاس۔۔۔ اور چھوڑ آئے۔

تارہ نے باپ کا بزنس تھوڑا بہت سیکھ لیا تھا اور ان کے ساتھ مل کر کام کرنے لگی تھی۔

اس کی ایک بار اربیہ سے بھی ملاقات ہوئی تھی، اس کے دو بچے تھے چھوٹے سے۔ وہ بظاہر ٹھیک تھی۔ مکمل تھی اس کی زندگی مگر آنکھوں کے اندر کوئی روشنی ایسی تھی جو کبھی کبھار مدھم پڑ جاتی ہو۔ تارہ کو لگا۔۔۔ وہ اندر سے کچھ نامکمل ہے یا پھر افسردہ۔ تارہ نے اسے پہچان لیا تھا اور اسے مخاطب کیا۔

بہت دیر تک وہ دونوں بیٹھی باتیں کرتی رہی تھیں پھر اچانک ہی اس نے خود ہی تارہ کو بتایا تھا کہ منیب کے پرپوزل۔۔۔ کے انکار میں اس کی سوتیلی ماں کا ہاتھ تھا مگر وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی پھر منیب بھی جلدی پیچھے ہٹ گیا اور پتا نہیں کیسے یہ معاملہ ختم ہی ہو گیا۔ پھر اچانک بابر کا رشتہ آیا اور گھر والوں کو پسند

بھی آ گیا بظاہر بابر میں کوئی برائی بھی نہ تھی اور وہ ان دونوں کی پسندیدگی کے بارے میں بھی آگاہ تھا اور تارہ اس سے پوچھ نہ سکی تھی کہ آپ خوش بھی ہیں کہ نہیں۔ یہ پوچھنے کا فائدہ بھی نہیں تھا

اس نے منیب بھائی کو اریبہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ بس وہ ان سے سعدیہ کی باتیں کرتی تھی۔

ان دو سالوں میں وہ لوگ دو بار منیب سے ملنے گئے تھے۔ ایک ایک مہینے کے لیے اور منیب ایک بار آ چکے تھے اور اس بار بھی انہی کے آنے کا پروگرام تھا۔ ماہ روز اپنے گھر میں مگن تھی۔

سب کی زندگی کسی ٹھکانے جا لگی تھی

ایک تارہ تھی جو بظاہر مطمئن، مصروف مگر ماں باپ کو اس کی تنہائی کے احساس نے کہیں اندر سے مار رکھا تھا۔

☆☆☆

عماد ان کے دوست کا بیٹا تھا، سعودیہ سے آیا ہوا تھا۔ سعودی حکومت نے جب سے پاکستانیوں پر ٹیکسز کی اضافی بھرمار کی تھی۔ کئی فیملیز کے ساتھ وہ بھی گھبرا کر پاکستان لوٹ آئے تھے کہ جتنا کماتے تھے اتنا ٹیکس بھرتے تو زندگی کیسے گزرتی۔

یہاں آ کر فریدالدین صاحب نے ایک درمیانے درجے کا ہوٹل خرید کر بڑے بیٹے کے حوالے کیا تھا اور چھوٹا عماد جو تعلیم کے لیے ایک عرصہ پاکستان میں ہی رہا تھا۔ وہ یہاں آج کل جاب تلاش کر رہا تھا۔ شفیع صاحب کو ان کی فیملی اچھی لگی تھی پھر عماد سلجھا ہوا ٹھنڈے مزاج کا لڑکا تھا۔ خوب صورت، لمبا اور بھرے بھرے جسم والا چست اور خوبرو سا۔

وہ لوگ اس کے لیے لڑکی دیکھ رہے تھے اور ان کے ہاں دعوت پر آئے تو تارہ کو پسند کر گئے۔ عماد الدین نے بھی تارہ کے لیے ہامی بھر لی تھی اور تارہ کو غصہ تھا کہ یہ عجیب لڑکا ہے۔ ماں باپ نے کہا اور مان لیا۔ پہلے تو اس نے فون کر کے اسے سمجھایا کہ وہ غلط سودا کر رہا ہے۔ ایک اپنے سے دو سال بڑی عمر کی لڑکی، وہ بھی جو شادی شدہ رہ چکی ہو۔

پھر تم تو۔۔۔ خوب صورت پڑھے لکھے ہو۔ پاکستان میں تو تمہیں اچھی سی کنواری کم عمر لڑکی مل جائے گی اور اس نے بظاہر اسے جی ہاں۔ جی ہاں کہتے ہوئے فون رکھ دیا مگر اگلے ہی دن پھر اپنے والدین کو بھیج دیا مٹھائی کے ٹوکرے کے ساتھ۔

وہ پریشان ہو گئی۔ مگر شفیع صاحب کے ہونٹوں کی مسکراہٹ، اطمینان اور ماں کے اصرار کے سامنے بول نہ سکی۔

وہ دونوں کو دیکھتے ہوئے جانے کیوں پہلے چپ ہوئی پھر رو دی اور وہ دونوں پریشان ہو گئے۔

اس طرح تو وہ پہلے بھی نہیں روئی تھی۔ اتنے دکھوں میں بھی نہیں۔

وہ روئی تو شفیع صاحب پریشان ہو گئے اور اسے ساتھ لگا لیا اور خود بھی بے وجہ ہی رو دیئے۔ ماں مایوس ہو گئیں۔ پھر اٹھ کر چلی گئیں، ایک دم سے سارے ماحول پہ اداسی چھا گئی۔

اس کے رونے میں عجیب درد تھا، مایوسی تھی۔ ایسے جیسے وہ خود کو سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہو۔ وہ خود کو سنبھال سنبھال کر تھک گئی ہو ایسے جیسے اس کے لیے یہ سب ناقابل قبول ہو۔ ناممکن ہو یا پھر مشکل ہو یا پھر معیوب ہو۔

☆☆☆

اگلے دن شفیع صاحب فرید کے گھر چلے گئے۔ پریشان تھے اور گھبرائے ہوئے بھی۔ فرید ان کی طبیعت دیکھ کر کچھ فکرمند سے ہوئے۔

”تم مجھے بلا لیتے شفیع! میں آ جاتا۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو خود کیوں ڈرائیو کر کے آئے ہو۔“

”میں تمہیں بلا کر یہ خبر نہیں سنا سکتا تھا۔ میں نے سوچا خود جا کر تم سے معذرت کر آؤں۔“ وہ شکستہ بھی تھے اور شرمندہ بھی۔

”کیسی خبر شفیع؟ خیریت تو ہے پریشان لگ رہے ہو۔“

”یار...... مجھے لگتا ہے ہم نے جلدی کر دی اس رشتے کے بارے میں۔ دیکھو وقت دینا چاہیے تھا۔

UrduBooks.pk

بچوں کی زندگی کا معاملہ ہے۔"

وہ انکار سے پہلے کی تمہید باندھنا چا... ے۔

"ہم نے کوئی جلدی نہیں کی شفیع ... ن فیصلہ کیا ہے۔"

"وہ ٹھیک ہے فرید...... مگر......"

"مگر کیا۔۔۔ زیادہ مت سوچو۔۔۔ بس شادی کی تاریخ رکھ دو۔"

"فرید۔۔۔ عماد چھوٹا ہے تارہ سے۔۔۔ دیکھو اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو جائے۔"

فرید نے عماد کو بلا کر ان کے سامنے کھڑا کر دیا۔

"ہاں بھئی۔ بتاؤ تم خوش ہو اس رشتے سے؟"

"جی۔ بالکل خوش ہوں۔"

"اس طرح بولو کہ تمہارے انکل کو یقین آجائے بیٹے۔"

"انکل! میں اس رشتے سے سو فیصد خوش ہوں۔"

شفیع صاحب شرمندہ سے ہو گئے۔

"چلو اب تم جاؤ۔"

شفیع صاحب کے پاس بولنے کے لیے جیسے کچھ رہا ہی نہیں مگر رہ رہ کر تارہ کا یوں پھوٹ پھوٹ کر رونا بے چین کیے جا رہا تھا۔

"عماد بات کرے گا تارہ سے، تم فکر نہ کرو۔"

انہوں نے اپنے تئیں انہیں تسلی دے کر بھیج دیا تھا۔

☆☆☆

زندگی عجیب ہوتی ہے۔ آپ کو بہت سارے فیصلے دل کے لیے نہیں ـــــ بس زندگی کے لیے کرنے پڑتے ہیں۔ وہ اپنے دل میں صاد کے لیے ایک نرم گوشہ رکھتی تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے ایک مختصر سے عرصے میں محبت کی شکل اختیار کر گیا اور پھر وہ محبت بہت جلد ہی ناکارہ ہو گئی۔

وہ آخری بار جب اس گھر سے نکل رہی تھی تو اس نے صرف ایک بات سنی تھی صاد اور اس کی ماں کی گفتگو میں وہ پوچھ رہی تھیں۔

"تم نے تارہ کے ساتھ ایسا کیوں صاد! اسے کیوں جانے کو کہا۔" اس میں کیا کمی تھی؟"

اس وقت صاد نے صرف ایک جملہ کہا تھا۔

"میں اسی لیے اس کے ساتھ نہیں رہ پایا کہ اس میں کوئی کمی نہیں تھی۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ ان دونوں کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر چپ ہو گئے اور وہ نکل آئی۔ اس کے بعد صاد کی ہمت نہ ہوئی اس سے دوبارہ بات کرنے کی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے چاہتا بھی ہے۔ وہ اسے چاہے گا مگر اسے یقین تھا کہ وہ اسے بھی کسی اچھے مقام پر نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اسے خود سے زیادہ مضبوط پوزیشن میں دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتا۔

آج یہ اقرار اس نے بڑی بے چارگی میں کر دیا تھا۔ وہ محبت میں بھی حکومت کرنا چاہ رہا تھا حالانکہ محبت میں حکومت نہیں کی جاتی بلکہ محبت خود آپ پر حکومت کرتی ہے۔ وہ اس خود غرض آدمی کو چھوڑ آئی تھی تب ہی۔ اس کے بعد سب آسان ہونے لگا۔

☆☆☆

اور اسی صبح شادی کی پہلی رات کے بعد والی صبح جب منیب بھائی سعدیہ اور ماہ روز اس کے لیے ناشتہ لے کر آئے تو منیب بھائی نے پکن کے پاس کھڑے ہو کر اسے مخاطب کر کے کہا تھا۔

"تارہ! تمہیں یاد ہے نا؟ محبت ایک بار ہی ہوتی ہے مگر محبت ہمیں محبت کرنا ضرور سکھا دیتی ہے۔"

"مجھے پتا تھا آپ میرے سارے سبق مجھ پر دہرائیں گے۔" وہ مسکرائی۔ اس کے اندر کوئی جوش نہیں تھا۔

البتہ اطمینان ضرور اس کے چہرے پر تھا۔ وہ اطمینان جو صاد کے ساتھ رہتے ہوئے اس کے چہرے پر نہیں ہوتا تھا۔

زندگی دوبارہ چل پڑی تھی۔ اس نے اپنے اردگرد کئی طرح کے لوگوں کی زندگی اسی طرح کی دیکھی تھی۔ اس سے بھی زیادہ حیران کن 'بے کیفیت' خالی' کھوکھلی۔

تب بھی لوگ ہنستے ہیں، مسکراتے ہیں، جیتے ہیں۔ محبت کرتے ہیں۔ یہی زندگی ہوتی ہے۔ جو آپ کی قدر نہ کرے۔ اس کی زندگی سے نکل جاؤ، ورنہ عمر بھر

UrduBooks.pk

پٹتے رہ جاؤ گے۔ جو آپ کو چاہیے۔ اسے ایک موقع ضرور دو۔ اگر دے سکو۔ بشرطیکہ وہ چاہیے دل ہے۔ دل تب بھی کبھی کبھار ضدی ہوتا ہے، تنگ تو کرتا ہے۔ مگر جب محبت ملے تو...... تو محسوس کرتا ہے۔ دروازہ نہ کھولے۔ کھڑکی کا اک روزن ہوا دیتا ہے۔

آج ہم نے یوں ہی خوشی کرلی
دل جلاکر ہی روشنی کرلی
ڈوب کر تیری نیلی آنکھوں میں
غرق ہم نے تو زندگی کرلی

''تارہ۔'' عماد اس کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا۔

''آپ اس سے بہت محبت کرتی تھیں؟''

اس نے کچھ لمحے خالی آنکھوں سے عماد کی طرف دیکھا اور پھر رخ پھیرلیا۔

''کیا دوبارہ محبت شروع نہیں کی جاسکتی؟'' وہ اس وقت سادگی سے پوچھ رہا تھا۔ اسے حاصل کرنے کے باوجود بھی اس کی محبت کی طلب تشنہ تھی۔

''دوبارہ زندگی شروع کی جاسکتی ہے اور محبت...... محبت آپ کو محبت کرنے کا ہنر ضرور سکھا دیتی ہے۔''

منیب بھائی سے کہی گئی بات یاد آگئی۔

''اور راستے بھی تو کھولتی ہے؟'' وہ اس کے برابر کھڑا ہوا تو اس سے بڑا دکھنے لگا۔

''تم نے چھپ کر ہماری باتیں سنی ہیں...... ہیں نا۔''

''چھپ کر نہیں، میں پیچھے کھڑا تھا آپ کے۔ آپ مڑ کر دیکھتیں تو آپ کو یقین آتا کہ میں نے آپ سے شادی صرف اپنے لیے نہیں کی۔ آپ کے لیے کی۔ میرے پاس جو ہے وہ میں آپ کو دے سکتا ہوں۔

''میں آپ کو چھوڑ نہیں سکتا۔ میں آپ سے محبت کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم بہت اچھا بولنے لگے ہو چند دن میں ہی۔'' وہ مسکرائی اس کی بات پر۔

''آپ میرے لیے چائے بنا سکتی ہیں؟''

''میں تمہارے لیے چائے ضرور بناؤں گی۔''

وہ کچن کی طرف چل دی، اس کی بات کے جواب میں کہتے ہوئے۔

''میں بھی آپ کے لیے چائے ضرور بناؤں گا۔ جب آپ تھکی ہوئی ہوں گی۔''

''اچھا، شکریہ۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''اب یہ مت کہنا کہ تم میرے لیے بریانی بھی بناؤ گے۔'' وہ کچن میں کھڑی تھی اور وہ پیچھے آیا تھا اس کے۔

''آپ سکھا دیں گی تو وہ بھی بنالوں گا۔''

''اب اتنی بھی ظالم نہیں ہوں کہ تمہیں بریانی بنانا سکھاؤں۔'' وہ چائے کا پانی رکھتے ہوئے ہنس پڑی۔

''مجھے اس دن کا انتظار رہے گا جس دن آپ مجھ سے کہیں گی کہ تم میری دوسری محبت ہو۔''

وہ یہ تسلیم کر چکا تھا کہ اس کی پہلی محبت نہیں بن سکتا تھا۔ تب ہی چائے کا کپ لیتے ہوئے مسکرایا تھا۔

وہ اپنے حصے کا کپ لے کر کچن سے باہر آئی تو سوچنے لگی کہ محبت بھی بھلا پہلی، دوسری، تیسری ہوتی ہے کیا۔

''ہو سکتا ہے راستہ دیتی ہو۔ مگر رنگ بدلتی ہے کیا؟ شخص بدلتی ہے؟ مقام بدلتی ہے؟

اس کے دل نے بتایا کہ نہیں بدلتی۔ جہاں سے چلتی ہے وہیں اپنے نقش چھوڑ آتی ہے۔ مگر بڑھ جاتی ہے جیسے وہ کہتی تھی کہ راستہ دیتی ہے۔

زندگی گزارنی ہے، زندہ رہتی ہے اور یہ آخری احساس وقفے وقفے سے شکستوں کی تھوڑی بہت بھرپائی کرتا رہتا ہے۔

کبھی صبح کی سفیدی تو کبھی رات کی سرسراہٹ بن کر دل کی دہلیزوں پر دستک دیتی ہے اور اندر آجاتی ہے پھر حکومت کرتی ہے۔

اس کا مطلب اپنے حصے کا کھیل کھیلنا ہوتا ہے کہیں پہلی۔

تو کہیں آخری بن کر رہنا بھی اسے ناگوار نہیں ہوتا۔

☆

UrduBooks.pk

فرح حسین

جانا کہاں

آج ایسا کوئی پہلی بار نہ ہوا تھا۔ زندگی کی جتنی بہاریں وہ دیکھ چکی تھی۔ ہر دن اس کا معمول کے مطابق ہی ہوتا تھا کچھ نیا نہ تھا۔ مگر جو کچھ آج ہوا۔ اس نے اس کی سوچوں کا تسلسل رکنے نہ دیا، وہ کل کے دھلے ہوئے کپڑوں کو تہہ کرتے ہوئے مسلسل سوچے جا رہی تھی کہ صرف وہ ہی کیوں؟ اس کے ساتھ ہی کیوں؟ وہ تو نیک نیتی سے ہر کام کرتی اور کسی بھی زیادتی کو خاموشی سے برداشت کرتی آ رہی تھی پر اب نہیں جو کچھ اس کے ساتھ ہوا وہ اپنے بیٹے کے ساتھ نہیں ہونے دے گی۔

یاسر ایک بہت اچھا شوہر اور بہت اچھا باپ ثابت ہوا تھا۔ اس کا خیال کرتا، اس کا احساس کرتا لیکن اپنی ماں بہنوں کے سامنے مریم کے لیے کچھ بول نہیں سکتا تھا۔

مریم بہت چھوٹی تھی جب اس کے والدین ایک ٹرین حادثے میں اللہ کو پیارے ہو گئے تب اس کے مہربان خالد چچا نے ذمہ داری اٹھائی اور خوب نبھائی بیوی کے آگے کچھ بولنے کی جرات نہ کر سکتے تھے لیکن جس طرح اپنے بچوں کو تعلیم دلائی۔ مریم کو بھی اسی طرح تعلیم دلائی۔ ایک صرف تعلیم کا ہی معاملہ نہ تھا بلکہ یاسر کے لیے مریم کو بہو بنانے کا فیصلہ بھی خالد چچا اور رقیہ پھپھو کا تھا جس میں چچی چاہتے ہوئے بھی مخالفت نہ کر سکیں۔

مریم کے ننھیال میں صرف ایک ماموں ہی تھے جو بیرون ملک مقیم تھے کبھی کبھار عید تہوار پر اپنی بھانجی کو یاد کر لیا کرتے تھے اور کبھی کبھی کوئی معقول رقم بھی مریم کے لیے بھیج دیا کرتے تھے یہی بہت تھا کہ سال میں ایک بار یاد تو کر لیتے تھے۔ یاسر کی دو بڑی بہنیں نصرت آپا، راحت آپا تھیں اور ایک یاسر سے چھوٹا عامر، نصرت آپا راحت آپا یوں تو سسرال سدھار گئی تھیں پر لگتا نہیں تھا۔

نصرت آپا گورنمنٹ اسکول میں ٹیچنگ کرتی تھیں۔ اسکول سے واپسی میں وہ میکے آ جاتیں اور تو اور اپنے دونوں بچوں کا اسکول داخلہ بھی گھر کے قریبی

اسکول میں کروا دیا، سو بچے اسکول سے یہیں آجاتے۔ واپسی رات تک ہوتی تھی کبھی کبھی شام میں چلی جاتیں ایسا موقع شاذ ونادر ہی آپاتا تھا۔

راحت آپا جمعہ کے دن آجاتیں اور ہفتہ، اتوار گزار کے اتوار کی رات تک جاتیں۔ مسئلہ صرف آنے کا نہیں تھا دونوں بہنوں میں سے کوئی ہل کے پانی تک نہ پیتا تھا۔ سارا دن مریم گھن چکر بنی رہتی۔

احمد کے ہونے کے بعد اتنا ہو گیا تھا کہ صفائی اور کپڑے دھونے کے لیے ماسی رکھ دی گئی تھی، پر وہ صبح اپنا کام کر کے چلی جاتی۔ باقی پورا دن کچن کا کام، اپنے اور ان دونوں کے بچوں کو دیکھنا پڑتا۔ مگر چچی جان کسی طور بھی مریم سے خوش ہی نہ ہوتیں مریم نے بھی کبھی ان کی سخت مزاجی یا سرد مہری کو دل سے نہیں لگایا تھا کہ تھا ہی کون اس کا یہاں...... اس کے چچا، چچی ہی ماں باپ تھے۔

رقیہ پھپھو مہینے میں چکر لگاتی تھیں وہ مریم سے بہت محبت کرتی تھیں اور مریم کو بھی ان کا انتظار رہتا تھا وہ اپنی بھتیجی کو کام کرتے دیکھ کر کڑھتی تھیں پر اپنی بھابھی سے کچھ کہہ نہ سکتیں۔ پھپھو نے ہی یاسر کے لیے مریم کی بات اپنے بھائی سے کی تھی اور یوں یاسر کی شادی مریم سے ہو پائی کیوں کہ یاسر خود بھی مریم کو پسند کرتا تھا۔

☆☆☆

آج مریم جب دوپہر میں کچن کے سارے کاموں سے فارغ ہوئی تو نصرت آپا کے بڑے بیٹے علی نے احمد کو کھیلتے ہوئے زور سے دھکا دے دیا۔ احمد گرا تو اس کی ناک سے خون بہنے لگا مریم نے تیزی سے احمد کو اٹھایا اور علی کو ڈانٹا کہ ”احمد تو چھوٹا ہے۔ تم نے اتنی بری طرح سے دھکا کیوں دیا۔“

بس مریم کا یہ کہہ دینا تو جیسے غضب ڈھا گیا۔

”مریم! ایسا کیا کر دیا ہے میرے بیٹے نے، دھکا ہی تو دیا ہے کون سے ہاتھ پیر توڑ دیے جو تم میرے بیٹے کو اس طرح ڈانٹ رہی ہو۔ سنبھال کے رکھو اپنے بچے کو اور خبردار جو آئندہ میرے بچوں کو کچھ کہا۔“

نصرت آپا تو جیسے بھڑک ہی گئیں اوپر سے چچی کی بڑبڑاہٹ، احمد مستقل روئے جا رہا تھا کسی پر تو زور چلا نہیں اس کا احمد کو ہی ایک زور کا تھپڑ جڑ دیا۔ اس نے پہلے کبھی بھی احمد پر ہاتھ نہ اٹھایا تھا۔ لیکن آج اس نے اتنی زور کا تھپڑ مارا کہ اس کی انگلیاں احمد کے نرم گالوں پر چھپ گئیں۔

”یاسر سے میں آج ہی بات کروں گی۔“ اس نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اسے اب کرنا کیا ہے۔

”مجھے علیحدہ گھر چاہیے یاسر!“ یاسر جب کمرے میں آیا تو مریم کے منہ سے یہ بات سن کر حیران ہو گیا۔

شام سے وہ اس کا چہرہ دیکھ کر اندازہ تو لگا رہا تھا کہ ضرور آج کوئی بات ہوئی ہے کہ جس کی وجہ سے مریم کا چہرہ اترا ہوا ہے ورنہ وہ اتنے کاموں کو تن دہی سے سر انجام دینے کے باوجود ہشاش بشاش ہی رہتی تھی۔

”کیا بات ہے مریم؟“ اس نے مریم کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے ملائمت سے پوچھا۔

”مجھے علیحدہ گھر چاہیے میں اب یہاں نہیں رہنا چاہتی۔“ جہاں یہ بات سنتے ہوئے یاسر حیران پریشان تھا تو خود مریم بھی یہ بات کہتے ہوئے بہت ضبط سے کام لے رہی تھی۔ مریم نے کبھی چھوٹی سے چھوٹی فرمائش نہ کی تھی پھر یہ اتنا بڑا مطالبہ۔

”آپ جانتے ہیں یاسر! میں نے اسی گھر میں اپنا بچپن گزارا ہے اور جوانی کی حدود میں داخل ہوئی ہوں۔ شادی کے بعد یہی میرا میکہ اور سسرال ہے۔ بچپن سے آج تک پتا نہیں کتنی ہی بار، پتا نہیں کس کس بات پہ مجھے اپنے والدین کی کمی محسوس ہوئی۔ کتنی ہی بار بہن بھائی جیسے رشتوں کی طلب ہوئی لیکن میں نے اپنی اس تشنگی کو اس گھر کے ہی رشتوں سے مٹائی۔ چچا، چچی کو اپنے والدین اور اپنے ان کزنز میں ہی بہن بھائی تلاش کیے۔ پھر اللہ نے آپ جیسا جیون ساتھی

مجھے ایک نعمت کی طرح دیا۔ ہر زیادتی، ہر تھکاوٹ کو میں نے نظر انداز کر دیا، چچی جان کی زیادتیوں کو برداشت کرتی رہی اِن کی سرد مہری میں ہی اپنے لیے ممتا ڈھونڈتی رہی، آپ کی بہنوں کی بے جا فرمائش کو پورا کرتی رہی کبھی اُف بھی نہ کیا، میرے لیے یہ بہت تھا کہ آپ اور چچا جان میرا احساس کرتے ہیں میرا خیال کرتے ہیں۔ عامر نے ہمیشہ بھائی کی کمی کو پورا کیا۔ سب کی زیادتی کو میں نے برداشت کیا خاموشی سے لیکن جو کچھ میرے ساتھ ہوا، وہ میں اپنے بیٹے کے ساتھ نہیں ہونے دوں گی۔ نہ ہی خاموش رہوں گی مجھے بس علیحدہ گھر ہی چاہیے۔''

وہ بچوں کی طرح مچلتے ہوئے روئے جا رہی تھی یاسر نے اسے کندھے سے لگایا۔

''اچھا اچھا مریم۔ میری جان! تم رو مت۔ میں کچھ کرتا ہوں پہلے تم مجھے بتاؤ تو آخر ایسی کیا بات ہوئی ہے آج کہ تم نے اتنی بڑی بات کہہ دی۔'' یاسر اسے چپ کرانے کی کوشش میں لگا تھا۔ مریم نے آج کی پوری بات یاسر کو بتائی۔

''یہ ابتدا ہے یاسر! اگر آج میں کچھ نہ بولی تو کبھی نہ بول سکوں گی۔'' مریم نے یاسر کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تم جانتی ہو ناں مریم۔ امی سے میں کئی بار تمہارے حوالے سے کچھ کہنا شروع ہی کرتا ہوں کہ امی مجھے بیوی کا غلام ہونے کا طعنہ دینے لگتی ہیں کہ میں تمہاری حمایت اور بہنوں کی مخالفت کر رہا ہوں۔ امی میری کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتیں، میں بھی چاہتا ہوں کہ تم گھر کے باقی افراد کی ہی طرح ساتھ بیٹھو، بات چیت کرو اور ٹی وی وغیرہ دیکھو۔ میں تمہیں پورا دن کام کرتے دیکھتا ہوں تو میرا بہت دل دکھتا ہے۔ ابا بھی تمہارا احساس کرتے ہیں۔'' یاسر مریم کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''مجھے اب کچھ نہیں سننا یاسر! مجھے اس گھر میں نہیں رہنا ہے اب۔'' مریم نے یاسر کی بات کاٹ کر کہا۔

''دیکھو مریم! میں اس گھر کا سب سے بڑا بیٹا ہوں۔ عامر کی ٹیوشنز اتنی نہیں ہیں کہ وہ گھر کا خرچہ اٹھا سکے۔ وہ خود بھی جاب کی تلاش میں ہے۔ میں امی سے بات کرنے سے پہلے ابا سے بات کروں گا بس تم تھوڑا انتظار کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

یاسر اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔ پھر جب مریم سو گئی تو اس کی بے چینی دیکھتے ہوئے وہ یہی سوچے جا رہا تھا کہ مریم احمد پر ہاتھ اٹھا کر بہت افسردہ تھی اور اس سے زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ امی نے اپنے پوتے کا بھی احساس نہیں کیا۔

☆☆☆

دوسرے دن اس نے پوری بات ابا کے گوش گزار کی۔ علیحدہ گھر کی بات سن کر تو خود ابا بھی رنجیدہ ہو گئے تھے اِنہوں نے ہمت کر کے زبیدہ بیگم سے بات کرنے کی ٹھانی۔ بات شروع کرنے ہی والے تھے کہ نصرت آپا کے شوہر عمیر آ گئے۔

سلام دعا کے بعد عمیر نے نصرت کی طرف دیکھا تو انہوں نے منہ پھیر لیا۔

''انکل! آنٹی! مجھے آپ لوگ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ میں تو نصرت سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میرے گھر میں میری بوڑھی ماں بھی موجود ہے میرا نہ سہی پر میری ماں کا تو یہ خیال کرے۔ اسے نہ تو میرا احساس ہے نہ میرے گھر کا، صبح ہوتے ہی اسکول اور اسکول سے وہ یہاں آ جاتی ہے۔ میرے بچے بھی لازمی ہے ماں کے ہی ساتھ ہوتے ہیں۔ میرا گھر تو جیسے سرائے کی طرح ہے۔ گھر والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ بیوی کے ہوتے ہوئے بھی میں اور میری ماں بازار سے کھانا کھاتے ہیں۔ میں کئی بار نصرت کو سمجھا چکا ہوں پر اب بات بہت بڑھ چکی ہے۔'' عمیر نے اپنی بات مکمل کی۔

''تمہاری ماں میری ذمہ داری نہیں ہے۔'' نصرت نے فوراً کہا۔

''میں تو ہوں تمہاری ذمہ داری، میرا گھر تو ہے تمہاری ذمہ داری۔'' عمیر نے جواب دیا۔

UrduBooks.PK

"یہ اچھا ہے۔ جاب بھی کروں۔ میاں کو بھی دیکھوں۔ بچے اور گھر بھی دیکھوں اور پھر ان کی ماں کا بھی خیال کروں۔ جاب کرتے ہوئے میں اتنی ذمہ داریاں نبھا نہیں سکتی۔"

"تو مت کرو ملازمت، چھوڑ دو جاب۔ میں ہوں ناں کمانے کے لیے۔ میں پوری کروں گا تمہاری اور بچوں کی ضرورتیں، تم میری ذمہ داری ہو اور بچے بھی۔"

اس دوران عامر اور یاسر بھی اتفاق سے ایک ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ دونوں اندازہ لگا چکے تھے کہ بات کیا ہے۔

"عمیر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے نصرت! وہ گھر ہی تمہاری ذمہ داری ہے، شوہر کا، ساس کا خیال کرو۔ گھر کو گھر سمجھو اور دل لگاؤ اپنا وہاں۔" ابا نے نصرت سے کہا۔

"ارے کیا گھر کو گھر سمجھو، میری بچی اسکول میں بچوں کو پڑھا پڑھا کر تھک جاتی ہے اگر یہاں تھوڑی دیر کے لیے آ بھی جاتی ہے تو اس میں ناراضی والی کیا بات ہے عمیر میاں۔"

"تو پھر آنٹی یہ اپنی تھکن بھی اتارے اور رہے یہیں پر ہی۔ اور وہ جو رات میں سونے کے لیے بھی آتی ہے تو اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" عمیر بات کر کے کھڑا ہو گیا۔

"اور ہاں! تمہیں کیا ضرورت تھی یہ کہنے کی کہ گھر میں دل لگاؤ، کیا یہ گھر نہیں ہے اس کا کیا ہے جو اگر وہ آ جاتی ہے دوپہر میں کھانا وغیرہ کھا لیتی ہے۔" چچی نے توپ کا رخ چچا جان کی طرف موڑا۔

"لیکن اماں! یہ طریقہ غلط ہے عمیر بھائی کا گھر ہے، ان کی بیمار والدہ ہیں انہیں بھی تو دیکھنے کے لیے موجود ہونا چاہیے۔ آپ بلاوجہ حمایت کر رہی ہیں آپی کی۔" عامر نے ماں سے کہا۔

"بیٹا! تم تو چپ ہی رہو ابھی اتنے بڑے نہیں ہوئے ہو کہ مجھے سکھاؤ کہ کیا کرنا ہے کیا نہیں۔" عامر ماں کی بات سن کر باہر نکل گیا۔

"تم کیا کھڑی کھڑی باتیں سن رہی ہو۔ جاؤ جا کے ٹھنڈا شربت بنا کے لاؤ میری بچی کے لیے۔" چچی نے مریم کو ڈپٹ کر کہا جو دروازے پہ خاموش کھڑی تھی۔

"اماں! آپ نصرت آپا کی بے جا حمایت کر رہی ہیں یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔ آپ نصرت آپا کو ان کے گھر بھیجیں عمیر بھائی ہیں۔ ان کی امی ہیں۔ یہ اپنے گھر کو دیکھیں۔ مہینے میں ہفتے میں تو سمجھ آتا ہے پر یہ روز روز کا آنا۔ کسی طور بھی ٹھیک نہیں ہے۔" یاسر کی یہ بات سن کر تو چچی جیسے تھے سے اکھڑ گئیں۔

"یہ بیوی کی زبان بولنے کی ضرورت نہیں ہے، مجھے پتا ہے کہ تم نہیں تمہاری بیوی کے الفاظ ہیں۔ اسے تو ویسے ہی میری بیٹیوں کا آنا پسند نہیں ہے اور پھر مظلوم بن جاتی ہے۔ میسنی کہیں کی۔"

"اب یہ مریم کہاں سے بیچ میں آ گئی۔ اس نے ایسا کچھ نہیں کہا مجھ سے میں بھی آنکھیں رکھتا ہوں۔ دیکھتا ہوں سب۔" یاسر نے کہا۔

"اچھا اچھا جاؤ یہاں سے معلوم ہے مجھے سب۔"

یاسر نے اٹھنے میں ہی عافیت جانی، ابا کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ ابا یہی سوچ رہے تھے کہ ابھی تو۔ یاسر والی بات کہی بھی نہ تھی اور اتنا ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا اگر کہہ دیتے تو کیا ہوتا۔

☆☆☆

"مریم! مریم!" یاسر نے کمرے سے آواز لگائی۔

مریم جو نصرت آپا کو شربت پیش کر رہی تھی جلدی سے کمرے میں آ گئی۔

"تم اور احمد تیار ہو جاؤ۔ مجھے اپنے دوست کے گھر جانا ہے اس کے والدین عمرہ کر کے آئے ہیں میرا قریبی دوست ہے۔ باقی دوست بھی اپنی فیملی کے ساتھ مبارک باد دینے آئے ہیں۔ اس لیے تم بھی ساتھ چلو۔"

"پر ابھی میں نے رات کے لیے کھانا تیار کرنا ہے، جو سالن بنایا تھا وہ اتنا نہیں ہے کہ رات میں پورا

UrduBooks.pk

ہو جائے۔'' مریم نے کہا۔

''میں نے تم سے تمہارا پروگرام نہیں پوچھا۔ میں چینج کر کے آتا ہوں تم اور احمد ـــ تیار ہو جاؤ۔'' یاسر نے اس کی بات کاٹی۔

''اور چچی جان۔'' مریم نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

''وہ میرا مسئلہ ہے، جو کہا ہے وہ کرو۔'' یاسر نے تیزی سے کہا۔

مریم نے جلدی جلدی احمد کو تیار کیا اور خود واش روم میں گھس گئی۔ نکلتے وقت وہ چچی جان کو اللہ حافظ کہنے آئی تو وہ دوسری طرف منہ کر کے بیٹھی رہیں اور نصرت آپا آنکھیں بند کر کے لیٹی رہیں۔ ان کے بچے ٹی وی دیکھ رہے تھے، چچا جان نے باہر نکلنے کا اشارہ کیا کہ یاسر احمد کو لے کر باہر نکل چکا تھا۔

احمد بہت خوش تھا۔ یہ نہیں پتا تھا کہ کہاں جا رہے ہیں بس یہ پتا تھا کہ گھر سے باہر ہیں۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا کہ جب ویک اینڈ پر یاسر کوئی پروگرام بناتا تو نصرت آپا تو موجود ہی ہوتیں جمعہ کی شام فرحت آپا بھی آ جاتیں اور پھر دونوں بہنوں کا یہ قیام اتوار کی رات تک رہتا۔ یاسر چاہتے ہوئے بھی بیوی بچے کو باہر نہ لے جا پاتا کیونکہ اس کے پاس بھی۔ یہی چھٹی کے دن ہوتے اور ان ہی دنوں میں بہنیں آ جاتیں اور مریم ان کی خاطر تواضع میں لگی رہتی۔

دوست کے گھر سے واپسی میں کھانا انہوں نے باہر ہی کھایا۔ احمد تو خوش تھا ہی، مریم بھی بہت خوش تھی۔ پر بار بار اس کا دھیان اسی طرف جا رہا تھا کہ ان لوگوں نے کیا کھایا ہوگا۔ کس نے پکایا ہوگا۔ مگر یاسر کی ہمراہی میں ہر خیال پیچھے جاتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

دن گزرتے رہے آپا ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ گھر میں مچھلی بازار لگا رہتا۔ مریم گھن چکر بنی رہتی۔ آپا کے چکر میں اس کا ''مطالبہ'' کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ جمعہ کی شام میں رضا بھائی فرحت آپا اپنے دونوں بچوں کے ساتھ موجود تھے کہ اتنے میں عمیر بھائی بھی آ گئے، سلام کے بعد بچوں کو پیار کیا۔ نصرت آپا کو دیکھا جو اس وقت اپنے آپ کو کسی فاتح سے کم نہیں سمجھ رہی تھیں کہ ''آخر آ ہی گئے خود سے۔''

''نصرت! میں تمہیں اور بچوں کو لینے آیا ہوں۔ امی تم سب کو بہت یاد کر رہی ہیں۔'' عمیر بھائی نے نصرت آپا سے کہا۔

''کیوں؟ اب کیا ہوا، اس دن تو بہت چیخ پکار کر رہے تھے۔ بلاوجہ کا غصہ کر رہے تھے اب کیا ہوا۔'' وہ بولیں۔

''غصہ تو میرا جائز ہی تھا اور آج بھی میں امی کے کہنے پر آیا ہوں۔'' عمیر بھائی بولے۔

''اوہ! دیکھا امی! آج بھی یہ اپنی امی کے کہنے پہ آئے ہیں یعنی میری اور بچوں کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں۔'' نصرت آپا چچی کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

''بچے میری جان ہیں۔ اور تم، تم نے تو اپنی اہمیت خود کم کی ہے۔'' عمیر بھائی نے جواب دیا۔

''اچھا یعنی میں اگر تمہارے گھر کو دیکھوں تمہاری ماں کو دیکھوں تو سب ٹھیک ہے واہ بھئی واہ۔'' وہ بولیں۔

''کیوں مریم بھابھی نہیں دیکھتیں۔ تمہارے گھر کو، تمہاری امی ابو اور سب کو، کون رکھتا ہے ان کا خیال۔ وہ تو ان کا بھی خیال کرتی ہیں۔ جو ان کی ذمہ داری بھی نہیں ہیں۔'' عمیر بھائی نے کہا تو پاس بیٹھے رضا بھائی نے اپنی بیوی کی طرف ـ دیکھا کہ جیسے وہ خود بھی ایسے ہی حالات سے دوچار ہیں۔ فرحت آپا نے فوراً منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''مریم بھابھی کس طرح سے پورے گھر کو، اپنے شوہر اور بچے کی ذمہ داری نبھاتی ہیں اور احسن طریقے سے نبھاتی ہیں اگر میرا گھر اور میری ماں تمہاری ذمہ داری نہیں تو پھر یہ ان کی ذمہ داری کیسے ہوگئی۔

اماں، عمیر بھائی کی اس بات پر جز بز ہوتے پہلو بدل گئیں اور نصرت آپا کچھ نہ کہہ سکیں۔

UrduBooks.pk

"نصرت! میں تمہیں آخری موقع دینا چاہتا ہوں اگر تم نے اپنی ذمہ داریوں کو نہ سمجھا تو میں...... دوسری شادی کر رہا ہوں۔"

ایک بم تھا جو عمیر بھائی نے گرایا تھا نصرت آپا کے سر پر۔

"کیا کہا......؟" نصرت آپا کی آنکھیں مکمل کھل گئیں۔

"ہاں، میں دوسری شادی کرلوں گا پھر تم یہیں رہنا۔ جہاں تمہیں سکون میسر ہے بچوں کو میں لے کر جا رہا ہوں کہ یہ میری ذمہ داری ہیں۔" عمیر بھائی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"عمیر میاں یہ تم نے کیا بات کر دی؟" اماں نرم ہوتے ہوئے بولیں۔ "میں سمجھاؤں گی نصرت کو۔"

"میرے خیال میں سمجھنے سمجھانے کا وقت بہت آگے بڑھ چکا ہے۔" عمیر بھائی بولے۔

"نہیں نہیں بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں۔ نصرت! چلو تم تیاری کرو اور جاؤ عمیر کے ساتھ۔" چچی جان نے نصرت سے کہا۔

"نہیں آنٹی! ایسے نہیں، نصرت اگر میرے ساتھ گئی تو اسے میرے طریقے سے چلنا ہوگا یعنی جس طرح مریم بھابھی نے گھر سنبھالا ہوا ہے۔ یہی کچھ نصرت نے بھی کرنا ہوگا۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے عمیر بیٹا! جیسا تم چاہتے ہو نصرت ویسا ہی کرے گی۔"

انہوں نے نصرت آپا کو آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔ چونکہ اماں بھی دن بھر کی اس دھما چوکڑی سے تنگ آ چکی تھیں اور دونوں بیٹوں اور شوہر نے بھی ان کی مخالفت ہی کی تھی اور جب سے یاسر کے علیحدہ گھر کی بات ابا نے ان سے کہی تھی، ان کے اندر ہول اٹھ رہے تھے۔ کہ اگر یاسر بیوی بچے کو لے کر چلا گیا تو وہ گھر کا خرچا کس طرح چلائیں گی۔ مریم نے کبھی ان کے آگے زبان نہ کھولی تھی بلکہ خاموشی سے ان کی اور ان کی بیٹیوں کے کام سر انجام دیے تھے۔ ضروری تو نہیں کہ عامر کی بیوی آئے وہ بھی یہ سب کر سکے۔

"چلو نصرت! جاؤ گھر میں دل لگاؤ اور جب عمیر میاں کہیں تب ہی آنا۔" اماں نے کہا۔

نصرت آپا جو بہت تاؤ دکھا رہی تھیں، دوسری شادی کا سن کر سارا زور جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ تیزی سے سامان سمیٹنے لگیں اور پھر خدا حافظ کہتی میاں اور بچوں کے ساتھ باہر کی جانب چل پڑیں۔

رضا بھائی جو اس طرح کے ہی حالات سے دوچار تھے فرحت آپا سے بولے "چلو فرحت اب تم بھی اپنے گھر" "چلو۔"

انہوں نے کچھ اس انداز میں کہا کہ فرحت آپا جو رکنے کے ارادے سے آئی تھیں فوراً کھڑی ہوگئیں اور باہر کی راہ لی......

اور ابا جان دل ہی دل میں اپنے بنائے ہوئے منصوبے پر خوش ہو رہے تھے جو چار دن پہلے انہوں نے عمیر کے ساتھ مل کر بنایا تھا اور وہ کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ یاسر نے جب سے علیحدہ گھر کی بات کی تھی ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیا کریں کہ سب ٹھیک ہو جائے۔ عمیر کی باتوں کا اثر تھا کہ چچی بھی مریم سے نرم پڑ گئی تھیں۔ مریم نے بیٹی اور بہو بن کر اپنی ذمہ داری نبھائی تھی کہ جس کی لوگ مثالیں دیتے تھے۔ اور انہیں اب اس کی قدر ہو رہی تھی۔

انہوں نے مریم کو آواز لگائی کہ بلڈ پریشر چیک کرے اور انہیں دوا دے۔ مریم دوا دے کر پانی دے رہی تھی کہ جانے کیا سوچ کر انہوں نے مریم کو گلے لگا لیا اور مریم جو پتا نہیں کب سے ممتا کی ترسی تھی۔ گلے لگ کر رونے لگی۔ ڈبڈبائی نظروں سے اس نے پیچھے کی طرف بیٹھے یاسر کو دیکھا جو اسے شرارتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مریم اسے دیکھ کر مسکرا دی۔ اطمینان اور سکون اس کے دل میں اتر رہا تھا کہ علیحدہ گھر کے تصور سے تو وہ خود بھی گھبرا اٹھتی کہ اب جانا کہاں تھا کہ یہی تو اصل گھر تھا اس کا اپنا گھر......

UrduBooks.pk

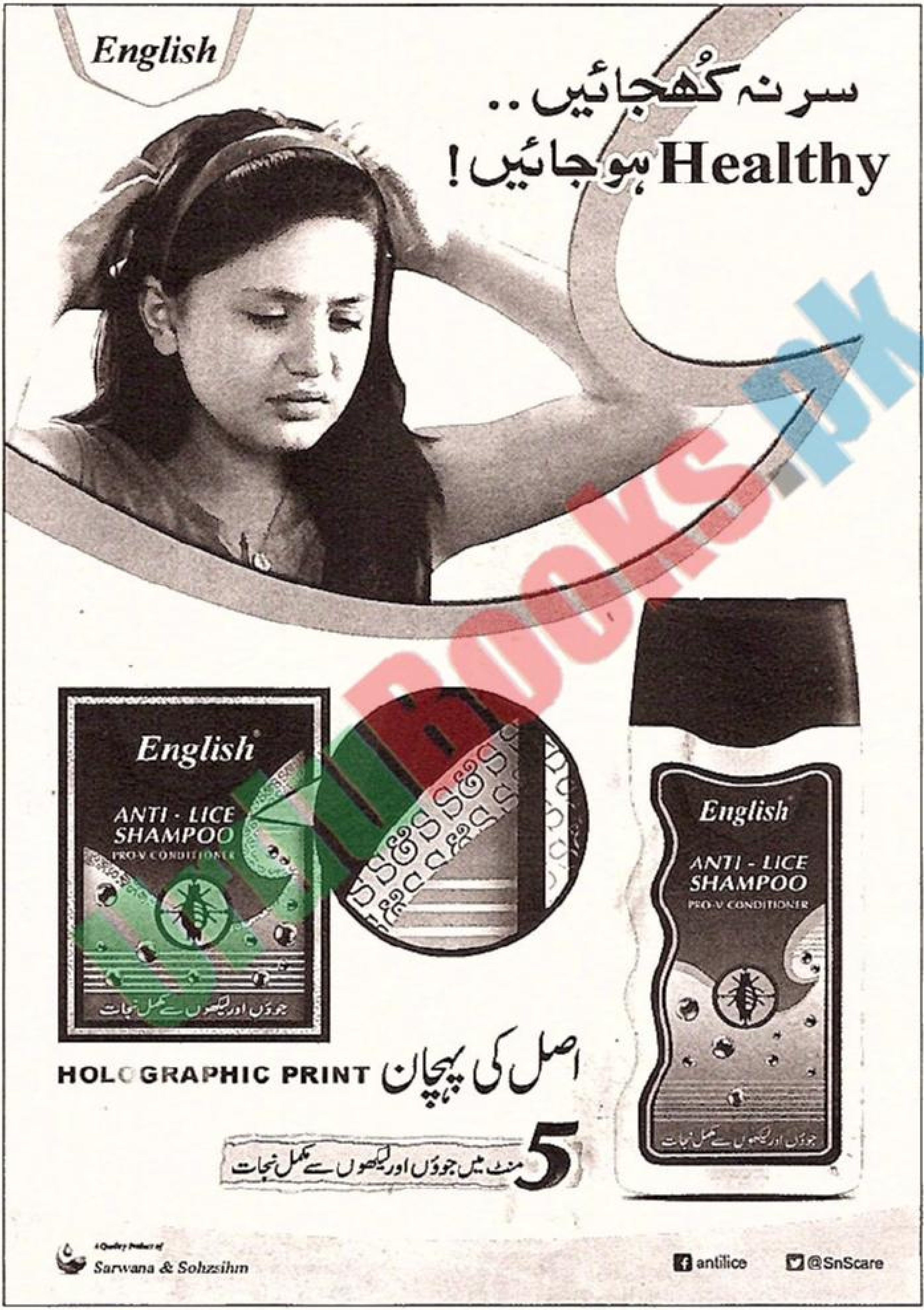
English
سر نہ کھجائیں..
Healthy ہو جائیں!
English
ANTI - LICE
SHAMPOO
PRO-V CONDITIONER
جوؤں اور لیکھوں سے مکمل نجات
HOLOGRAPHIC PRINT اصل کی پہچان
5 منٹ میں جوؤں اور لیکھوں سے مکمل نجات
Sarwana & Sohzsihm
antilice
@SnScare

سحر ساجد

موچنگ

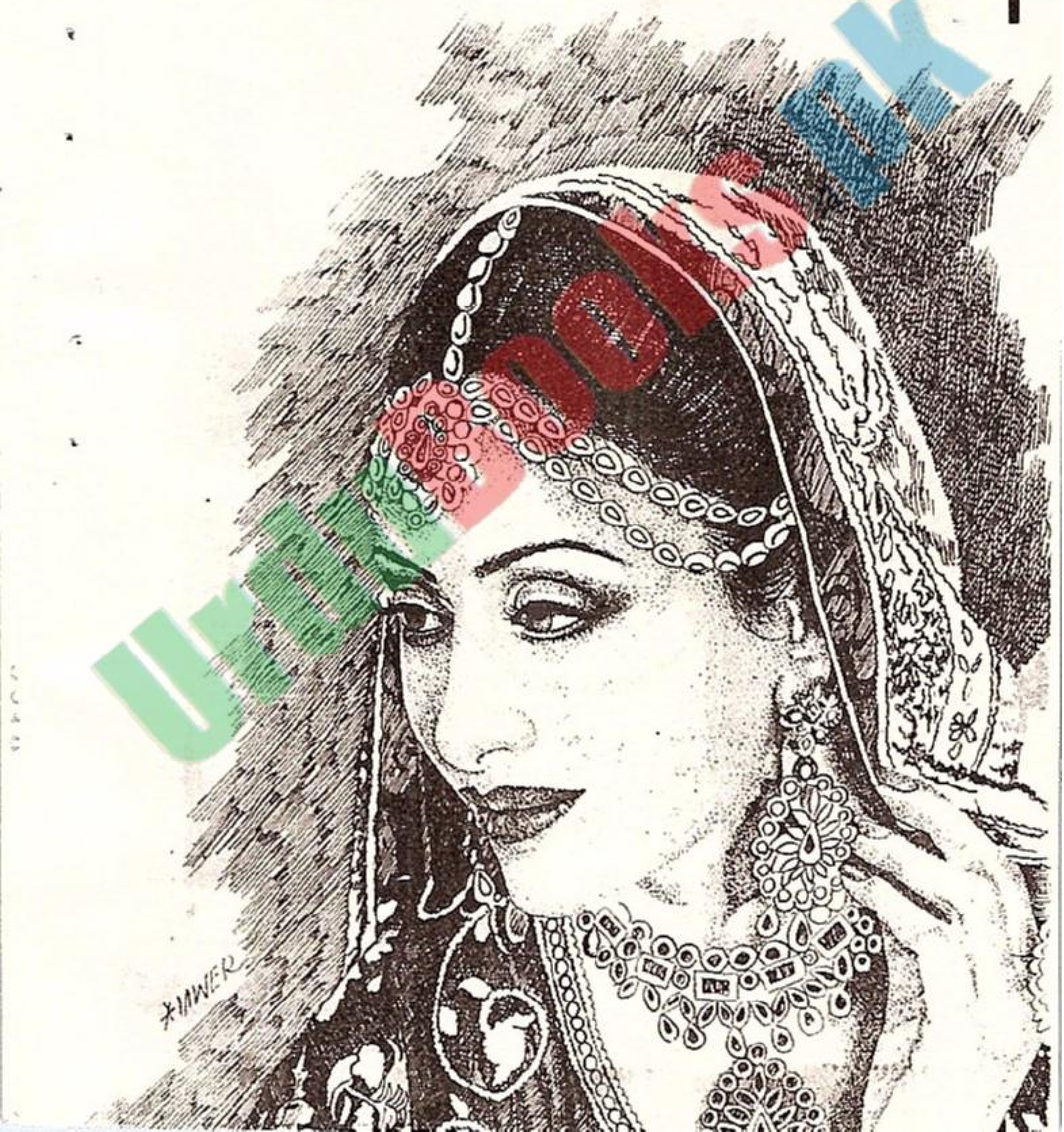

UrduNovels.pk

بلند و بالا عمارتیں آسمان کو چھونے کی تگ و دو میں مصروف، سڑکوں پہ بھاگتی موٹریں، کالا دھواں۔ ٹریفک کا شور، مصروف سی بھاگتی دوڑتی زندگی، تیز ترین رابطے۔ ایک کلک پہ پیغام بھیجو اور لو۔ پیغام تو موصول بھی ہو گیا۔ بس پلک جھپکنے کی ہی تو دیر تھی۔ دنیا کے ایک کونے میں ہونے والا واقعہ من و عن دوسرے کونے میں جا نشر ہو۔ سٹیلائٹ۔ فاصلے کا معاملہ تو بندوق سے نکلی گولی جیسا ہے۔ بلٹ ٹرین۔ آسمانوں پہ اُڑتے جہاز اور سمندر کے نیچے تیرتے جہاز بھی۔

آئی ٹی کا طوفان، ٹیکنالوجی کے کرشمے۔ رنگ۔ روشنیاں۔ جدت۔ فیشن اور رہ گئی خوبصورتی تو وہ تو مسئلہ ہی کوئی نہیں۔ محض چند سرجریز کی مار۔ موٹے ہیں اور پتلا ہونا چاہتے ہیں؟ لو یہ تو ایشو ہی کوئی نہیں۔ پیسا سب کا باپ۔ وہ ہے تو سب ہے، نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے اور تمام مرد و زن اسی کے پیچھے، اسی کی دوڑ میں۔

مائیں بچوں اور بچیوں کے بابوں کو بھیج کر خود بھی ٹک ٹک کرتی جا پہنچیں کسی آفس، کسی اسکول میں۔ تربیت جائے چولہے میں، پیسا سب کا باپ۔ اخلاق بہت ملے گا پر صرف سوشل میڈیا پہ اور رہ گیا دین، مذہب کا معاملہ۔ تو شیلف میں قرآن دھرا ہے نا؟ الماری کے کسی کونے میں جائے نماز بھی موجود ہے نا؟ تو بس کافی ہے۔

کمین دو...... گاڑیاں تین۔

ویلکم ٹو 2018۔

آج کی دنیا۔

اب ذرا وقت کو پیچھے تو لے کر جائیں۔ آ...... کیا کہا یہ ممکن نہیں۔

صدیوں پہلے کہ جب بلند و بالا عمارتیں نہ تھیں، سڑکوں پر گاڑیاں بھاگتی نہ تھیں۔ رابطے بھی اتنے تیز رفتار نہ تھے۔ ایک پیغام کو موصول ہونے میں ہی مہینوں صرف ہو جاتے تھے۔ دنیا کے دوسرے کونے میں کیا کاروبار زندگی ہے۔ کچھ معلوم نہیں اور رہ گیا سفر...... تو گرمیوں میں چلنے والے قافلے سردیوں میں جا کر منزل مقصود پہ پہنچتے تھے۔ وہ دنیا کہ جب آسمان پہ بس پرندے ہی اڑا کرتے تھے۔ سمندر کے اوپر کشتیاں تیرا کرتی تھیں اور سمندر

مکمل ناول

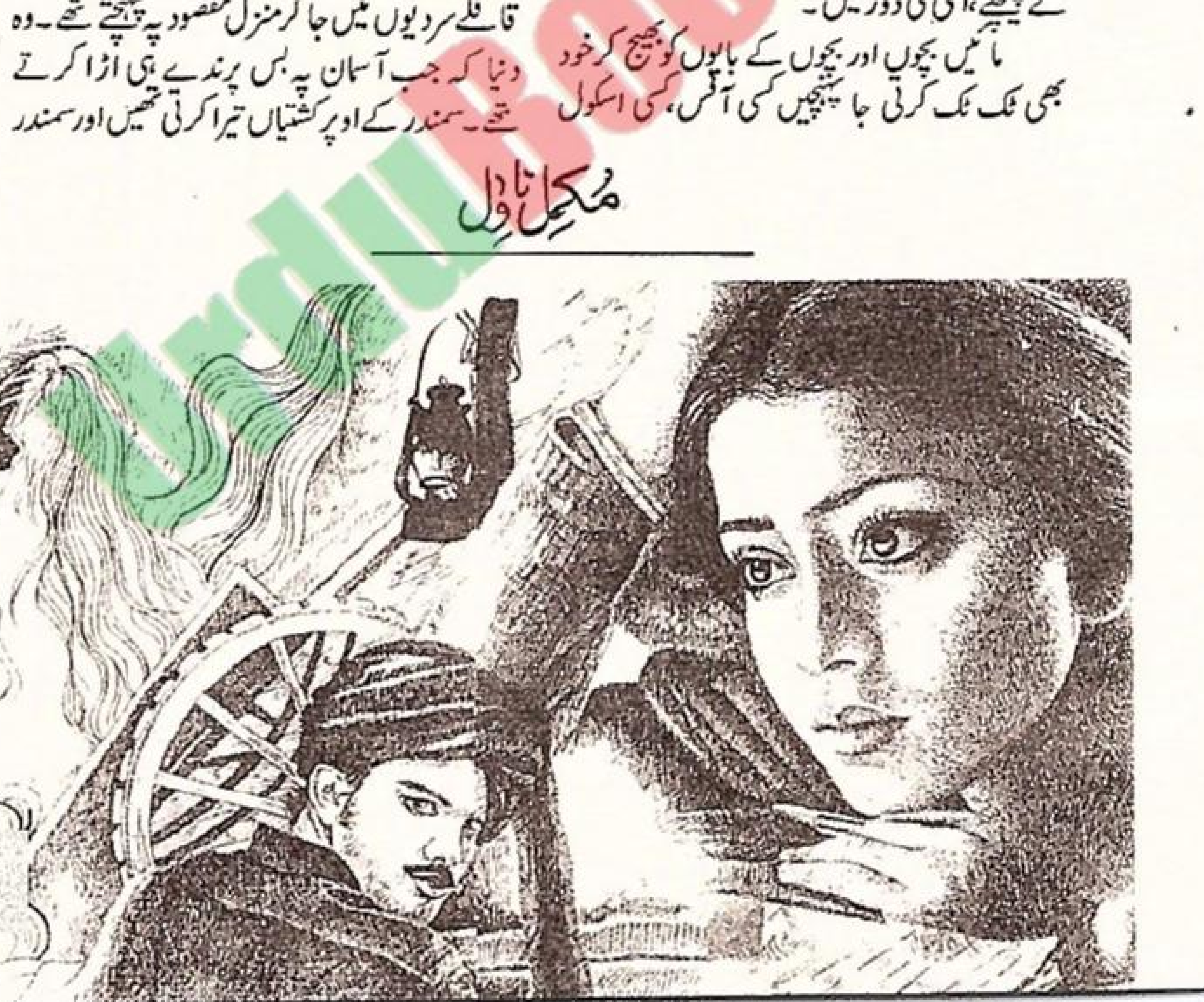

Monthly Shuaa October 2018

UrduBooks.pk

کے نیچے مچھلیاں۔ "آج" اگر ایچ-ڈی پکچر ہے تو وہ وقت ایسا ہے جیسے بلیک اینڈ وائٹ تصویر۔ جب ابھی پیسا سب کا باپ نہیں بنا تھا۔

کتنا فرق ہے نا یہ وقت اور دور...... اس وقت اور زمانے سے۔

پر کچھ چیزیں نہیں بدلتیں نا... جیسے کہ جیسے۔

وہ جس کا قصہ ہے۔ وہ کہ جس کا موچنگ کل بھی بجتا تھا اور آج بھی تو جب جب تار ہلتے ہیں، سُر بکھرتے ہیں، وجود رقص کرتے ہیں اور موچنگ بجتا ہے تو بجتا ہی چلا جاتا ہے۔

☆☆☆

ایک وقت تھا کہ جب شہر گجرات، بخارا اور دہلی کے مابین کارواں سرائے ہوا کرتا تھا۔ قصہ ہے اس کے ذرا بعد کے زمانے کا۔ ایک تھا دینو کمہار اور وہ رہا اس کا چاک۔ جسے اس کا ایک پیر گھماتا ہے اور دو ہاتھ مٹی کو گھڑوں، صراحیوں کی شکل دیتے ہیں۔ پاس ہی اس کی اکلوتی بیٹی بیٹھی ہے جو گیلی مٹی سے کھیلتی ہے اور باپ کے ہاتھوں کو بڑے غور سے تکتی ہے۔

دینو کمہار کی اپنی ذاتی بھٹی ہے، جس میں وہ کچے گھڑے اور صراحیاں پکاتا ہے اور پھر شہر جا کر بیچ آتا ہے۔

وقت گزرا اور اس کا اثر اس کی بیٹی پہ دکھنے لگا۔ وہ جوان ہو رہی تھی۔ چودہ کے سن کو پہنچ چکی تھی اور رنگوں سے باتیں کیا کرتی تھی۔ تب ہی...... کہ جب رنگ اس سے اور وہ رنگوں سے کھیلا کرتی تھی۔

ہاں تب ہی...... اس نے گھڑے پہ پہلا نقش گھڑا۔ سرخ رنگ بکھیرا اور یہیں سے دینو کمہار۔ دین محمد صاحب ہو گیا۔

☆☆☆

آنکھیں وہ کہ دیکھ لو تو ڈوب جاؤ...... گر ڈوب جاؤ تو پھر بس مر ہی جاؤ۔ پلکیں اٹھائے تو جان جائے۔ جھکائے تو ستم۔ چندر مکھی۔ چندر بدن۔ گالوں کا دہکنا ایسا تھا کہ جیسے ابھی ابھی کشمیر کے زعفرانی کھیتوں سے گزر ہوا ہو اور رہ گئے ہونٹ۔ وہ تو گویا شفق کی ساری لالی چرا لائے تھے۔ ناک کی لونگ اگر جان کھینچتی تھی تو لبوں کی مسکراہٹ فنا کر ڈالتی تھی۔ وہ چال میں ہرنیوں کو مات دیتی تھی اور کلام میں کوئل کو۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ چشم کو سرمے نے سجا رکھا ہے یا سرمے کو چشم نے۔ چھٹکتی ہوئی چاندنی تھی یا فصل گل کا جوبن۔ ساون کی کن من تھی یا بہار کی مہک۔ سخت جاڑے میں دہکتے الاؤ کی راحت تھی یا گرما کی فرحت انگیز ہوا۔ لگتا تھا کہ دنیا کو بننے والا سارا حسن اس ایک وجود میں آسمایا تھا۔ اس کی ادا سہی جاتی تھی نہ جفا۔

وہ زہر قاتل تھی۔

وہ میٹھے پانی کی چھاگل تھی۔

وہ سار گل تھی۔

☆☆☆

"واللہ...... کیا نقش گھڑا ہے۔ کیا دیدہ زیبی ہے۔"

صراحی اٹھا کر بے اختیار کہا گیا تھا۔

"حضور۔ بنانے والی کے نقش ہی نہیں۔ وہ خود بھی بہت حسین ہے۔"

مارے استعجاب کے ماتھے پہ شکن در آئی تھی۔

"کیا کہا؟ بنانے والی؟"

"جی حضور! بنانے والی۔ پورے گجرات شہر میں جتنے اس کے ہاتھ کے بنے بیل بوٹے اور نقش مشہور ہیں، اتنا ہی اس کا حسن۔ باپ کے ساتھ کام کرتی ہے پر پردے میں آتی ہے اور پردے میں ہی جاتی ہے لیکن آج تک کسی کی آنکھ ٹھنڈی نہیں ہو سکی۔" وہ رازداری سے بولا۔

"تم بھی کمال ہی کرتے ہو خورشید میاں۔ پردے میں آتی جاتی ہے اور حسن مشہور بھی ہو گیا اور وہ بھی شہر بھر میں۔"

تف کے سے انداز میں سر جھٹکا گیا تھا۔ یہ نوکر لوگ بھی نا۔

Monthly Shuaa October 2018
UrduBooks.pk

''اجی صاحب! اس کے حسن کا معاملہ تو گل کی خوشبو جیسا ہے۔ پھیلنے سے کون روکے؟ ملازماؤں، خادماؤں سے ہوتے ہوتے پورے شہر نے سن لیا۔ پورے گجرات شہر میں دین محمد کے کارخانے کے برتن بکتے ہیں۔ شاہ دولہ کے دربار سے لے کر کالری دروازے تک سب گھڑے، صراحیاں دین محمد کے کارخانے کی ہیں اور سب گھڑوں پہ اسی کے ہاتھ کا نقش ہے۔ سنا ہے کارخانے میں ایک کمرہ محض اسی کے لیے مخصوص ہے اور تو اور صاحب! وہ حساب کتاب بھی دیکھتی ہے۔ یہ بھی شنید ہے کہ پوری پانچ جماعت پاس ہے۔''

''واہ! خورشید میاں! تم نے تو دو دن میں ہی سارا شہر چھان مارا اور اب تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ شہر میں کس عورت کے ہاں کب اور کس وقت بچہ ہونے والا ہے۔''

صاحب نے ٹھٹھا لگایا۔ خورشید کھسیانا سا ہو کر ہنسنے لگا۔ صاف دکھتا تھا کہ اس نے خادم کی بات کو سنجیدہ نہیں لیا۔

''بتاؤ۔ کیا قیمت ہے؟'' وہ اب ایک گھڑے کو اٹھا کر ——— مخاطب تھا۔

☆☆☆

وہ ایک دو منزلہ عمارت تھی۔ بالا خانے پر صاحب کا قیام تھا۔ مغرب کا وقت ہوا چاہتا تھا اور صاحب کھڑکی کے پاس کرسی ڈالے خط لکھنے میں مشغول تھے۔ آج کل ان کا قیام اپنی خالہ کے ہاں تھا اور یہ صاحب بھی کوئی عام صاحب نہ تھے۔ نوابی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ یہ کوئی بیس بائیس کا سن ہوگا۔ کھڑی ناک، کشادہ پیشانی، دراز قد اور نوابی حشمت۔ نواب شجاع ایک خوبرو نوجوان تھے۔ ان کے والد ایک ریاست کے والی تھے۔ یکا یک ایک شور سا بلند ہوا۔ یوں جیسے کوئی بگھی آرہی ہو۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کا شور فضا میں بلند ہورہا تھا۔ لاشعوری طور پہ نواب صاحب کی توجہ ان آوازوں کی سمت مبذول ہوئی تھی۔ وہ تھی تو بگھی۔ مگر چاروں طرف سرخ دبیز پردے تھے۔ سواری مناسب رفتار سے چلتی آرہی تھی۔ سامنے سے ایک فقیر صدا لگاتا ہوا چلا آرہا تھا۔ سواری اور فقیر آمنے سامنے تھے کہ اچانک سواری کی رفتار کم ہوئی اور وہ رک گئی۔ ایک خادمہ نے پردہ سرکا کر فقیر کو آواز دے کر کہا۔

''سنو! بی بی بلاتی ہیں۔'' فقیر سواری تک آیا۔ ذرا سا پردہ سرکا، ایک ہاتھ باہر آیا۔ سرخ مہندی سے دہکتا ہاتھ۔ چند سکے فقیر کو عنایت کیے اور سواری پھر سے چل پڑی۔ فقیر بھی دعائیں دیتا اپنی راہ چل دیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ نواب صاحب بھی اپنا کاغذ قلم سنبھالتے اور وہیں سے لکھنا شروع کرتے کہ جہاں پہ ربط ٹوٹا تھا۔ پر ایسا ہو نہ سکا۔ وہ تو ایسے سکتے میں آئے تھے کہ گویا اب صور پھونکنے پہ ہی ہل پائیں گے۔

''یا خدا! ایسا مہندی سے سجا ہاتھ۔ ایسا رنگیلا رچاؤ۔ ایسے جیسے ڈوبتے سمے کا سورج اس ہاتھ کی پشت پہ رکھ دیا گیا ہو۔ پور پور دہکتی تھی۔ اف......''

دل یوں زور سے دھڑکا کہ جیسے یہ آخری دھڑکن تھی۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی کہ جس کا وہ شکار ہوئے۔

''کون تھی؟ کس کی سواری تھی؟'' سوال بے چینی بن کر اٹھے اور وہ سیڑھیوں کو بھاگے۔

''خورشید...... خورشید۔ کہاں مرگئے ہو؟ خورشید......''

پکار میں بے قراری ٹھاٹھیں مارتی تھی اور خورشید گرتا پڑتا، ہانپتا کانپتا، ''آیا حضور......جی حضور'' کی گردان کرتا، سیڑھیاں چڑھتا تھا۔

''یہ...... یہ سواری کس کی تھی؟'' وہ کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ انداز بے تاب، لہجہ بے قرار۔

''کون سی سواری حضور؟'' خورشید حیران حیران و پریشان سا کھڑکی کی سمت دیکھتے ہوئے بولا

تھا۔

''ابھی یہاں سے گزر ہوا۔ جس میں سے وہ ہا......'' وہ کہتے کہتے رک سے گئے۔

''جائیے خورشید بھاگیے۔ معلوم کیجیے کون صاحبہ تھیں؟ کس کی سواری تھی؟ جائیے خورشید۔''

نواب صاحب نے کہنے پہ ہی بس نہیں کیا تھا بلکہ دونوں ہاتھوں سے خورشید کو سیڑھیوں کی طرف دھکا سا دیا تھا۔

''اب سب معلوم کر کے ہی مجھے شکل دکھائیے گا خورشید! ورنہ واپس بہاول پور بھیج دیں گے۔''

انھوں نے پیچھے سے آواز لگائی تھی۔

☆☆☆

سواری رام پیاری کے محل کی بغل میں واقع ایک دو منزلہ حویلی کے سامنے آن رکی۔ سواری کے رکتے ہی دربان نے منہ دیوار کی طرف کیا اور آواز لگائی۔

''پردہ۔''

دروازہ کھلا۔ سواری اندر داخل ہو کر ایک طرف جا رکی۔ وہاں موجود سب ملازم، دالان میں، باغ میں موجود سارے ملازم دیوار کی طرف منہ کیے کھڑے تھے البتہ راہداری میں موجود ملازموں نے ایک بھاری، لمبا کپڑا یوں تھام کر پردہ کر رکھا تھا کہ محض ان کے ہاتھ کی انگلیاں دکھائی دیتی تھیں۔

سواری پہ پڑا پردہ ہٹا۔ نگینوں سے سجی گرگابی میں مقید پیر باہر نکلا۔ پنڈلی میں چاندی کی چوڑی پٹی جیسی پائل تھی۔ جس میں فقط دو گھنگرو، پائل بند کرنے والی جگہ پر اٹکے تھے اور پھر یوں ہوا کہ وقت مغرب ہی چودھویں کا چاند طلوع ہو گیا۔ ذات کی کمہاری تھی پر آن بان میں شہزادیوں کو مات دیتی تھی۔ پیر یوں زمین پہ اتارا کہ گویا نیچے پھول رکھے ہوں۔ ایسے بے آواز چلتی تھی کہ جیسے قدم ہوا پہ رکھتی ہو۔ وہ سہج سہج قدم اٹھاتی اندرونی دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی پر چال میں تھکاوٹ بھری تھی۔ اس کے پیچھے، پیچھے اس کا سامان اٹھائے اس کی خاص خادمہ حسینی تھی۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ سار گل، اس زمانے کی ڈیزائنر تھی۔ اس کے سامان میں کاغذوں کا ایک پلندہ تھا، قلم دوات تھی۔ جس پہ وہ بیل بوٹوں کے نقش بنایا کرتی تھی اور پھر ان نقوش کو صراحیوں اور گھڑوں پہ نقل کر دیا کرتی تھی، ان میں رنگ بھر دیا کرتی تھی۔ وہ مٹی کے برتنوں کو چھیدنے کا فن بھی جانتی تھی۔ وہ اس زمانے کی ورکنگ ویمن تھی۔

اندر پہنچی تو ہی ماں اس کی منتظر تھی۔

''آ گئی میری بٹیا۔'' ماں نے اس کا منہ سر چوما۔

''بہت تھک گئی ہوں ماں۔'' اس نے ماں کے سینے میں سر چھپا کر گویا تھکن اتارنی چاہی۔

''کام بھی تو گدھوں کی طرح کرتی ہو۔ بالکل جنونی ہی ہو جاتی تم تو۔'' وہ لاڈ سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''یہ کام نہیں ہے اماں۔ یہ سانس ہے سانس...... میرے ہاتھ چلتے ہیں۔ نقش گھڑتے ہیں، رنگ بکھرتے ہیں اور مجھ میں زمانے بھر کی سانس ایک ساتھ آ جمع ہوتی ہے۔''

وہ تخت پہ بیٹھتے ہوئے ایک انگڑائی لیتے ہوئے بولی تھی۔ ایسے جیسے تھکن اتارنا چاہتی ہو۔ ماں نے سر جھٹکا یوں جیسے وہ پاگل پن کی بات کرتی ہو۔ حسینی اس کا سامان اس کے کمرے میں رکھنے چل دی تھی۔ ایک ملازمہ سلپچی لیے اس کے ہاتھ دھلوانے چلی آئی۔

''کھانا کھا لو گل۔'' اسے اٹھتے دیکھ کر ماں بولی۔

''نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے اماں۔ ابھی آئی۔'' وہ دوپٹا وضو کے لیے سر پہ رکھتے ہوئے بولی تھی۔

ماں بلاوجہ مسکرائی۔ اس کی ذہین، کتابوں میں لکھی جانے والی مثالوں والی لائق بیٹی۔

☆☆☆

دو گھنٹے ہو گئے تھے خورشید کو گئے ہوئے۔ ابھی تک واپسی نہ ہوئی تھی۔ ٹہل ٹہل کر نواب صاحب کی

ٹانگیں شل ہونے کو تھیں۔ جو جان پہ بنی تھی وہ کہانی الگ تھی۔

''کہاں مر گئے ہو خورشید۔'' وہ ایک ہاتھ کا مکا دوسرے ہاتھ پر مار کر بڑبڑائے۔

''ہائے۔ اوئی ماں۔ مر گیا آج تو میں۔'' خورشید کی دہائیاں سن کر وہ لپک کر سیڑھیوں تک آئے تھے۔

''جلدی ادھر مرو۔'' وہ نیچی آواز میں دانت پیس کر غرائے۔ نہیں چاہتے تھے کہ خالہ کو ذرا سی بھنک بھی پڑے۔

خورشید ہانپتا ہوا چڑھا آ رہا تھا اور آخری سیڑھی پہ قدم رکھتے ہی نواب صاحب نے اسے دبوچا اور گھسیٹتے ہوئے کمرے میں لے گئے۔

''بولیے۔ جلدی کیجیے۔ بتایئے خورشید!'' اس حد درجہ بے تابی پہ خورشید منہ کھول کر انہیں تکنے لگا۔ وہ اس کے یوں منہ تکنے پہ جھنجھلائے۔

''خورشید۔'' انہوں نے بازو کو جھٹکا دیا۔

''سا...... سارنگی......'' خورشید کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ انہوں نے خوابیدہ انداز میں کہتے ہوئے بازو چھوڑا۔

''کون...... کون سارنگی؟'' خوابیدہ سے لہجے میں کہتے ہوئے وہ کھڑکی کی جانب بڑھے تھے۔

''وہ ہی حضور والا۔ وہ ہی جس کے ہاتھ کے بے نقش دیکھ کر ہی آپ اش اش کر اٹھے تھے۔ وہ ہی سارنگی جو کہ پردے میں آتی جاتی ہے پر پھر بھی سارا شہر اس کے حسن کا ڈسا ہوا ہے۔'' خورشید ذرا چمک کر بولا تھا۔ ''واہ! ہم کہیں تو ٹھٹھا اڑائیں اور خود پہ بات آئے تو سو کوس کی دوڑ لگوائیں۔ واہ صاحب۔ واہ۔'' وہ ناراض سا دکھتا تھا اور نواب صاحب۔ وہ اتنے خاموش ہو گئے کہ خورشید گھبرا اٹھا اور گھبرا کر پکارا۔

''حضور؟''

''ہمیں اس پردہ دار مہ جبیں کو دیکھنا ہے خورشید!''

اور خورشید کے سر پہ بالا خانے کی چھت آن

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	500/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چوہدری	250/-
ہم سفر	فرحت اشتیاق	400/-
بن روئے آنسو	فرحت اشتیاق	250/-
حالِ دل جان بہ تو	فرحت اشتیاق	500/-
دل دادہ ہیں	ثمرہ بخاری	350/-
ہستی کا آہنگ	ثمرہ بخاری	300/-
وہ جھلی سی دیوانی سی	آسیہ سلیم قریشی	400/-
آرزو گھر آئی	آسیہ سلیم قریشی	400/-
ایمان، امید اور محبت	عمیرہ احمد	200/-
لاحاصل	عمیرہ احمد	180/-
امر بیل	عمیرہ احمد	450/-
اک دیا جلائے رکھنا	ماہا ملک	300/-
جو چلے تو جاں سے گزر گئے	ماہا ملک	120/-
میرے خواب ریزہ ریزہ	ماہا ملک	300/-
موسم تھا بے قرار	فریدہ اشفاق	300/-
دل اسے ڈھونڈ لایا ہے	آسیہ رزاقی	300/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
میرے اس کے 8 سفر	زہرہ ممتاز	180/-
پھول وے رنگ کالے	فائزہ افتخار	180/-
میری جنت	نور بانو محجوب	250/-
بجنور	شوکت ماہ الطاف	150/-
اے وقت گواہی دے	راحت جبیں	350/-
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر	300/-
رنگ، خوشبو، ہوا، بادل	افشاں آفریدی	400/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	400/-
بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی	300/-
میرے خواب لوٹا دو	نگہت عبداللہ	400/-

ناول منگوانے کے لیے فی کتاب ڈاک خرچ -/30 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ - 37 اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32216361

گری تھی۔

☆☆☆

''یہ برتن کہاں سے لاتے ہو بھائی!'' وہ اسی دکان دار کے پاس کھڑے پوچھتے تھے۔

''دین محمد صاحب کے کارخانے سے حضور۔''

''اور اگر کوئی خاص قسم کی صراحی بنوانی ہو تو کیا کیا جائے؟''

اس سوال پہ دکاندار سوچ میں پڑ گیا۔

''کس قسم کی صراحی حضور؟''

اور نواب صاحب لگے اسے سمجھانے کہ کیسی صراحی ہو اور اس پہ کس قسم کے اور کس رنگ کے بیل بوٹے اور نقش انہیں چاہیے تھے۔

انداز اتنا مشکل اور اردو اتنی ادق کہ دکان دار منہ کھول کر انھیں تکنے لگا۔

''صاحب! آپ یوں کریں کہ ایک پرچے پہ مجھے لکھ دیں کہ آپ کو کیسی صراحی چاہیے۔ میں جب نیا مال لینے جاؤں گا، آپ کا رقعہ ان تک پہنچا دوں گا۔'' اور نواب صاحب کے اندر تک شانتی اتری تھی۔ وہ بڑی پیاری سی مسکراہٹ سے مسکرائے تھے۔

یہی تو وہ چاہتے تھے۔ انھوں نے دو انگلیوں سے خورشید کو اشارہ کیا تھا۔ خورشید بوتل کا جن ثابت ہوا۔

اور وہیں بیٹھ کر نواب صاحب نے رقعہ بنام دین محمد صاحب لکھا۔ جانتے تھے کہ اسے سارگل تک ہی پہنچنا ہے کہ کوئی اور تو لکھنا پڑھنا جانتا ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

''یہ کوئی رقعہ آیا ہے چچا۔ اسلم بھائی لائے ہیں۔''

''کون اسلم بھائی؟''

''وہی کالری دروازے والے۔''

''اوہ۔ اچھا اچھا۔ رقعہ کیوں بھجوایا؟ خود کیوں نہ آئے؟''

''چچا خود ہی آئے ہیں۔ مال اٹھوا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کوئی نواب صاحب ہیں۔ ان کو کوئی خاص قسم کی صراحی بنوانی ہے، اسی کے لیے رقعہ بھجوایا ہے۔''

''ہمم...... اچھا اسے حسینی کو دے دو۔ کہنا سارگل سے کہے پڑھ کے بتائے کیا لکھتے ہیں نواب صاحب۔''

''گل بی بی! گل بی بی!'' اور گل بی بی بیل بوٹے بنانے میں غرق۔ ہاتھ رنگے ہوئے، بالوں کی لٹیں الجھی ہوئی۔ چٹیا کندھے سے نیچے جھولتی ہوئی۔ دوپٹہ شانے سے پھسل پھسل جاتا تھا۔

''ہوں۔ کیا ہے حسینی؟'' منہمک سا انداز ذرا سی بے زاری لیے۔ یوں جیسے مخل ہونے پر بے زار ہوئی تھی وہ۔

''یہ رقعہ ہے۔''

''کس کا؟'' وہ اچنبھے سے سیدھی ہوئی۔

''صاحب کہتے ہیں، کسی نواب صاحب کی طرف سے آیا ہے۔ معلوم نہیں کیا چاہتے ہیں؟ شاید کسی خاص طرح کا مال درکار ہو۔''

''اچھا تو اب دین محمد کے کارخانے میں رقعے بھی آیا کریں گے۔ دیکھ لو حسینی میرے ہاتھ کا کرشمہ۔'' ایک ابرو اچکا کر، مسکراتے ہوئے اس نے رقعہ حسینی کے ہاتھ سے لیا تھا۔ حسینی کیا کہتی۔ بات تو برحق تھی۔

تہہ شدہ کاغذ کو کھولتے ہوئے اسے لکھائی نے چونکایا تھا۔ لگتا تھا خوب پڑھے لکھے ہاتھوں نے خط تحریر کیا تھا۔ کیا ہی موتیوں جیسی لکھائی تھی۔ کیا انداز تحریر تھا

محترم دین محمد صاحب!

''آداب عرض ہے۔ اللہ سے آپ کی صحت و خوش حالی کی دعا ہے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ چند یوم قبل ایک دکان دار نام جس کا اسلم ہے کی دکان سے گزر ہوا۔ کچھ برتنوں کی خریداری ہوئی جن کے دیدہ زیب نقش و نگار نے ہمیں بے حد متاثر کیا۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے لیے ایک ایسی صراحی بنائیے کہ

UrduBooks.pk

جس کے نقش و نگار آج تک کسی نے نگاہ نہ دیکھے ہوں۔ رنگوں کا انتخاب یوں ہو کہ بہت تیز ہوں اور نہ ہی بہت پھیکے۔ ایسے نقش ہوں کہ جنہیں دیکھتے ہی بیمار خود کو توانا محسوس کرے اور توانا دیکھے تو دیکھ کر جھوم اٹھے۔ آپ ہماری من پسند شے تیار کر دیجیے، ہم آپ کو منہ مانگی قیمت ادا کریں گے۔"

خاکسار شجاع الملک

وہ جیسے جیسے خط پڑھتی جا رہی تھی، ماتھے پہ شکن در شکن بنتی چلی جا رہی تھی۔ صاحب نے جان بوجھ کر نواب نہ لکھا تھا۔

"ہونہہ۔ سارگل اپنے دل کے سکون کے لیے کام کرتی ہے نہ کہ اس لیے کہ لوگ رقعے لکھ لکھ کر فرمائشیں ڈالیں۔" اس نے دو انگلیوں سے رقعہ اڑا کے پرے مارا۔

مزاج کی نازکی۔ اللہ اکبر۔ بگڑا بھی تو کس بات پہ۔ "ہم سے ایسی فرمائشیں۔ ہونہہ۔"

"بی بی گل۔ ہو سکتا ہے کوئی اللہ مارا واقعی ہی میں بنوانا چاہتا ہو۔" حسینی رقعہ اٹھاتے ہوئے بولی۔

"تو خود آئے نا۔ اپنے پیروں پر۔ ٹانگوں میں کیا پانی پڑ گیا ہے۔"

اس نے برہم انداز میں بات مکمل کی اور پھر سے اپنے کام میں اس طرح ڈوبی کہ وہاں جیسے کوئی اور تھا ہی نہیں۔ حسینی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پر پھر دم سادھ لیا کہ یہ نہ ہو مزاج کی ساری برہمی اسی پہ الٹ جائے۔

☆☆☆

بلاناغہ اسلم کی دکان کا چکر لگایا جاتا تھا اور سوال ایک ہی۔

"ہمارے رقعے کا جواب آیا؟"

"نہیں صاحب۔" اسلم احترام سے جواب دے دیا کرتا تھا۔

"اب کی بار جاؤں گا تو حضور ضرور یاد دہانی کراؤں گا۔" وہ تسلی بھی دیا کرتا تھا پر تسلی اب کہاں۔

قاصد پیام شوق کو اتنا نہ کر طویل۔

کہنا فقط یہ ان سے کہ آنکھیں ترس گئیں۔

بے چینی تو وہ لگی تھی کہ جس کا چین آج تک کوئی نہیں تلاش کر سکا تھا۔ یہ کوئی ایک ماہ کے بعد کی بات تھی کہ جب نواب صاحب مایوس ہوئے تھے اور مایوس ہو کو انھوں نے دوسرا رقعہ تحریر کیا تھا۔

اور پھر تو جیسے یہ سلسلہ چل نکلا تھا۔

وہ خط لکھتے۔ خط سارگل تک پہنچتا اور دو انگلیوں سے اڑا دیا جاتا۔ ایک ہی ضد تھی کہ موا خود چل کر آئے اور موئے کو معلوم ہوتا کہ دو پیروں پہ چل کر آنے کی ضد ہے تو کم بخت مارا دوڑا چلا آتا اور سر کے بل آتا۔ آخر پھر معاملہ دین محمد کے علم میں آیا۔

"سارگل بٹیا۔ آخر خط میں لکھا کیا ہے؟ اسلم بے چارہ خواہ مخواہ میں ڈاکیا بن کر رہ گیا ہے۔ اب تو وہ بھی بے زار ہو چلا۔"

"کوئی لاٹ صاحب ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایسی صراحی بنا کر دو جو صراحی کم اور پرستان کی پری زیادہ معلوم ہو۔"

انداز میں نخوت بھری تھی۔ حسینی کھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔ دستر خوان چنا ہوا تھا اور سب رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ زبین (سارگل کی ماں) نے ایک گھوری حسینی کو ڈالی۔ وہ چپکی ہو رہی۔

"تو بنا کیوں نہیں ڈالتی بٹیا۔ کیوں خوار کرتی ہے لاٹ صاحب کو؟"

"وہ لاٹ صاحب ہیں ابا جان تو میں سارگل ہوں۔ جب تک چل کر نہ آئیں گے تب تک تو میں بھی بنا کر نہ دوں۔ خواہ سو رقعے لکھے یا ہزار۔"

دین محمد ہنس دیا۔

"سارگل! ہتھ ہولا رکھ۔ کمہاری ہے تو کمہاری بن۔ شہزادیوں جیسے نخرے کیوں دکھاتی ہے۔ تیرا کام۔ نقش بنانا ہے چاہے رقعہ آئے یا سائی۔"

زبین اس کے نخرے پہ سخت لہجے میں بولی تھی۔

ماں کو جواب تو نہ دیا پر کھانے سے جی اچاٹ ہو گیا تھا۔ مارے بندھے بیٹھی رہی کہ کھانا چھوڑ کر اٹھنے کی گستاخی کون کرے۔ سارگل نخریلی تھی، لاڈلی تھی۔

UrduBooks.pk

نازک مزاج تھی پر بدتمیز نہ تھی۔ ماں اسے دیکھ رہی تھی پر وہ ناجائز لاڈ اٹھانے کے حق میں نہیں تھی۔ جب دسترخوان سے برتن اٹھائے جانے لگے تو تب وہ اٹھی تھی۔

''بٹیا۔'' دین محمد نے اسے روکا۔

''اب کے خط آئے تو انکار مت کرنا جیسا کہتے ہیں لاٹ صاحب بنا دینا۔ بڑے لوگوں سے چونچیں نہیں لڑایا کرتے۔''

''جی ابا۔'' بظاہر تو حکم کی تعمیل ہوگی جیسا معاملہ تھا پر من ہی من میں دانت پیس کر کہتی تھی۔

''لاٹ صاحب پیسا جناب میں نہ ڈبوایا تو نام بدل دینا۔ ایسی بدرنگ۔ بدشکل بناؤں گی کہ صراحی کم اور چڑیل زیادہ دکھے گی۔''

اور اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں پہ زبین کی گہری نگاہ تھی۔

☆☆☆

''سارگل کے ابا!''

''کیا ہے نیک بخت؟'' دین محمد چلم پی رہا تھا اور زبین اس کے پیر دبا رہی تھی۔

''سارگل کو اتنا سر نہ چڑھائیں۔ بیٹی ذات ہے۔ کل کو بیاہ کر کسی کے گھر جانا ہے اسے۔ مجھے تو یہ ہی فکر کھائے جاتی ہے کہ برادری میں ہمارے پلّے کا کوئی گھر نہیں۔ کوئی لونڈا ایسا قابل نہیں ہے اور برادری کے باہر اسے بیاہنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تو کیا بنے گا سارگل کا۔ کل کلاں کو کسی نیچے گھر میں بیاہ کر چلی گئی تو کیسے گزارا کرے گی۔ نبھا کیسے ہو گا۔''

''او نیک بخت! کیوں ہلکان ہوتی ہے۔ انور کو کیوں اپنے ساتھ لگا رکھا ہے میں نے۔ بھتیجا ہے، میرا۔ خون ہے۔ کاروبار میں اسی لیے ساتھ لگایا ہے کہ کل کو وہ اس قابل ہو سکے کہ میری سارگل کو خوش رکھ سکے۔ کسی چیز کی کمی نہ آنے دے۔ ساری سائیاں وہ لیتا ہے، مال بھی وہ ہی اٹھواتا ہے ہاں! لکھت پڑھت میں کمزور ہے ذرا۔ وہ منشی جی کے ساتھ ساتھ سارگل بھی دیکھ لیتی ہے۔ کل کو دونوں مل کر چلا ہی لیں گے یہ کاروبار۔''

''ہاں، یہ تو تو نے عقل مندی والی بات کہی سارگل کے ابا۔''

زبین نے ایک اطمینان بھری سانس بھر کر سوچا تھا۔ مطلب یہ کہ دین محمد انور کو گھر داماد رکھنے والا تھا۔

☆☆☆

''نواب صاحب۔ نواب صاحب!''

خورشید جوش سے پکارتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا اور دوڑا چلا آ رہا تھا۔

''نواب صاحب۔ جواب آ گیا۔'' وہ تمتماتے چہرے کے ساتھ بولا تھا۔ نواب صاحب ایک پل کو سکتے میں آئے۔ چار ماہ...... چار ماہ کے بعد جا کر شنوائی ہوئی تھی۔ انھیں جیسے سانس آنا بند ہوئی تھی۔

''ادھر دیجیے۔'' انھوں نے خط اس کے ہاتھ سے چھینا تھا۔

بے تابی سے خط کھولا۔

''تمہارے خطوط مجھے تواتر سے ملتے رہے۔ سارگل نے آج تک کسی کے کہے سے کوئی نقش گھڑا نہ کوئی بوٹا بنایا۔ کبھی کنویں کو بھی چل کر پیاسے کے پاس جاتے دیکھا ہے؟

چلو درگزر کیا۔ ابا نے کہا نہ ہوتا تو قسم اللہ پاک کی روز قیامت تک تم رقعے ہی بھیجتے رہ جاتے۔ خط اس واسطے لکھتی ہوں کہ رقم پہلے ادا ہوگی اور پھر صراحی بنے گی کیونکہ جیسے رنگوں سے تم نے صراحی رنگنے کا کہا ہے، وہ عام نہیں ملتے۔ خاص منگوانے پڑتے ہیں۔ سو پہلے رقم پہنچاؤ۔ اور ہاں! اب کے رقعہ نہ بھیجنا۔''

وہ خط پڑھ کر دل کھول کر ہنس رہے تھے۔ خط سے برہم مزاج کی بو آتی تھی تو لفظ ڈنک مارتے تھے۔ سلام نہ دعا۔ سیدھے سبھاؤ منہ پہ تھپڑ دے مارنے والا انداز تھا۔ وہ خط کا کونا لبوں میں دبائے مسکرائے جاتے تھے۔

سکون کا اک خزانہ تھا جو ان لفظوں میں مقید تھا۔ کاغذ کا وہ ٹکڑا ایسا راحت بخش تھا کہ کیا کہیں۔

UrduBooks.pk

نواب صاحب کا معاملہ بن پیے مدہوش ہونے جیسا تھا۔ ارادہ تو رقم بھجوانے کا ہی تھا پر کتنی؟

اور یہاں آکر وہ ایک بار پھر ہنس دیے۔

اس نازنین کے غصے کے کیا کہنے۔ رقم کا مطالبہ ہے پر رقم ہو کتنی، مارے طیش کے یہ ہی لکھنا ہی بھول گئیں۔ وہ مسکراتے لبوں کے ساتھ کاغذ قلم لیے بیٹھ گئے تھے۔

سارگل صاحبہ!

سلام عرض ہے۔ گستاخی معاف۔ جرأت کو درگزر کیجیے گا۔ جانتے ہیں ہمارے الفاظ آپ کی طبع پرنا گوار گزر رہے ہوں گے مگر مشکل یہ آن پڑی کہ رقم گرادا ہو، تو کتنی ادا ہو۔ اپنے خط میں آپ اس بات کا ذکر کرنا بھول گئیں غالباً۔

مدعا فقط یہ ہے کہ رقم کتنی ہو یہ بتا دیجیے تاکہ صراحی کی تیاری میں مزید تاخیر نہ ہو۔

خاکسار شجاع الملک!

☆☆☆

"سارگل شے کی قیمت کب مانگا کرتی ہے۔ قیمت تو سارگل کے وقت کی ہے۔ اس کے ہاتھوں کی مہارت کی ہے۔ ہے ہمت یہ قیمت ادا کرنے کی؟ ہو سکے گی بھرپائی؟"

جوابی نامہ آیا تھا اور جواب نے نواب صاحب کو شل کر دیا۔ وہ سکتے میں ہی آگئے تھے۔ اب کیا کہا جائے۔ کیا جواب دیا جائے۔ بڑی سوچ و بچار کے بعد لفظ ذہن کی گرفت میں آسکے تھے اور وہ لکھنے بیٹھے تھے اور کالی سیاہی سے موتیوں جیسے لفظ ابھرتے جاتے تھے۔

محترمہ سارگل!

سلام عرض ہے۔ آپ کی دائمی خوشی کی دعا ہے۔

ناچیز میں اتنی ہمت کہاں کہ آپ کے وقت اور مہارت کی قیمت لگا سکے۔ یہ کوئی بازار میں بکنے لائق شے تو ہے نہیں کہ مول لگائیں اور خرید لیں۔ سخت مشکل آن پڑی ہے۔ آپ ہی آسان کیجیے۔ ہم سے تو یہ کام نہ ہوگا۔ آپ کے ہاتھ کا بنا شاہکار بھی لینا چاہتے ہیں اور قیمت بھی طے نہیں کر پاتے۔ آپ ہی کہیے صاحب۔ کریں تو آخر کریں کیا؟

ناچیز شجاع الملک!

سارگل خط پڑھتی جاتی تھی اور لبوں پہ تبسم مانند شفق پھوٹا پڑتا تھا۔ وہ ہونٹوں کو بھینچ بھینچ کر تبسم روکتی تھی۔ آنکھ میں شرارت ناچتی تھی اور چہرہ کھل کھل جاتا تھا۔ لفظ لکھنے والے کی بے بسی سناتے ہی نہ تھے۔ دکھلاتے بھی تھے۔ کاغذ قلم سنبھالا اور تحریر کیا۔

"جاؤ۔ معاف کیا۔

ایک صراحی سارگل نے خود پہ واری۔ سمجھو صدقہ کیا، خیرات دی۔ پتا بتاؤ، تمہاری شے تم تک پہنچ جائے گی۔"

اور نواب صاحب اس طرز تکلم پہ یوں مرے کہ گویا پھر سے جی اٹھے ہو۔

آ...... سارگل...... وہ خط منہ پہ ڈالے نیم دراز ہوئے۔ اب کیا جان سے ہی ماریں گی۔ بن دیکھے جکڑے بیٹھے ہیں۔ جو دیکھ لیا تو کیا حال ہوگا۔ کیا تماشا ہوگا۔ محبت شاید ایسا ہی معاملہ ہوتی ہوگی۔ بن پیے مدہوش ہونے جیسا۔ بن دیکھے مرمٹنے جیسا۔

جی جی نواب صاحب! محبت ایسا ہی معاملہ ہے۔ بن سانس لیے جینے جیسا۔

☆☆☆

اب کے دین محمد کا ارادہ مال دلی تک پہنچانے کا تھا۔ وہ کاروبار بڑھانا چاہتا تھا۔ اسی واسطے اس نے انور اور منشی جی کو مال دے کر سفر پہ بھیجا تھا اور یہیں پہ مشکل آن پڑی تھی۔ سارا حساب کتاب منشی جی کرتے تھے سارگل تو بس پڑتال کیا کرتی تھی۔

اب انور ٹھہرا ان پڑھ۔ وہ کہاں کرتا اتنے لمبے چوڑے حساب کتاب۔ منشی جی کو بھیجنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا پر اس کا نقصان یہ ہوا کہ سارگل کو دوگنا کام کرنا پڑتا تھا۔ وہ تھکنے لگی تھی اور اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے دین محمد کسی ایسے بندے کی تلاش میں تھا جو منشی جی کے آنے تک ان کا کام سنبھال سکے۔

☆☆☆

دروازے پر برابر دستک ہو رہی تھی۔

''کبریٰ او کبریٰ! دیکھیے تو سہی کون موا ہے جسے سانس تک نہیں آتی اور دروازہ بجائے ہی جا رہا ہے۔ بجائے ہی جا رہا ہے۔ ایسے جیسے توڑ کر ہی سانس لے گا۔'' نظامی خاتون چلا ـــــ رہی تھیں اور کبریٰ بھاگی چلی آئی۔

''دیکھتی ہوں بی بی! دیکھتی ہوں۔'' وہ چڑھے سانس کے ساتھ بولتی ہوئی دروازے کی طرف بھاگی تھی۔

اور جب پلٹی تو کاغذ میں لپٹا کوئی ظروف تھامے ہوئے تھی اور حیران حیران سی دکھتی تھی۔

''بی بی یہ کوئی دے گیا ہے کہتا ہے کہ شجاع صاحب کے لیے ہے۔''

اس نے ظروف نظامی خاتون کے سامنے لا رکھا۔

''ہیں...... کیا کہا؟ چھوٹے نواب کے لیے ہے۔'' وہ شہادت کی انگلی ہونٹوں پہ دھرے سراپا حیرت نظر آئیں۔

''شجاع۔ ارے او شجاع۔ اجی چھوٹے نواب صاحب!'' نظامی خاتون وہیں بیٹھے بیٹھے بلند آواز بولیں۔

''جی خالہ حضور!''

''میں نے کہا صاحب! ذرا بالا خانے سے نیچے تو تشریف لائیے۔''

''آئے خالہ حضور!''

اب نواب صاحب کے فرشتے بھی نہ جانتے تھے کہ نیچے آخر کیا معاملہ درپیش ہے۔ وہ بڑی ترنگ میں، گنگناتے ہوئے نیچے اترے تھے۔

''کوئی دروازے پہ دے گیا ہے اور آپ کا نام لیتا ہے۔'' نواب صاحب پہلے تو ناسمجھی سے اسے دیکھتے رہے اور پھر جیسے الہام اترا تھا۔ چہرہ تمتمایا۔ لبوں پر مسکراہٹ چمک اٹھی۔ سانس تیز ہوئی اور ہاتھوں نے برق رفتاری سے کاغذ پھاڑ ڈالا......

اور......

''اف......''

وہاں موجود ہر آنکھ میں ستائش حیرت بن کر اتری تھی۔ اتنی دیدہ زیب صراحی۔ ایسے خوب صورت بیل بوٹے۔ وہ رنگ۔

''واللہ...... واللہ...... کیا شاہکار گھڑا ہے۔'' وہ صراحی کو دو ہاتھوں میں اٹھائے، ذرا سا اونچا کیے اس جوش سے بولے کہ نظامی خاتون منہ اٹھا کر انھیں تکتی رہ گئیں۔

''خوب صورت ہے نا خالہ جان۔'' وہ اب تصدیق چاہتے تھے۔

''کس نے بھیجی ہے چھوٹے نواب صاحب؟'' اور خالہ جان مشکوک نظر آئیں۔

''بنوائی ہے خالہ جان! دین محمد کی صاحبزادی سے۔'' اور نظامی خاتون نے گہرا سانس لیا۔

''ہاں! اس کمہارن کے ہاتھ میں تو جادو ہے۔'' وہ لاپروائی سے بولیں پر نواب صاحب کہاں سنتے تھے۔ وہ صراحی کو نہیں سارگل کو تکتے تھے۔ نظر بیل بوٹوں میں سے بنانے والی کے ہاتھ کی رعنائی تلاشتے تھے۔ جب اس نے یہ نقش گھڑا ہوگا، فلاں رنگ بھرا ہوگا تو کیا سوچا ہوگا؟ کیا ہمیں؟ واقعی؟ مسرت انگ انگ سے پھوٹی پڑتی تھی اور نظامی خاتون۔

''خوب صورت تو بہت ہے پر آپ تو ننھے بچے ہی بن گئے ہیں شجاع! صراحی نہ ہوئی جام جمشید ہوگیا۔'' چڑ کر بولیں اور شجاع ایک مسرور، مردانہ قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

☆☆☆

اس کا سنا۔

ہنسی میں اڑا دیا۔ ٹھٹھا لگا دیا۔ جھلک کیا دیکھ لی مانو جان ہی پھنس گئی۔ گلے کی ہڈی بن گئی۔ نہ آوے نہ جاوے۔

بے تابی چڑھی اور یوں چڑھی کہ جیسے چناب ہو۔ قرار نہ آیا تو سب بہا لے جائے گی۔ نہس نہس کر

UrduBooks.pk

دیوے گی۔ کچھ باقی نہ چھوڑے گی۔

خط لکھا اور انتظار سہا۔

جواب آیا، مانو قرار آیا۔ چین آیا۔ یوں جیسے چڑھے چناب کو سانس آیا

کیا نشہ تھا اس نازنین سے مخاطب ہونے کا۔ بات کرنے کا اور پھر...... دن رات اس صراحی کو سامنے رکھے تکا کرتے تھے۔ پر صراحی بولتی نہ تھی۔ دل کا حال سنتی بھی نہ تھی۔ نواب صاحب حال سے بے حال ہوتے یا سر دیواروں سے ٹکراتے وہ تو بڑی شان سے میز پہ پڑی رہتی تھی۔ یوں جیسے وہ بھی سار گل تھی۔ حسین۔ بے نیاز۔ لاپروا۔ عاشقوں کی جان عذاب کرنے والی۔ دل کو برباد کر کے رکھ دینے والی۔

یہ جو عشق ہوتا ہے نا یہ عاشقوں کو تڑپانے کے لیے کوئی نہ کوئی بات نکالے ہی رکھتا ہے۔ آگ بھڑکائے ہی رکھتا ہے۔ اسی واسطے تو ان کا چین۔ قرار، آرام سکون سب کا سب جاتا رہتا ہے یوں رخصت ہوتا ہے جیسے کہ کوئی دنیا سے ہی گیا۔

نواب شجاع عاشق تھے یا عاشق ہونے والے تھے یا عاشق بن چکے تھے۔ یہ تو اب وقت ہی بتلانے والا تھا۔

☆☆☆

یہ بے تابی ہی تھی جو وہ اسلم دکان دار سے پتا معلوم کر کے دین محمد کے کارخانے چلے آئے۔ اب کے بہانا شکریہ ادا کرنے کا تھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد وہ منہ اٹھائے ادھر ادھر دیکھ ہی رہے تھے کہ......

”ہیں..... ہیں...... ارے او صاحب! کیوں بے نتھے بیل کی مانند گھسے چلے جا رہے ہیں؟“

حسینی نمودار ہو گئی تھی وہ بھی شور مچاتے ہوئے۔ حلیے سے ہی وہ صاحب آدمی معلوم ہوتے تھے اس لیے حسینی چاہ کر بھی اوئے لونڈے کہہ کر پکار نہ سکی تھی۔

”وہ ہم......“

”کون ہے حسینی؟“ ان کی بات راہ میں ہی رہ گئی تھی جب دین محمد اندر سے بولتا ہوا آیا تھا۔ شجاع گردن موڑے انھیں تکنے لگے۔

”کون ہو میاں؟“ اب اس نے براہ راست پوچھا۔

”وہ ہم اس لیے آئے تھے کہ......“

”اچھا اچھا منشی کی نوکری کے لیے آئے ہو۔ جب ہی پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔“ دین محمد نے ایک بار پھر سے ان کی بات کاٹی تھی۔

”نہیں حضور یہ تو...... آ...... اوئی......“ خورشید نے بتانا چاہا مگر نواب صاحب نے اس کا پیر ہی کچل ڈالا تھا۔ وہ پیر پکڑے دوہرا ہوا۔

”معاف کیجیے گا۔“ اور پھر خود ہی اسے سنبھالتے ہوئے بولے۔ اسی دوران انھوں نے آنکھ کے اشارے سے خورشید کو چپ رہنے کا کہا تھا۔

”یہ کون ہے؟“

”ملازم ہے۔“

”کس کا؟ تمہارا؟“

”نہیں جناب! ایک دکان سے کارخانے کا پتا معلوم کیا تو اس نے یہ نوکر میرے ساتھ کر دیا۔ انجان جو ہوں اس شہر میں۔“

”پہلے کہیں نوکری کی ہے؟“ وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے ساتھ آنے کا کہہ کر آگے کی طرف چلتے ہوئے بولے۔

”نہیں صاحب کی تو نہیں ہے مگر لکھنا پڑھنا جانتا ہوں۔ حساب کتاب بھی اچھا ہے میرا۔“ ان کے قدموں کی مدھم ہوتی آواز کے ساتھ ساتھ باتوں کی آواز بھی مدھم ہوتی چلی گئی اور انھیں دیکھ کر حسینی خورشید سے بگڑ کر کہتی تھی۔

”اب ٹل بھی جاؤ یہاں سے۔“ خورشید ایک برہم سی نظر اس پر ڈال کر وہاں سے چل دیا تھا۔

☆☆☆

پردہ......

ایک آواز آئی اور نواب صاحب منہ اٹھا کر اس سمت دیکھنے لگے کہ جہاں سے آواز آئی تھی۔

UrduBooks.pk

"اے صاحب۔ منہ اٹھا کر دیکھیے مت۔ منہ پھیر کر بیٹھیے۔"

"کیوں؟" برہم سا انداز۔ وہ میز کرسی بچھائے اپنے روز کے حساب کتاب میں مگن تھے جب حسینی مخل ہوئی۔

"بی بی آئی ہیں۔ پڑتال کریں گی۔ حساب کتاب دیکھیں گی۔"

اور مانو نواب صاحب کی جان اٹک گئی۔ وہ مہ جبیں۔ نازنین۔ ان کے اتنے قریب آئے گی۔

وہ آہستہ سے مڑے اور کرسی کا رخ پھیر کر بیٹھ گئے اور لگے وقت کی سانسیں گننے۔

سارگل نقاب کا سرا ہاتھ سے تھامے گربہ پائی سے داخل ہوئی۔ ایک نظر ان چوڑے شانوں پہ ڈالی اور پھر کاغذات کے پلندے کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

اور نواب صاحب کی جان ہر ہر ورق پلٹنے پہ نکل نکل جاتی تھی۔ وہ...... وہاں موجود تھی۔ ان کی پشت پہ۔ کسی بھاری مگر پر لطف آزار کی مانند اور کیا ستم تھا کہ وہ دیکھ نہیں پاتے تھے۔ اور سارگل کھڑے کھڑے ان اوراق کو پلٹتے پلٹتے یک دم ٹھٹکی۔

"یہ لکھائی؟ ایسے جیسے کہیں دیکھ رکھی تھی پر کہاں؟" ذہن کی گرفت میں نہ آیا تو وہ سر جھٹک کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئی۔ حساب اچھا تھا اس نئے منشی کا۔ لکھتا بھی نفاست سے تھا اور یہ نفاست۔ یہ بھی تو دیکھی دیکھی معلوم ہوتی تھی وہ پھر سے الجھی۔ ٹھہری اور پھر سے سر جھٹک کر حساب کی طرف متوجہ ہوئی۔

"بی بی چلی گئیں صاحب۔" اس کے جاتے ہی حسینی نے کہا اور نواب صاحب ایک گہرا سانس لے کر پلٹے تھے۔ سر کرسی کی پشت پہ گرایا اور آنکھیں میچ لیں۔ کمرے میں کوئی خوشبو نہیں پھیلی تھی پر پھر بھی کمرا مہکتا ہوا سا تھا۔

"آہ سارگل! کیا معلوم آپ کو کیا معلوم عشق جب ایک نواب زادے کو پچھاڑ دیتا ہے تو وہ نوابی چھوڑ کر منشی گیری کرتا ہے اور بھیس بدل کر آپ کے در تک آتا ہے کہ کسی روز۔ آخر کسی ایک روز یا تو یہ آگ بجھ جائے گی یا پھر یہ آپ کے دامن تک جا پہنچے گی۔ کسی اک روز۔ ہاں! کسی اک روز تو......"

☆☆☆

نور چشم، جان کا چین حضرت محل!

سلام عرض کرتے ہیں۔ آپ کے لیے پیار۔

اور بھائی صاحب کو دعا۔ خط اس واسطے لکھتے ہیں کہ آپ کو چھوٹے نواب کے حال سے آگاہ کر سکیں۔ آپ ماں ہیں۔ دل لخت جگر کو دیکھنے کے لیے تڑپتا ہوگا اور لخت جگر کے کیا کہنے۔ خوب ہوئی۔ وہ تو گجرات آ کر مانو سب کو ہی بھلا بیٹھے۔ انھیں نہ ماں کی یاد ستاتی ہے نہ بہاول پور کے باغ کھینچتے ہیں۔ وہ تو ایسے گم ہوئے گجرات میں کہ من تو شدم تو من شدی والا حساب ہے اور بہن گجرات ان کو راس بھی بہت آیا ہے۔ حضرت آپ اپنے پوت کو دیکھ لیں تو حیران رہ جائیں۔ باشاءاللہ ایسی صحت ہوئی ہے کہ گال سیبوں کی طرح سرخ ہو چلے۔ جسم پہلے کی نسبت بھر گیا ہے اور مزاج کے تو کیا ہی کہنے۔ لبوں پہ ہر وقت تبسم کھلا رہتا ہے۔ کبھی بجھ بڑھیا سے مذاق تو کبھی خورشید سے ٹھٹھا۔ کبھی کبریٰ کو تنگ کرتے ہیں تو کبھی گلی محلے کے لونڈوں کی خبر لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ روز صبح جناب کی سیر کو نکل جاتے ہیں اور سہ پہر میں لوٹتے ہیں۔ لگتا ہے اسی سیر نے صحت پہ اچھا اثر مرتب کیا ہے۔ اچھا اب رخصت چاہتے ہیں۔ کبریٰ پکارتی ہے۔ سب کو سلام اور دعا۔

از نظامی خاتون

☆☆☆

آج پورے پندرہ یوم ہو چلے۔

سارگل روز ان کے کمرے میں آتی، وہ پیٹھ پھیرے بیٹھے رہتے، اپنی پشت پہ وہ لطیف سا آزار سہتے اور پھر اس کے جانے کے بعد کل کا انتظار شروع کر دیتے۔ عین اسی وقت سے جب وہ قدم کمرے سے باہر رکھتی تھی۔ دل کا مقام اک آگ کا الاؤ بن

UrduBooks.pk

چکا تھا اب تو...... اور یہ آگ۔ بجھائے نہ بجھے والا معاملہ ہو چکی تھی۔ مقررہ وقت پر سماعتیں لفظ پردہ سننے کی شدید متمنی ہوتیں اور اس کے ساتھ ساتھ جیسے ہی وہ آواز آتی۔ اک جھنجھلاہٹ سی سر پہ سوار ہو جاتی۔ آہ!...... کب ہوگی دید کی طلب ٹھنڈی۔ کب؟ آخر کب؟ اور اس روز جان بوجھ کر حساب غلط کر دیا۔ کچھ تو ہوگا نا۔ کچھ تو بولیں گی ہی آخر...... پر ہوا کیا۔

''بی بی چلی گئیں منشی صاحب!'' حسینی نے روز کی طرح وہ ہی اک جملہ دہرا دیا۔ وہ بل کھا کر پلٹے۔ طیش سے صفحات کو الٹا تو وہ غلط حساب پہ لکیر پھیر کر درست کر گئی تھی۔ بنا کچھ کہے۔ ایسی ہی خاموشی کے ساتھ کہ جس خاموشی کے ساتھ وہ آیا کرتی تھی۔ نواب صاحب نے مارے غصے کے ہاتھ کا مکا میز پہ دے مارا۔

''یا خدا!'' وہ اپنے ہی بال نوچنا چاہتے تھے کہ اک خیال دماغ میں برق کی طرح دوڑا تھا اور انھیں سن کر کے رکھ گیا تھا۔ کیا ہو اگر وہ یک دم پلٹ کر اس کو دیکھ لیں تو؟ کیا ہو؟

کیا غصہ ہوگی؟ تلملائے گی یا تھپڑ دے مارے گی؟

☆☆☆

سولہواں دن۔

سورج طلوع ہوا۔ دن چڑھا اور کون جانتا تھا کہ آج کے دن کے چڑھنے کی سب سے زیادہ تمنا نواب شجاع نے کی تھی۔ رات اپنے ساتھ کانٹے ہی تو اگا لے آئی تھی اور آج تو وہ علی الصبح سیر کو نکل گئے تھے اور پھر گھنٹہ بھر دین محمد کے کارخانے کے باہر کھڑے ہو کر اس کے کھلنے کا انتظار کیا تھا۔ نواب صاحب بڑے مصمم ارادے سے آئے تھے کہ وہ کر گزریں گے۔ آج تو ضرور ہی۔ آج نہیں تو پھر کبھی بھی نہیں۔ وقت مقررہ پہ صدا آئی۔

''پردہ!'' نواب صاحب نے پیٹھ پھیری اور پھر اک منٹ۔ دو منٹ۔ ابھی؟ نہیں ذرا سی دیر اور...... اب؟ نہ نہ اک لمحہ اور...... اب تو؟......

اور......

''بی بی چلی گئیں منشی صاحب!'' اور منشی صاحب۔

''اللہ ہمیں غارت کرے۔'' اپنا ہی ماتھا پیٹ ڈالا تھا منشی صاحب نے تو۔ کشمکش میں ہی سارا وقت پار ہو گیا تھا۔

☆☆☆

سترہواں دن۔

آج کی رات کے پیرہن میں ببول بھرے پڑے تھے۔ صبح کا انتظار شدید ترین تھا۔ ہاں آج...... آج تو ضرور ہی...... آج وقت برباد نہ ہوگا اور خدا ہی جانتا تھا بس کہ کس جتن سے انھوں نے وہ وقت گزارا تھا اور پھر۔

''پردہ۔'' وہ چوکنا ہوئے۔ لگے اپنی ہی سانسیں گننے اور اس گنتی ہی میں وہ آواز آئی۔

''بی بی چلی گئیں منشی صاحب!'' اور منشی صاحب نے اپنا سر میز پہ دے مارا۔

اٹھارہواں دن۔

صبح کا انتظار جان لیوا تھا اور ابھی تو پورا دن پڑا تھا اسی انتظار کو سہنے کے واسطے۔ آہ۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ کب آخر کب؟ اور......

''بی بی چلی گئیں منشی صاحب!'' اور منشی صاحب نے تھک کر سر گرا دیا۔ یہ ان سے نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تو طے ہو گیا۔ اس کے پردے کی لاج جو تھی کچھ خاندانی وضع داری بھی تھی اور پھر اس کے بعد سارے دن اک جیسے ہو گئے۔ بےزاری، بےچینی، عجب سی دلگرفتگی، ناامیدی۔ یہ بیل آخر کس منڈھے چڑھے گی؟ دل کے کھیل یوں ہی تو کھیلے نہیں جاتے صاحب۔ خون جگر ہوتا ہے تو بات بنتی ہے۔ سخت آزردگی تھی۔ اک لامتناہی سی تشنگی تھی کہ جسے قرار آتا ہی نہیں تھا۔ دل کہیں ٹھہرتا ہی نہیں تھا اور شب و روز بیتتے نہ تھے۔ کھینچ کھینچ کر گزارنا پڑتے تھے۔ ایسے جیسے زندگی قید بامشقت ہو چلی۔

☆☆☆

UrduBooks.pk

''پردہ۔'' آواز آئی۔
اور نواب شجاع نے اک بھاری، کھینچ کر، سینہ بھر کر سانس لی اور رخ موڑ لیا۔
سار گل اندر داخل ہوئی، معمول کی طرح حساب کتاب کی پڑتال کی۔ واپس جانے کے لیے پلٹنا ہی چاہتی تھی کہ معلوم نہیں پاؤں کیسے بل کھا گیا۔
''سس......'' سسکاری بے ساختہ تھی، نقاب ہاتھ سے چھوٹا اور وہ دوہری ہوئی۔
شجاع یک دم، تیزی سے، بلا ارادہ پلٹے اور وہ جو سیدھی ہو رہی تھی۔ سیدھے ہوتے ہی نظر جو سامنے پڑی تو...... سینے میں اوپر کو اٹھا سانس، وہیں پہ رک گیا۔ اس کے ہونٹ مارے استعجاب کے نیم وا ہوئے......اور شجاع......
ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم......
''یا میرے اللہ! منشی جی......'' حسینی نے سینے پہ دو ہتڑ مارے پر منشی جی کو ہوش کہاں؟ وہ کیونکر سنتے حسینی کی پکار۔
''ارے کوئی ہے......مم......''
اور سار گل کے ہاتھ نے میکانکی انداز میں حرکت کی، بنا پیچھے دیکھے حسینی کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ حسینی کی آنکھیں پھٹ گئیں اور چند لمحے یوں بیتے جیسے کوئی خواب ہو۔ سار گل کا ہاتھ حسینی کے منہ کو بند کیے ہوئے اور وہ دونوں آمنے سامنے۔ چپ مگر اک دوجے کو تکتے ہوئے۔ وہاں کیا تھا جو بولنے لگا تھا؟
پھر وہ بے یقینی سے دو قدم پیچھے ہٹی۔ چند ثانیے ٹھہری رہی۔ مارے استعجاب کے سانس روکے کھڑی رہی کہ یہ۔ یہ حرکت اس سے سرزد ہوئی......
اور پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔
شجاع چند لمحے تو بے یقین کھڑے رہے اور پھر کرسی پہ ڈھے سے گئے۔ مانو مر ہی تو گئے تھے، وہ اک ساعت میں۔ ساعت کے ہزارویں حصے میں نواب شجاع سے مرزا عصمت بیگ ہو گئے تھے۔
''جب یار دیکھا نین بھر، دل کی گئی چنتا اتر۔''

☆☆☆

وہ آنکھیں بند کیے کرسی پر نیم دراز تھے، اتنے سکون میں تھے کہ لگتا تھا کہ ہر حسرت ہی مٹ گئی اور ادھر سار گل ایسے جیسے چپ جونک کی طرح چمٹ گئی تھی۔ پریشان حال تھی۔
یہ...... یہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ آخر ہو کیا گیا؟ رنگ زرد پڑ رہا تھا اور ہونٹ خشک۔ حسینی تو دہرے صدمے میں تھی۔ پہلے منشی جی کی حرکت اور پھر بی بی گل کا کام یا خدا! یہ دن بھی آنا تھا کہ جب شہر کے لونڈے بی بی کو یوں بے شرم دیدوں سے تکتے تھے اور بی بی، انہوں نے کسی کو بلانے کیوں نہیں دیا؟ حسینی نے الجھ کر سار گل کو دیکھا اور سار گل۔ ہونٹ چباتی ہوئی، پھیکی رنگت، بے طرح سے الجھی ہوئی، بکھری ہوئی۔
سواری کے گھر پہنچتے ہی اس نے اترنے میں جلدی کی اور بنا کسی سلام دعا کے سیدھا کمرے میں گئی۔
''اسے کیا ہوا؟'' زیبن حیرت سے پوچھتی تھیں اور حسینی کے پاس جواب نہ تھا اور جو تھا وہ کسی قیامت سے کم نہ تھا۔
''تو کیا اس بات کو راز رہنے دیا جائے؟''
اس نے زیبن کے چہرے کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

☆☆☆

''اے گل! کیا ہوا؟ کیوں کمرا بند کیے بیٹھی ہو؟ دو دن سے نہ کھانے کا ہوش نہ کارخانے گئی ہو۔ تم تو بیماری میں بھی کام کی جان نہیں چھوڑتیں تو اب کیا ہوا؟''
وہ جو کسی بے کار، ناکارہ شے کی طرح بستر پہ پڑی تھی، ماں کو بولتے ہوئے آتا دیکھ کر کسل مندی سے اٹھی تھی۔ منہ پہ ہاتھ پھیر کر سارے تاثرات زائل کرنا چاہے تھے۔
''کیوں یوں سر جھاڑ منہ پہاڑ پڑی ہو؟ اٹھو بٹیا۔ ہنسو کھیلو۔ کیا بے رونقی سی پھیلا رکھی ہے۔''
ماں اس کا منہ ماتھا چوم کر کہتی تھی اور اس نے

UrduBooks.pk

ماں کی کمر کے گرد دونوں ہاتھ لپیٹ کر منہ اس کے سینے میں چھپا لیا تھا۔ دل ایسے ہی بھرا پڑا تھا پر وہ ماں کے سامنے ضبط کھونا نہ چاہتی تھی۔

"سارگل؟" زبین نے اسے خود سے الگ کرنا چاہا پر وہ ضدی بچہ ہی ہو گئی تھی۔

"ہوا کیا؟ بولو تو سہی۔"

"کچھ نہیں ماں جان! بس تھک گئی تھی۔" ماں سے الگ ہوئی اور بکھرے بال سنبھالتے ہوئے بولی۔

"لو آج تک تو تمہارے منہ سے یہ لفظ نہ سنا۔ اب کیا ہو گیا۔ بٹیا! باپ کو بھی پریشان کر رکھا ہے۔ اٹھو شاباش باہر دستر خوان پہ ابا انتظار کرتے ہیں۔"

ماں اسے اٹھاتے ہوئے بولی۔

"آتی ہوں ماں جان!" پھیکے سے لہجے میں وہ بامشکل بولی تھی۔

☆☆☆

مچھلی جل کے بنا نہیں رہ پاتی۔ یہ سنا ہے۔

جل کے بنا اسے سانس نہیں آتی۔

پانی سے باہر وہ چند لمحے تکلیف بھرے گزارے گی اور پھر مر ہی تو جائے گی۔ یہ بھی سنا ہی ہے اور گر یہ تماشا ملاحظہ کرنا چاہو تو نواب شجاع کو ہی دیکھ لو۔

دو دن سے سارگل نہیں آ رہی تھی اور ان کی جان ایسے ہی اٹکی پڑی تھی کہ جیسے جل بن مچھلی۔ معلوم نہیں کیا ہو گا؟ کیا سارگل شکایت کرے گی؟ گر ایسا ہونا ہوتا تو ہو چکا ہوتا اور گر ایسا ہی کرنا ہوتا تو وہ حسینی کا منہ ہی کیوں بند کرتی۔ تو پھر کیا سارگل بھی؟ اور یہاں پہ آ کر دل یوں جکڑا جاتا کہ گویا دم نکال کر ہی جان چھوڑے گا۔

وہ سخت مضطرب، بے حد بے چین بیٹھے تھے اور جو ہونا تھا وہ تو سارگل کو ہی طے کرنا تھا اور سارگل۔

دو دن سے چٹیا کے بل بے طرح الجھے پڑے تھے۔ پوروں کی مہندی پھیکی ہوا چاہتی تھی۔ آنکھ نے سرے کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ کلائیاں سونی۔ آہ پیار گل کیا ہوا؟ آخر ہو کیا گیا؟ اور یہ ہی تو وہ جانتی نہ تھی کہ ہوا کیا؟

وہ سر کھڑکی سے ٹکائے آدھے چاند کو تکتی تھی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا اور نیند کسی اور ہی جہان کی سیر پہ تھی۔ اچانک کسی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ وہ چونک کر مڑی اور پھر بے تاثر چہرے کے ساتھ نگاہ پھیری۔ وہ حسینی تھی۔ چند لمحے خاموشی کسی رازداں کی طرح وہاں موجود رہی۔

"اسے وہاں سے نکلوا دو حسینی! اس طرح سے کہ بات کسی چوتھے تک نہ پہنچے۔"

"پر بی بی گل! وہ......"

"جو کہا ہے، اسے سنا تم نے؟ سنو اور سن کر عمل کرو حسینی! اسے وہاں سے نکلوا دو۔"

حسینی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اتنے ٹھنڈے اور سخت لہجے میں بات کاٹی گئی تھی کہ حسینی کے ہونٹ کسی مہر بند قفل کی طرح چپک گئے۔

☆☆☆

وہ بھی ویسی ہی پریشان سی صبح تھی جیسے ہر روز ہوا کرتی تھی۔ ہر روز کی طرح وہی حساب کتاب۔ وہی کرسی اور سامنے رکھا کاغذوں کا پلندہ۔ دل بے زار۔ ہاتھ سست۔ دماغ ساتھ چھوڑتا ہوا اور اک آزار جان کو چمٹتا ہوا۔ یا خدا! وہ سر ہاتھوں پہ گرائے بیٹھے تھے کہ اچانک ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ وہ چوکنا ہوئے۔ پھر ٹھہر سے گئے۔ کرسی سے یوں بے ساختہ اٹھے جیسے استقبال کو آگے بڑھنا چاہتے ہوں اور پھر تھم سے گئے۔

سانس کی گردش سنائی دیتی تھی اور دل کی دھڑکن مدھم...... مدھم۔ کان باہر کی آوازوں پہ۔ کوئی سواری آن رکی تھی دروازے پر۔ پیروں کی چاپ ابھرنے لگی اور ان کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ مانوس سی خاموش سی چاپ۔ وہ سنائی کیوں نہیں دیتی تھی۔ نظریں کواڑوں سے چپکی ہوئی یوں جیسے سارگل کو ان ہی کے پاس تو آنا تھا۔

UrduBooks.pk

دروازے کے پاس کوئی آیا تھا اور......

ایسے جیسے مٹی کا کوئی تودہ ان پر آن گرا تھا، وہ خاک ہی تو ہوئے تھے۔ وہ حسینی تھی اور وہ کڑے تیوروں کے ساتھ آگے بڑھتی تھی۔

''تم خود یہ نوکری چھوڑو گے یا ہم چھڑوائیں؟''

اس ملازمہ کے اس لہجے پہ نوابی خون نے جوش تو مارا پر مصلحت کا دامن چھوڑ کر ہوتا کیا؟ مارے ضبط کے چہرہ سرخ ہوا۔ انھوں نے اک نظر اٹھا کر بس حسینی کو دیکھا اور حسینی۔ بے اختیار پیچھے کو ہوئی۔ ایسا جلال۔ وہ کرسی سے اٹھے اور باہر کو نکل گئے۔

''تو انھوں نے نوکری چھوڑ دی تھی۔''

☆☆☆

''بی بی گل......؟''

''ہوں......''

''وہ چلا گیا ہے۔''

اور چٹیا کو بل دیتے بی بی گل کے ہاتھ یک لخت تھمے۔

''چلا گیا؟'' لب ہلے تو بے آواز گونج پورے بدن میں ویرانی کی طرح پھیلی تھی۔ بی بی گل نے بال وہیں کے وہیں چھوڑ دیے تھے۔

تو وہ چلا گیا تھا۔

☆☆☆

وہ گئی تھی کارخانے۔ پر من ٹھہرا ہی نہیں۔ جی لگا ہی نہیں۔ رنگ جیسے روٹھ گئے تھے۔ بیل بوٹوں کے نقش جیسے بھول گئے تھے۔ دھیان اللہ جانے کہاں تھا پر وہ کم از کم وہاں نہیں تھا کہ جہاں سار گل کے ہاتھ نقش گھڑنا چاہتے تھے۔ گھوم پھر کر۔ لے دے کر۔ بار بار بھٹک کر اس کمرے تک جاتا تھا کہ جہاں۔

''اف......'' اس نے سختی سے آنکھیں بھینچیں۔ ماتھا پیٹا۔

''نہیں سار گل! نہیں۔'' اس نے بھرائے دل کے ساتھ دل کو تنبیہ کی۔ پر دل نامراد کب ایسی تنبیہوں کو سنتا ہے۔ اچانک اس نے رنگوں کو پرے پھینکا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کیا ہوا بی بی گل؟'' حسینی نے اچنبھے سے پوچھا

''میری جان کے عذاب! کچھ نہیں ہوا۔ دو گھڑی مجھے بخشو گی؟'' اسے خواہ مخواہ ہی تاؤ آیا تھا۔ ہاتھ ٹھا کر آپس میں ٹکرائے اور حسینی کے سامنے جا باندھے۔ حسینی ہکا بکا۔ یا خدا! گرمی چڑھی بھی تو کس بات پہ۔ آخر گل بی بی کو ہو کیا گیا ہے۔

''اب میں جاؤں؟ کچھ حساب کتاب دیکھ لوں؟'' وہ نہایت چڑے ہوئے لہجے میں پوچھتی تھی۔

''کوئی غلطی ہوئی کیا بی بی گل؟'' اور بی بی گل پیر پٹخ کر۔ چٹیا کو زور سے پشت پہ پھینکتے ہوئے، دوپٹہ لہراتے ہوئے یہ جا وہ جا۔

دروازے پہ پہنچ کر وہ رک سی گئی۔ اس نے چاہا کہ وہ اس سمت نہ دیکھے کہ جہاں وہ خالی کرسی دھری تھی۔ پر پھر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ وہ، وہ خالی کرسی ہی تو دیکھنے آئی تھی۔ دل ایسے ہی۔ بے وجہ ہی بھر آیا تھا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھی، کرسی کے پاس جا کر ٹھہر سی گئی۔

گم صم وہ اس کرسی کو تکتی رہی تھی۔ چند لمحے صرف ہوئے۔ پھر اس نے دھیرے سے کرسی کھینچی اور بیٹھ گئی۔ سامنے دھرا کاغذوں کا پلندہ کھولا اور پھر نظر جیسے تھم سی گئی۔ وہ ورق پہ ورق الٹتی گئی۔ تکتی گئی۔ نہ جانے وہ کیا محسوس کرنا چاہتی تھی۔ کیا کھوجنا چاہتی تھی۔ وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ معلوم نہیں کتنی دیر یہ شغل جاری رہا اور جاری ہی رہتا کہ اچانک وہ جھٹکا کھا کر رکی تھی۔ کاغذ کے کونے میں باریک سا، چھوٹا سا لکھا تھا۔

''سار گل۔'' اور وہ لکھائی......اک جھماکا ہوا۔ اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس کہیں اندر ہی گم ہوا تھا۔ وہ نام لکھنے کا انداز۔

''حسینی...... حسینی......'' وہ چیخی تھی۔ نا صرف چیخی تھی بلکہ اٹھ کر بھاگی بھی تھی۔

''بی بی! کیا ہوا؟'' حسینی نے اسے دونوں

UrduBooks.pk

کندھوں سے تھام کر روکا۔ سانس ٹوٹ کر جڑتا ہوا۔ ماتھا پسینے میں بھیگتا ہوا۔ ہونٹ لرزتے تھے۔

''وہ..... وہ صراحی۔ کہاں، کس پتے پہ۔ بھیج..... بھیجی تھی؟''

''دھیرج بی بی! دھیرج۔ ہوا کیا؟ اس صراحی کا ذکر کیوں اب؟''

''حسینی! وہ منشی۔ وہ من..... مم.....'' اور حسینی نے اس کا منہ بند کر کے اردگرد دیکھا تھا۔ اور آنکھوں سے تنبیہ کی۔

''جانتی ہیں نا، کسی کو کوئی سن گن پڑ گئی تو کیا انجام ہوگا؟'' اور سارگل ڈھیلی پڑی تھی۔ اس نے حسینی کا بازو کھینچا۔ کمرے میں لے جا کر دروازہ بند کیا اور کہا

''مجھے اس صراحی والے لاٹ صاحب کا پتا چاہیے معلوم کرو وہ کون ہے؟''

''پر کیوں بی بی؟''

''اس لیے حسینی کہ منشی اور لاٹ صاحب ایک ہی شخص ہے۔''

اور حسینی کے اوپر سے ٹرین گزر گئی تھی۔

☆☆☆

''بس حضور۔ ہو گئی دید کی طلب پوری؟ دیکھ لیا اسے؟ چلیے اب بہاول پور واپس چلتے ہیں۔ بہت ہو گیا قیام۔ حضرت محل کئی خطوط بھیج چکیں۔''

یہ صحیح نہیں ہوا تھا۔ نواب صاحب جس راہ پہ چلنا چاہ رہے تھے۔ وہ راہ تو ان کے لائق ہی نہیں تھی۔ دھواں اٹھتا دیکھ کر خورشید پریشان تھا اور چاہتا تھا کہ نواب صاحب واپس چلے جائیں۔ پر نواب صاحب۔

''محبت میں دید کی طلب کبھی پوری نہیں ہوتی یہ تو بڑھتی ہے خورشید۔''

اور خورشید۔ وہ تو دھوئیں سے پریشان ہو رہا تھا یہاں تو آگ سلگی کیا بھڑک بیٹھی تھی۔

''حضور! دل بھی اپنا حسب نسب دیکھ کر لگایا کرتے ہیں اور وہ۔''

''جو دیکھ کر لگایا تو لگایا ہی کیا خورشید؟ وہ دل تو نہ ہوا۔ کاروبار ہی ہو گیا پھر تو......''

''نواب صاحب!'' خورشید زچ ہوا۔

''اس کے گھر میں کئی ایک ملازم کام کرتے ہیں۔ کسی ایک کو پیسے دے کر فارغ کروا یا غائب کروا دو، مجھے اس کے گھر میں نوکری چاہیے خورشید! سنا ہے گھر کے سارے نوکر سارگل کی ماں رکھتی ہے۔ بات بن ہی جائے گی کچھ روز تک۔ چار دن ہی سہی۔ چاندنی تو ہو گی نا خورشید۔''

وہ زیرلب تبسم کے ساتھ بولے تھے۔ اور خورشید کا بس نہ چلتا کہ کہاں پر سر دے مارے۔

''نوابی خون اب لوگوں کی چاکری کرے گا کیا؟''

وہ سخت آزردہ ہو رہا تھا۔ کس کے ساتھ وفاداری کرے؟ بڑے نواب کے ساتھ یا چھوٹے نواب صاحب کے ساتھ؟

☆☆☆

دن تو لگے تھے پر یہ کہ وہ اپنے معمول پہ آ ہی گئی تھی پر ایسا لگتا تھا کہ کچھ گم سا تھا۔ جیسے کچھ رہ گیا ہو۔ ہنسی کھلکھلاتی نہ تھی۔ نیند آنکھ بھر آتی نہ تھی۔ ایسا کچھ خالی سا من ہو چکا تھا۔

وہ بھی ایسا ہی دن تھا۔ وہ کارخانے جانے کے واسطے نکلی۔ حسینی نے آواز لگائی۔ ''پردہ'' اور سب نے رخ موڑ لیا۔ کچھ نے اس بھاری پردے کو یوں تھاما کہ محض ہاتھ کی انگلیاں نظر آتی تھیں۔

وہ دوپٹہ سر پہ جمائے۔ پلو سے چہرہ ڈھانپتی اندرونی دروازے کی سیڑھیاں اترتی تھی کہ یک لخت تھم سی گئی۔ اک سیکنڈ کا سا وقفہ اور وہ پھر سے حرکت میں آئی۔

''حسینی!'' اس نے سرگوشی کی۔ حسینی نے سوالیہ نظریں اس پہ اٹھائیں۔

''یہ جو بائیں طرف چوتھا بندہ کھڑا ہے، اس کی انگلیاں کسی ملازم کی نہیں ہیں۔'' کہہ کر اس نے حسینی کو دیکھا۔ نظروں ہی نظروں میں کوئی بات ہوئی۔

UrduBooks.pk

حسینی نے سر ہلایا اور...... سواری باہر کو نکلی اور حسینی پیچھے کو مڑ گئی۔ ملازم پردہ تہ کر رہے تھے۔

''بات سنو!'' حسینی نے اس کے پیچھے جا کر آواز دی

''نئے ہو کیا؟'' اور اس شخص کے مڑتے ہی حسینی دل پہ ہاتھ رکھ کر دو قدم پیچھے کو ہوئی تھی۔ اس کی تو ''ہائے'' بھی لبوں سے آزاد نہ ہو سکی تھی۔ وہ سینے پہ ہاتھ رکھے، سانس روکے، آنکھیں پھاڑے اس کو دیکھ رہی تھی اور وقت نے جیسے اپنی لگام کھینچ لی تھی۔

☆☆☆

''کیا؟'' سارگل حلق پھاڑ کے چلائی تھی۔

''وہ یہاں کیوں آ گیا؟... پاگل ہے کیا؟... اور تمہیں حسینی... تمہیں کیا کہا تھا کہ پتا کراؤ کہ وہ صراحی کس نے بنوائی تھی۔ تم سے اب تک یہ بھی نہ ہو سکا...''

رات کے اس پہر جب حسینی نے سارگل کو یہ بتایا کہ وہ ہاتھ کس کے تھے تو وہ تو پھٹ ہی پڑی تھی۔

''شش...... بی بی گل! کیوں غل مچاتی ہیں؟'' حسینی نے پریشان ہو کر دروازے سے باہر جھانکا تھا۔

''یا خدا! اس کی اتنی جرات کہ وہ سارگل کے گھر تک آ گیا۔ اسے کسی بات کا خوف، ڈر نہیں کیا؟'' وہ غصہ تو تھی ہی پر پریشان بھی کم نہ تھی۔

''بی بی فکر نہ کریں۔ اس کا بندوبست میں کراتی ہوں۔ معلوم کرواتی ہوں کہ ہے کون جو یوں اتنا اونچا اڑا جا رہا ہے۔''

اور جب حسینی کو معلوم ہوا کہ وہ ہے کون؟ تو وہ تو ڈھے ہی گئی تھی۔ یہ تو طے تھا کہ وہ سارگل کے پیچھے ہی آیا تھا۔ اب کیا کیا جائے؟ یہ ہی بات جب سارگل کے سامنے حسینی نے رکھی تو وہ تو خاموش ہی ہو گئی تھی۔

''اسے پیغام بھجواؤ کہ سارگل ملنا چاہتی ہے۔'' کئی ثانیے بعد جب وہ بولی تو بولی کیا۔ گھبو دھماکا ہی تو کر ڈالا تھا۔

☆☆☆

''سنیے۔''

حسینی نے سنو کہنا چاہا کہہ نہ سکی، لہجہ سخت کرنا چاہا کر نہ سکی۔ جب سے معلوم ہوا تھا کہ نوابی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں بات کرتے ہوئے حلق سوکھتا تھا اور زبان لڑکھڑا سی جاتی تھی۔ شجاع نے پلٹ کر دیکھا۔

اس نے حلق سے کچھ نیچے اتارا اور ارد گرد محتاط سی نظروں سے دیکھا اور ان کے قریب ہوتے ہوئے ایک رقعہ ان کے ہاتھ میں تھما دیا، پھر ان کی آنکھوں میں دیکھا جہاں حیرانی رقم تھی۔ اس نے سر سے رقعے کی جانب اشارہ کیا اور مڑ گئی۔ نواب صاحب نے حیرت سے اس رقعے کو دیکھا اور پھر جیسے یک دم الہام اترا تھا۔ انھوں نے فوراً رقعہ جیب میں ڈالا تھا۔

☆☆☆

''خالہ جان! کیا ہوا؟'' ابھی ابھی نواب صاحب نوکروں والا حلیہ بدل کر گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا خالہ تخت پر نیم دراز تھیں۔ منہ پر دوپٹے کا پلو ڈال رکھا تھا اور کبریٰ پیر دبا رہی تھی۔

''آپ کو کیا پرواہ خالہ کی۔ آپ بس شہر گھومیے۔ موج اڑائیے۔ خالہ جیے یا مرے آپ کی بلا سے۔'' وہ سخت آزردہ دکھائی دیتی تھیں۔

''ارے کیا ہوا؟ کیوں ناراض ہوتی ہیں؟'' وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھے اور آنکھ سے کبریٰ کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود اس کی جگہ سنبھالی اور لگے پاؤں دبانے۔

''خالہ جان! طبیعت ناساز ہے کیا؟

''شجاع؟...'' اور خالہ دل پہ ہاتھ رکھ کر یک دم اٹھیں اور ان کے ہاتھ تھام لیے۔ شجاع حیران ہوئے۔ ہاتھ تھام کر سیدھا کرتے ہوئے انھوں نے ہتھیلیاں اپنے سامنے کی تھیں۔ ہاتھوں میں گانٹھیں سی ابھر رہی تھیں۔ ہتھیلیاں سرخ پڑ رہی

UrduBooks.pk

تھیں۔

"شجاع! کیا ہوا یہ؟۔۔۔" وہ ششدر سی پوچھتی تھیں اور شجاع ہکا بکا اب کیا کہیں؟۔۔۔ کیا یہ کہ محبوب کے در پر کدال سنبھالے بیٹھے تھے۔ اک دم وہ پسینہ پسینہ ہوئے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔

"کچھ بھی نہیں ہے خالہ جان۔۔۔! آپ خواہ مخواہ وہم کرتی ہیں۔" انھوں نے ہاتھ واپس کھینچا۔

"یہ یہ وہم ہے شجاع۔۔۔! آپ کہتے ہیں وہم ہے۔۔۔ ہتھیلیاں چھلی پڑی ہیں یوں جیسے نواب کے نہیں کسی مزدور کے ہاتھ ہوں۔۔۔" انھوں نے دوبارہ ان کا ہاتھ اپنی طرف کھینچا۔

"سچ سچ کہو شجاع معاملہ کیا ہے؟۔ کہاں جاتے ہو کیا کرتے ہو؟۔۔۔ سچ بتاؤ۔۔۔" وہ سخت مشکوک ہوئی تھیں۔

"وہ خالہ جان! رسا کشی کا مقابلہ ہو رہا تھا تو یوں ہی ہم نے بھی حصہ لے لیا۔۔۔ بس اسی وجہ سے۔۔۔" اور خالہ کی جان میں جان آئی۔

"دیکھیے شجاع آپ ہمارے پاس حضرت محل کی امانت ہیں۔ آپ کو کانٹا بھی چبھا تو ہم ان کو کیا جواب دیں گے۔"

"ارے خالہ جان!۔۔۔ آپ یوں ہی پریشان ہو رہی ہیں۔ مردوں کو اتنی سی تکلیفیں کیا کہتی ہیں۔" وہ ہنس دیے۔

"کوئی تکلیف آپ پہ آئے ہی کیوں خالہ کی جان؟......" وہ ان کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے بولی تھیں۔ محبت کے اس مظاہرے پہ انھوں نے خالہ کو ساتھ لگا لیا تھا۔

"کبڑی او کبڑی۔۔۔ مرہم لائیے۔ ہم خود لگائیں گے۔" وہ اب کبڑی کو آوازیں دینے لگی تھیں۔

☆☆☆

وہ جس کیفیت کا شکار اس وقت سے تھے کہ جب سے اس رقعے کو پڑھ رکھا تھا، وہ کیفیت بیان سے باہر تھی۔ وہ ملنا چاہتی تھیں۔۔۔ وہ سارگل کہ اک عالم میں جس کے حسن کا چرچا تھا۔۔۔ وہ جو پاکیزگی کی اک مثال تھی۔۔۔ وہ جو کہ ماہر نقاش تھی وہ سارگل۔۔۔ وہ ان سے۔۔۔ خود ان سے ملنا چاہتی تھی۔۔۔ یا خدا! کہیں دم نکل ہی نہ جائے۔ کہیں ملاقات سے پہلے وہ مر ہی نہ جائیں۔ محبت گزیدہ کو نیند کیوں نہیں آتی؟۔۔۔ قرار کیوں نہیں آتا؟ سانس کیوں رک رک سا جاتا ہے؟ بے چینی کیوں نہیں رکتی؟ بیٹھے بٹھائے کیوں جی گھبرا گھبرا جاتا ہے؟ یہ انھیں آج سمجھ میں آیا تھا۔ خوشی تو تھی ہی پر دل میں کوئی وسوسہ بھی کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے چھوٹے نواب صاحب! آج بہت خوش دکھائی دیتے ہیں۔" خورشید نے ان کی حالت دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سارگل ملنا چاہتی ہیں۔۔۔" نواب صاحب جھکتے ہوئے بولے اور خورشید کو تو جیسے سانپ ہی سونگھ گیا تھا۔

"یہ کس راہ چل دیے تھے چھوٹے نواب؟۔۔۔"

☆☆☆

گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور وہ بیٹھے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بے قراری عود کر آئی تھی۔ دل نے دھڑکنے میں جیسے رفتار پکڑی تھی۔ سواری ان سے۔۔۔ ذرا فاصلے پر آ رکی تھی۔ چند لمحوں بعد حسینی نمودار ہوئی۔ اس نے سر کے اشارے سے نواب صاحب کو بلایا۔ وہ قریب گئے۔

"بی بی بات کریں گی" یہ کہہ کر اس نے کوچوان کو اشارہ کیا اور وہ دونوں وہاں سے ہٹ گئے تھے اور پھر لمبی خاموشی۔۔۔۔

یوں جیسے دونوں ہی چپ رہنا چاہتے ہوں۔ شجاع تو ان لمحوں میں ہی زندہ رہنا چاہتے تھے جبکہ وہ...... وہ چاہتی تھی کہ بات دوسری طرف سے ہو۔ ان دونوں کے درمیان اک دبیز پردہ حائل تھا اور اس کے پار زندگی سانس لیتی تھی۔

"کہیے محترمہ! کیسے یاد کیا؟" اور صاحب کا

چہرہ سرخ ہوا مارے طیش کے۔

"نوابی گھرانے کے چشم و چراغ کو ایسی حرکت زیب دیتی ہے کیا؟۔۔۔" لہجے میں پھنکار تھی۔

"نہیں دیتی۔۔۔ پر مجبوری کا لفظ تو سن ہی رکھا ہو گا آپ نے؟۔۔۔" جواب ترنت آیا۔

"ہا۔۔ مجبوری اور آپ؟۔۔۔ ہنہ۔۔۔" اور جواب کو چٹکی میں اڑا دیا گیا۔

"مجبوریاں محض مالی ہی نہیں ہوتیں صاحب!۔۔۔ کچھ معاملات دلی بھی ہوتے ہیں کہ نہیں؟۔۔۔" اور صاحبہ بل کھا کر بولی

"دل لگی کے لیے کوئی اور در ڈھونڈیے صاحب!۔۔۔ ہمیں بخشیے۔ میں، میرے ماں باپ آپ کی دل لگی سہار نہیں سکیں گے۔"

"دل لگی کے کھیل میں کوئی منشی گیری کرتا ہے نہ کدال سنبھال کر ہاتھ چھلواتا ہے سارگل!۔۔۔ کیا جانتی ہیں آپ کہ کس طرح نوابی حشمت کو پیر تلے روند کر، اپنے باپ کے نام کو بٹا لگا کر ہم نے چاکری کی اور آپ کے لیے دل لگی ٹھہری۔ واہ صاحب!" لہجہ تیز تو انداز گرم۔

سارگل اک لمحے کے لیے چپ ہوئی۔

"نواب صاحب!۔۔۔ اس بات کی، اس معاملے کی کسی کو ذرا سی بھنک بھی پڑ گئی تو آپ کا تو کچھ نہیں جائے گا اور میرے پاس کچھ رہے گا نہیں۔ چار دن کے جذبات کو محبت کا نام مت دیجیے۔ حسینی!۔۔۔" سخت لہجے میں کہہ کر اس نے حسینی کو آواز دی اور پھر جس طرح سے وہ آئی تھی اسی طرح سے واپس بھی چلی گئی۔ نواب صاحب تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ وہاں کہ جہاں گھوڑوں کی ٹاپوں سے خاک اڑتی تھی۔

☆☆☆

وہ جیسے ہی گھر داخل ہوئے خالہ روتی ہوئی پائی گئی تھیں۔ ان کے پیروں تلے کی زمین کھسکی تھی۔

"الٰہی خیر۔۔۔" کہتے ہوئے وہ تیزی سے خالہ کی طرف بڑھے۔

"کیا ہوا؟۔۔۔ کیا ہوا خالہ جان؟۔۔۔" ان کو کندھوں سے تھام کر۔ خود کے ساتھ لگاتے ہوئے پوچھا گیا۔

"ہائے شجاع۔۔۔ ہائے میری پھول سی بہن۔۔۔۔" اور شجاع کا دل دھک کر کے رہ گیا لب بنا آواز کے ہلے۔۔۔

"اماں جان"۔۔۔۔۔

"خالہ! کیا ہوا اماں جان کو، کچھ بتائیے۔ ورنہ خدا قسم یہ سانس رک جائے گا۔"۔ وہ بے چینی سے بولے۔

"حضرت بہت بیمار ہیں شجاع۔ حکیموں نے جواب دے دیا ہے۔ آج ہی خط آیا ہے۔۔۔" وہ روتے ہوئے بولیں

اور شجاع۔۔۔ ان کے ہاتھوں نے خالہ کے کندھے چھوڑے تھے، جسم بے جان ہوا اور وہ ڈھے سے گئے۔ سر ہاتھوں پہ گرا لیا۔۔۔ جسم میں گرم گرم لہریں اٹھ رہی تھیں۔ دل پھٹ رہا تھا۔۔۔ یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا تھا؟۔۔۔ کیا؟۔۔۔

"اماں جان۔۔۔۔" آنکھیں چڑھے دریا کی مانند بھر آئی تھیں۔

"اٹھیے شجاع۔۔۔۔ میرے بچے۔۔۔ ہمیں بہاول پور پہنچنا ہے۔ جلدی۔۔۔" اور حواس باختہ سے شجاع خالہ کا منہ تکتے تھے۔

☆☆☆

سفر در سفر کرتے ہوئے وہ بہاول پور پہنچے۔ ماں بستر مرگ پہ بے ہوش پڑی تھی۔

"ماں جان۔۔۔ ماں جان۔۔۔ وہ حضرت کے پیروں کو چہرے سے لگائے کس بے قراری سے پکارتے تھے۔ ضبط کمال تھا، تو حوصلہ ٹوٹتا نہیں تھا۔ آنسو بہہ نہیں پائے تھے پر وہ من کو جھلساتے تھے، کاٹتے تھے۔ یوں جیسے تیشہ پتھر کو کاٹتا ہے۔

☆☆☆

نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا کہ جب حضرت کے پیروں نے حرکت کی تھی۔

"ماں۔۔۔ماں جان۔۔۔" شجاع بے تابی سے پکارے۔

"شجاع۔۔۔۔" ماں نے بے بس ہو کر بانہیں پھیلائیں اور شجاع کسی ننھے بچے کی مانند ان پھیلی بانہوں میں جا سمائے۔ ماں کو خود میں سموتے ہوئے، آنسو ٹپک ٹپک کر گریبان کو بھگونے لگے۔

"کیوں روتے ہو ماں کی جان؟۔۔۔" ماں نے بال سنوارتے ہوئے پوچھا۔

"ہمیں معاف کر دیجیے ماں جان۔۔۔ہم آپ سے یوں غافل ہو گئے تھے۔"

ماں کمزوری سے ہنس دیں۔

"دیکھیے! ہم تو آپ سے غافل نہیں رہے۔۔۔بلا ہی لیا آپ کو واپس۔۔۔"

"شرمندہ نہ کیجیے ماں جان۔۔۔ہم غافل ضرور ہوئے تھے، بھولے تھوڑا ہی تھے۔" احتیاط سے ان کی پیٹھ پر تکیہ درست کرتے ہوئے بولے۔

"چند دن اور گزرتے تو یہ بھی ہو ہی جاتا شجاع۔۔۔کیا تھا ایسا اس چھوٹے سے شہر میں جو آپ اپنی راجدھانی ہی بھلا بیٹھے۔"

اور اس شہر کے ذکر پہ چھن سے کوئی بصارتوں میں اترا تھا۔ کسی کا تپا تپا سا لہجہ، سلگتی سی نگاہ یاد آئی تھی اور بے ساختہ ایک یخ ٹھنڈی آہ لبوں سے آزاد ہوئی۔

"سب بتائیں گے ماں جان۔۔۔پر ابھی نہیں۔ ابھی یہ بتائیے ہوا کیا آپ کو؟۔۔۔یوں اچانک اتنی بیمار کیسے ہو گئیں؟۔۔۔"

اور ویسی ہی اک ٹھنڈی آہ حضرت محل نے بھری تھی اور شجاع کو بیماری کے متعلق بتانے لگی تھیں۔

☆☆☆

پورے چار ماہ لگا کر اور خوب منافع کما کر منشی جی اور انور واپس آئے تھے۔ اور انور کامیاب ہو کر کیا لوٹا سمجھو سارگل کے بیاہ کا بگل ہی بج اٹھا۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑی تھی۔ مشاورت، خاندان کے بڑوں کا آنا جانا، شادی کی تاریخ کب رکھی جائے، زیبن کے سمدھن کے ساتھ بازار کے چکر پر چکر۔

اور رہ گئی سارگل تو...... تو اس کی جان تو جیسے کسی نے کھینچ ہی لی تھی۔ چپ کھائے چلی جا رہی تھی۔ "اقرار" کو وہ آنسو بن کر بہنے نہ دیتی تھی اور انکار اس کے بس میں نہ رہا تھا۔ کیسی دلدل تھی جس میں محبت اسے دھنسائے چلی جا رہی تھی۔ ڈوبتی بھی نہ تھی اور پار لگنے کا آسرا بھی نہ تھا۔ دیکھو وہ کیسے پیلی پڑ رہی ہے...... یہ نہ ہو کہ کسی روز ڈال سے ٹوٹ کر گر پڑے...... سوکھ ہی جائے۔ ارے کوئی تو دیکھو اسے۔۔۔مگر دیکھتا کون؟۔۔۔ماں جہیز کی فکروں میں۔۔۔باپ اعلا سے اعلا سامان تیار کروانے کے چکروں میں۔ بہن کوئی تھی نہیں اب ایسے میں لے دے کے بچ جاتی تھی حسینی۔ جو دیکھتی بھی تھی اور جانتی بھی تھی کہ کون سا روگ گل بی بی کو کھائے چلا جا رہا ہے پر وہ۔۔۔۔اس نے بھی آنکھیں بند کر چھوڑی تھیں کہ یہی بہتر تھا۔ اسی میں ہی تو بھلائی تھی۔

اور اس دن اس کے بیاہ کی تاریخ طے ہوئی تھی۔ وہ مٹھائی تھی جو شہر بھر میں بانٹی گئی تھی اور وہ صف ماتم تھی جو سارگل کے پیر سے لے کر سر تک لپٹی تھی۔

"اس دن اس نے محبت کو اقرار کی صورت آنکھوں سے بہہ جانے دیا"

اس نے ہار مان لی اور گردن جھکا دی۔

صاحب!۔۔۔۔۔۔یہ تو عمر بھر کا روگ ہے۔

آج کے بعد اس کا دل کبھی خوشی کے معنی اور راحت کا مطلب نہیں جان پائے گا۔ تو آج کے بعد اس کے دل کو سکون سے کوئی مطلب نہیں ہو گا۔۔۔

اب سے اس کا پالا بے چینی، اداسی، رنج اور درد سے ہو گا۔ وہ زخم خوردہ دل لیے جیے گی اور ہنسی کا ناٹک کرے گی۔ اک کسک کے ساتھ اسے تمام عمر بتانی ہو گی۔ اک خالی پن ہمیشہ اس کا حصار کیے رکھے گا اسے اب کوئی مرد بھا نہیں سکے گا۔

اس کو جس کا ہونا تھا وہ ہو چکی۔۔۔باقی تو

UrduBooks.pk

اب ناٹک ہی تھا جو اسے ساری عمر کے لیے جھیلنا بھی تھا اور کھیلنا بھی۔۔۔۔۔

آہ! سار گل...... تم تھیں تو شہزادی پر قسمت اسی کمہارن جیسی تھی کہ جس کی نسل کا خون تمہاری رگوں میں دوڑتا تھا...... آہ!...... سار گل...... آہ۔

وہ رات کے کسی پہر گھٹ گھٹ کر روتی تھی کہ اک رونا ہی تو اس کے بس میں رہ گیا تھا۔ حسینی نے اک نظر اسے دیکھا۔۔۔ اک ٹھنڈا، آہ جیسا سانس بھرا تھا۔ شانے پہ کسی ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہوئے اس نے یک دم سر اٹھا کر دیکھا۔۔۔۔

حسینی اسے ترحم سے تکتی تھی اور وہ بے اختیار اس کے گلے لگ کے یوں روئی کہ جیسے کوئی مر گیا تھا۔

مرا ہی تو گیا۔۔ سار گل کا پیار۔۔

ارے ایسے بھی کوئی مرتا ہے کیا؟ ابھی تو تمہیں دیکھا تک نہ تھا۔ تمہارا لمس کیا ہے یہ جانا بھی نہ تھا اور تم مر بھی گئے۔ چلے بھی گئے۔

رات تھی، روتی بلکتی سار گل تھی اور اس کے خاموش نوحے اور رات اس کے نوحوں سے بوجھل دکھائی دیتی تھی اور وہ رینگ رینگ کر بیتتی تھی۔

☆☆☆

اماں جان کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو انھیں بھی جیسے ہوش آیا تھا۔ نہا کر، کپڑے بدلنے کے بعد وہ ایسے سوئے کہ پھر شام کی ہی خبر لائے تھے۔ خورشید کے جگانے پہ ہی آنکھ کھلی تھی۔ وہ طشتری تھامے کھڑا تھا۔

"رکھ دیجیے خورشید!" وہ کسل مندی سے اٹھتے ہوئے بولے۔

خورشید چائے کی کشتی رکھ کر کھڑکیوں کی جانب بڑھا تھا۔ چق کھینچ کر اس نے پٹ کھولے۔ مغرب سے کی ہوا بل کھا کر کمرے میں داخل ہوئی۔ کھڑکی سے باہر باغ کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ درختوں کے پار مغرب کے کنارے سرخ پڑ رہے تھے۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور دور کہیں اذانوں کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ شجاع نے دل گرفتی سے اس منظر اور اس منظر میں ابھرنے والی سرخی کو دیکھا۔ چھن سے کسی کی سرخ، انگارہ ہتھیلی آنکھوں میں اتری تھی۔ دل میں تکلیف دہ کسک سی ابھری۔

"سار گل!" اک آہ کی مانند لبوں پہ نام ٹوٹا تھا۔ خورشید نے اک خاموش نگاہ ان پہ ڈالی اور طشتری آگے کی۔

"لے جایئے خورشید۔۔۔ ابھی جی نہیں۔" انھوں نے اسی طرح آنکھیں موندے ہوئے جواب دیا

"چھوٹے نواب! آپ نے کل سے کچھ......"

"جاؤ خورشید!" انھوں نے بے زاری سے بات کاٹی۔ انداز ایسا تھا کہ خورشید چاہ کر بھی کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکا۔ منہ لٹکا کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔

راہداری میں سے گزرتے ہوئے اسے پیغام ملا تھا کہ حضرت محل بلاتی ہیں۔

"یا الٰہی خیر ہو۔۔۔۔" وہ تفکر سے بڑبڑاتے ہوئے حضرت کے کمرے کی طرف بڑھا اور کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی جان ہوا ہوئی تھی۔

"بڑے نواب صاحب۔۔۔۔" اس کے ہونٹ بے آواز ہلے اور وہ وہیں پہ مر گیا تھا۔ وہ سفید ہوتی رنگت کے ساتھ آگے بڑھا تھا۔

☆☆☆

ایک ماہ بعد سار گل کا بیاہ انور سے ہونا طے پایا تھا۔ دن تھے کہ پر لگا کر اڑتے تھے اور اسی حساب سے سار گل کی جان نکلتی تھی۔ وہ کام میں منہمک رہتی۔۔۔ زیادہ سے زیادہ وقت مٹی کے گھڑوں کے ساتھ بتانے لگی تھی کہ کیا پتا اب کی بار کوئی گھڑا کچا نہ نکلے اور اسے پار پہنچا آئے کیا پتا؟

اس کے ہونٹوں پہ ہنسی کھیلتی نہ تھی۔ آنکھ میں خوشی ناچتی نہ تھی۔

ماں نے اس روز جو اس کی حالت دیکھی تو چیخ ہی تو اٹھی۔ ہاتھ مٹی سے لتھڑے ہوئے، بال بے

urdubooks.pk

ترتیب الجھے ہوئے، گال زرد تو ہونٹ خشک، چہرے پہ جا بجا مٹی لتھڑی تھی اور وہ جنون کی سی کیفیت میں چاک پر اک گھڑا بنا رہی تھی۔ اسے پار جو اترنا تھا۔ پر پار اتر کر کوئی ہو گا کیا جو اس کی راہ تکتا ہو؟ کوئی ہو گا کیا جو اس کے لیے پچھلی تیار کر کے رکھتا ہو؟ ہو گا کوئی ایسا کیا؟ اور یہاں آکر وہ ٹھٹھر کر رک جاتی تھی۔ کچھ عذاب اکیلے ہی، چپ چاپ جھیلنے ہوتے ہیں۔

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے سار گل؟" ماں اس کے سر پہ آکر چیخی۔ یہ ابا کی پرانی بھٹی تھی جو کئی سالوں سے بند تھی اور جس کا چاک بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا تھا۔ یہ احاطہ اصطبل کے ساتھ ملحق تھا۔ سو جب سے تاریخ طے ہوئی تھی سار گل کا کارخانے آنا جانا بند کر دیا گیا۔ تو اس نے ضد کر کے اس پرانے چاک کو ہی ٹھیک کرا لیا تھا۔

پہلے وہ رنگ بھرتی تھی، نقش گھڑتی تھی اور اب کہ اسے گھڑا بنانے کا شوق چرایا تھا۔۔۔۔ بس پھر کیا تھا چاک تھا اور اس کا غم۔۔۔ اور اس کے ہاتھ اک انوکھا گھڑا بنانا چاہتے تھے جو کچا نہ ہوتا۔۔۔ اور بے وفائی نہ کرتا۔ ماں کے چیخنے پہ اس نے خاموش نظروں سے ماں کو دیکھا۔ وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی آئی تھیں۔

"کیا ہو گیا تمہیں؟۔۔۔ جب سے بیاہ کی تاریخ طے ہوئی ہے۔ تمہاری حرکتیں ہی الٹ ہو گئی ہیں۔ ارے ایسا بھی کیا غم بابل کا گھر چھوڑنے کا۔" اور وہ سر جھکائے یوں اپنے کام میں منہمک تھی جیسے ماں کسی اور کے ساتھ سر کھپا رہی تھی۔

"اٹھ۔۔۔ گل۔۔۔ اٹھ۔۔۔" اس نے بازو سے پکڑ کر سار گل کو اٹھایا اور وہ بے جان شے کی مانند اٹھ گئی تھی۔

"حسینی۔۔۔ حسینی۔۔۔" دوسری کڑک آواز حسینی کے لیے تھی۔

"جی بی بی حضور۔۔۔" حسینی لپک جھپک حاضر تھی۔

"اسے لے جاؤ۔ ہاتھ منہ دھلواؤ۔۔۔ کپڑے بدلواؤ اس کے اور بال سیدھے کر کے بھیجو۔ اس کے ابا یاد کر رہے تھے اسے اور یہ ہے کہ نہ جانے کس چیز کا سوگ لیے بیٹھی ہے۔"

سخت لہجے میں کہہ کر زیبن وہاں سے چلی گئی تھیں اور حسینی نے اک آہ بھر کر اسے دیکھا جو ہاتھوں سے اک اضطراری انداز میں مٹی کھرچ رہی تھی اور اب اسے دیکھ کر آہ ہی تو بھری جا سکتی تھی۔

"چلیں گل بی بی۔" حسینی نے اس کا بازو تھاما اور وہ رک سی گئی

"حسینی؟" اس نے الٹا اسے بازو سے تھام کر روکا۔

"کیا ہوا گل بی بی؟" وہ ذرا حیرت کا شکار ہوئی

"تم نے اسے دیکھا کہیں؟" اور حسینی کا دل پھٹ گیا تھا

"اتنی بے چارگی آپ پہ جچتی نہیں گل بی بی۔ خدارا یوں منت نہ کیا کریں۔ چلیں۔" حسینی کی آواز رندھ گئی تھی اور سار گل۔۔۔ وہ شکستہ قدموں کے ساتھ اس کے ساتھ ہو لی تھی۔

☆☆☆

"سار گل کہاں ہے۔ بلایا نہیں تم نے؟ کتنے دن ہو گئے مصروفیت میں، میں اپنی بیٹی سے ٹھیک طرح سے بات بھی نہیں کر سکا۔"

"آ رہی ہے۔ ایک تو آپ اس کے ہر شوق پہ لبیک کہتے ہیں۔ شہزادی کو پتا ہی نہیں کہ کچھ دنوں بعد بیاہ ہے اس کا۔ ہر وقت چاک پہ ہی بیٹھی رہتی ہے۔ اپنی کوئی پرواہ ہی نہیں۔" زیبن چنختی تھی۔

"ارے کیا ہو گیا ہے سار گل کی ماں! جانتی تو ہو اس کا شوق ہے، اب کارخانے جانا بند کر دیا تو وہ معصوم بھی کیا کرے گھر بیٹھ کر۔ اسے تو گھر بیٹھنا آیا ہی نہیں زیبن۔ دو ہی تو شوق ہیں اس کے، ایک رنگ بھرنا دوسرا گھڑ سواری۔"

"ان ہی باتوں کی وجہ سے وہ من مانی کرتی ہے۔ مجال ہے جو کسی کی سن جائے۔"

UrduBooks.pk

"ارے زیبن! تم خواہ مخواہ اس پہ گرم ہوتی رہتی ہو۔ تمہاری بیٹی عام لڑکیوں جیسی تھوڑی ہے۔ وہ تو ہیرا ہے ہیرا۔ جانتی ہو، اب اس کے کام کی شہرت ہندوستان سے باہر بھی پھیلنے لگی ہے۔ تمہیں یاد ہے وہ ایرانی سوداگر جو بہت پہلے مجھ سے صراحیاں لے کر گیا تھا اور اس نے جب بہت سے مٹی کے کھلونے خریدے تو میں پوچھے بنا رہ نہ سکا کہ کس لیے لیتے ہو؟"

اور اس نے جواب دیا۔

"سارگل کے لیے۔" میں نے حیرت سے کہا کون سارگل؟ تو جواب آیا "میری بیٹی"۔ تب سارگل کو پیدا ہوئے چار دن ہوئے تھے اور میں نے اسی سوداگر کی بیٹی کے نام پر اپنی بٹیا کا نام رکھا تھا۔ بہت پسند آیا تھا مجھے وہ نام۔ نگر نگر گھومنے والا انسان ہے۔ ٹوٹی پھوٹی اردو بول ہی لیتا تھا۔"

"ہاں یاد ہے اور میں نے کتنا اعتراض کیا تھا اس نام پہ۔" زیبن جیسے کچھ یاد کر کے مسکرائی تھی۔ زیبن جانتی ہے کہ اب بھی ان دونوں میں خط و کتابت ہوتی رہتی تھی اور وہ اکثر تجارتی قافلوں کے ذریعے دین محمد سے مال بھی منگوایا کرتا تھا۔

"اسی کا خط آیا ہے۔ اس دفعہ اچھا خاصا مال بھیجنے کو کہا ہے اس نے۔ دہلی میں اس نے سارگل کا کام دیکھ لیا تھا، پتا کروانے پہ جب معلوم ہوا کہ مال دین محمد کے کارخانے سے آیا ہے تو جھٹ خط لکھ ڈالا۔ اب دل نہیں مانتا کہ بٹیا سے ایسے میں کام کرواؤں جب اس کا بیاہ طے ہو چکا۔ سارگل آئی ہے تو کہتا ہوں خط لکھ کر معذرت کرے یا پھر مہلت مانگ لے۔ اب اتنی بڑی سائی کو موڑنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔"

"اور ابا! آپ منع بھی نہیں کریں گے۔ میں بناؤں گی مال۔ شادی ہے تو کیا ہوا؟۔۔۔ ہاتھ نہیں ٹوٹے میرے۔ تین دن کی شادی کے لیے مجھے اب پورا ماہ قید کر کے رکھیں گے کیا؟۔۔۔" وہ سخت آزردہ لہجے میں بولی تھی۔

"پاگل ہوئی ہو، سارا خاندان تھو تھو کرے گا۔۔۔"

"خاندان کا تو کام ہی تھو تھو کرنا ہے اماں۔۔۔ پہلے وہ کیا نہیں کرتے تھو تھو میرے کارخانے جانے پر۔ چلیں اب ذرا زیادہ کر لیں گے۔۔۔" عجیب سی ضد تھی اس کے لہجے میں۔

"نہیں سارگل بٹیا۔۔۔ یہ مناسب بات نہیں۔ تم فی الحال خط لکھ کر یہ اطلاع کر دو کہ مال دین محمد کی بٹیا کی شادی کی وجہ سے تاخیر سے پہنچے گا۔"

اور سارگل اس جگہ کو دیکھنے سے بھی گئی۔ اندر چھن سے کچھ ٹوٹا اور اسے زخمی کر گیا تھا۔

"ابا! خدا کے لیے مجھے جانے دیں۔ آپ کے گھر میری یہ آخری خواہش ہوگی۔۔۔" اور آنکھوں سے آنسو بن موسم کی برسات کی طرح ٹپکے تھے۔

"گل۔ میری جان۔ میری بٹیا۔ ابا کی جان تم پہ قربان روئیں تمہارے دشمن۔ اتنی سی بات پہ کیوں دکھی ہوتی ہو۔ یہ سب تمہارا ہے جب، جہاں جیسے جی چاہے جاؤ، جو من کرے وہ کرو۔ بس رونا نہیں میرے بچے۔ ابا کا دل پھٹتا ہے۔"

دین محمد اسے سینے میں سموئے تڑپ کر بولا تھا اور زیبن۔ وہ اس کے یوں رونے پر حیران تھی۔ وہ آنسو پونچھتے وہاں سے چلی گئی تھی۔

"لگتا ہے گھر چھوڑنے کے خیال کو دل پہ ہی لے لیا ہے اس نے تو۔۔۔" زیبن تفکر سے بولی تھی۔

"چار دن سسرال رہ لے پھر میں انور اور اسے ادھر ہی لے آؤں گا۔ میری کون سا اولادوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ میں خود اس سے دور نہیں رہ سکتا۔" دین محمد بھرائی ہوئی آواز میں بولا تھا۔

☆☆☆

وہ جب سے آئی تھی اس کے کمرے میں، اس کی کرسی پر آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ ذہن کی گرفت میں ماضی کا وہ لمحہ تھا۔ وہ ہی لمحہ جو تمام عمر کے لیے آزار بن کر رہ گیا تھا۔

UrduBooks.PK

وہ اس کا بے اختیار پلٹنا۔ وہ سارگل کا بے ساختہ نقاب چھوڑنا۔

اے کاش کہ وہ پلٹتا ہی نہ۔۔۔ گر پلٹ ہی گیا تھا تو وہ نقاب ہاتھ سے چھوٹنے ہی نہ دیتی۔۔۔

"یا خدا!" تکلیف سے اس نے ماتھا میز سے ٹکرایا تھا۔

"جب ایک ہونا قسمت میں کہیں سرے سے تھا ہی نہیں تو محبت ہوئی ہی کیوں؟" دو آنسو لڑھک کر اس کے گالوں پہ آن ٹھہرے تھے۔

"بی بی۔۔" حسینی نے ڈرتے ڈرتے پکارا

"تنگ نہ کرو حسینی۔۔۔ جاؤ یہاں سے۔" اس نے سر اٹھائے بنا آزردگی سے کہا اور حسینی باوجود شدید خواہش کے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

☆☆☆

"کیا یہ بچہ ہماری اماں جان کا علاج کرے گا؟" شجاع ماں جان کے پاس موجود اس سترہ اٹھارہ سال کے نوجوان کو دیکھ کر سخت حیران ہوئے تھے۔ حکیم کے آنے کا سن کر وہ ماں جان کے کمرے میں آئے تھے تاکہ ماں جان کی بیماری کے متعلق ان سے تفصیل سے بات کرسکیں مگر آگے وہ بچہ حضرت کی نبض تھامے بیٹھا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے ابا حضور کو۔ جو ایک بچے کو ماں جان کا علاج کرنے لا بٹھایا۔" وہ سخت برہم تھے۔

"ارے نہیں نہیں شجاع میاں۔ یہ تو حکیم نذیر کا بیٹا ہے۔ حکمت کا فن سکھانے کے لیے اسے ساتھ رکھتے ہیں۔ وہ ذرا تمہارے ابا سے بات کرنے گئے ہیں۔" نظامی خاتون انھیں ٹھنڈا کرتے ہوئے بولی تھیں۔

"ہماری ماں جان کیا لوگوں کو حکمت سکھلانے کے لیے ہی رہ گئی ہیں؟" مارے طیش کے رنگت سرخ سی پڑنے لگی تھی۔

"اگر نوجوان مریضوں سے نہیں سیکھیں گے تو مریضوں کا علاج کیسے ہوگا؟ چھوٹے نواب صاحب۔ میرے باپ نے بھی مجھ کو ایسے ہی حکمت سکھلائی تھی اور اب میں اپنی اولاد کو نہ سکھاؤں کیا؟" اپنے پیچھے سے آنے والی اس تیز آواز پر شجاع نے مڑ کر دیکھا۔ اس جواب پہ شجاع ہونٹ بھینچ کر چپ ہوئے کہ بات تو سچ تھی۔ وہ نوجوان اپنا کام چھوڑ کر ان دونوں کی طرف متوجہ تھا۔

"علی! جو تمہیں محسوس ہوتا ہے مریض کی حالت کے بارے میں، وہ ایک پرچے پہ تحریر کرکے مجھے دکھاؤ۔" وہ بیٹے کو حکم دیتے ہوئے بولے اور پھر شجاع کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

"آیئے نواب صاحب!" اور وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے چلتے باغ تک آئے تھے۔

"کیا ہوا ہے ماں جان کو؟" ذرا سے توقف کے بعد نیچی آواز میں پوچھا گیا تھا۔

"مرض پکڑ میں نہیں آرہا ہے چھوٹے نواب صاحب۔ مرض کی تشخیص ہوگی تو ہی علاج شروع کیا جاسکتا ہے۔"

"اوہ خدایا!" شجاع کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا۔

"حوصلہ کیجیے نواب صاحب۔ حوصلہ۔ مجھے یہ بات ایک بیٹے کو کہنی تو نہیں چاہیے تھی مگر کوشش کیجیے کہ انھیں خوش رکھیں کیونکہ......" اور شجاع نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔

"میری ماں جان کو کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ بھی نہیں۔" شدت جذبات سے کہتے ہوئے وہ تیز قدموں کے ساتھ وہاں سے چلے گئے تھے۔

☆☆☆

وہ ماں کی پٹی سے لگے بیٹھے تھے۔ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔ کپڑے تک میلے اور سلوٹ زدہ ہو چکے تھے۔

"شجاع! کیا حالت بنا رکھی ہے آپ نے بچے۔" ماں تھیں نا۔ ایسی حالت کو دیکھ کر تڑپ ہی تو اٹھی تھیں۔

"ہم ٹھیک ہیں ماں جان! بس اب آپ ٹھیک ہو جایئے۔ چھوڑیے اس بستر کو اب۔" لہجہ بے بس تو انداز یوں کہ جیسے کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔

"میرے لعل۔ میرے چاند! فکر نہ کرو ہم نے موت سے کہہ رکھا ہے جب تک ہمارا چاند سہرا نہیں باندھے گا ہمیں لینے مت آنا۔ اب دیکھیے شجاع موت کہاں تک ہماری سنتی ہے۔"

"ماں جان!"

"کیوں دل دکھاتی ہیں۔" ان کی آواز رندھ گئی تھی۔

"ہمارا دل نہیں دکھتا کیا شجاع! یہ سوچ سوچ کر کہ ہم اپنے لعل کی کوئی خوشی بھی نہ دیکھ پائیں گے۔ جانتے ہیں نا، کتنے ارمان ہیں ہمیں آپ کے بیاہ کے۔" اور اتنا کہہ کر وہ اپنے آنسو صاف کرنے لگیں۔

"کچھ نہیں ہوگا آپ کو۔ ہم کہہ رہے ہیں نا۔ کچھ بھی نہیں ہوگا آپ کو۔ ہم حکیم بدلواتے ہیں آپ کا۔ خدا جانے کیا کر رہا ہے وہ۔ لگتا ہے ابا حضور نے شہر کا نکما ترین حکیم ڈھونڈا ہے۔" وہ غم کی تندی سے کہتے تھے

"حکیم بدلوانے سے کیا ہوگا شجاع! جینا تو وہی ہے جو لکھا جا چکا۔ ہمیں اتنی سی خوشی دے دیجیے کہ ہم آپ کے سر پہ سہرا سجا سکیں۔ پھر ہم اتنے سکون سے موت کو خوش آمدید کہیں گے کہ وہ خود بھی حیران رہ جائے گی۔"

"ماں جان آپ پر میری جان بھی قربان۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر مگر آپ کی صحت۔"

"میری صحت کو چھوڑیے شجاع! آپ ہاں کیجیے پھر دیکھیے گا کہ بیماری کیسے بھاگتی ہے۔" وہ جوش سے بات کاٹ کر بولی تھیں۔

"ماں جان! جیسے آپ کی خوشی مگر......"

"ارے شجاع۔ ہمارے بچے۔ ہماری جان! جی خوش کر دیا آپ نے تو۔ آپ کے ابا سب طے کیے بیٹھے ہیں بس آپ کی ہاں کی ہی تو دیر تھی۔ ہم آج ہی عتیقہ کے گھر پیغام لے کر جاتے ہیں۔"

شجاع کے ہاں کہنے کی دیر ہوئی تھی حضرت میں تو جیسے اللہ نے نئی روح ہی پھونک ڈالی تھی۔

"عتیقہ؟" شجاع کی تو مانو جان ہی کھینچ لی تھی اس نام عتیقہ نے۔ وہ سن ہو کر ماں کو تکتے تھے جو کہ اب جوش سے ملازموں کو آواز دے رہی تھیں۔ وہ چند لمحے حیرت، بے یقینی اور شاک سے ماں کو دیکھتے تھے۔

"ماں جان۔ ماں جان ہماری بات سنیے، ہم شادی ضرور کریں گے مگر عتیقہ۔" وہ ماں کو دونوں کندھوں سے تھامتے ہوئے بولے۔

"اوفوہ! یہ ملازم سب کدھر مر گئے، میری کوئی سنتا کیوں نہیں۔" وہ جھنجھلا کر خود ہی اٹھ گئی تھیں۔

"ماں۔ ماں جان۔ ہماری بات۔" مگر حضرت تو یہ جا وہ جا۔ یوں جیسے جناتی طاقت آ گئی ہو ان میں اور شجاع ہکا بکا سے انھیں جاتا دیکھتے رہ گئے تھے۔

یہ کیا ہو گیا تھا؟ کیا؟ وہ تو سارگل کا نام لینے کا ارادہ رکھتے تھے پر یہ کیا ہوا تھا؟

☆☆☆

یہ تب کی بات تھی کہ جب حضرت محل اور نواب وقار الملک پورے نوابی جاہ وجلال کے ساتھ عتیقہ کے گھر روانہ ہونے کو تھے اور شجاع کی تو جیسے جان پہ بنی تھی۔ تیاریاں عروج پہ تھیں اور شجاع کے قدم کمرے کا طول و عرض ماپتے تھے۔ بے قرار بے چین۔ مفروضے قائم کرتے اور پھر خود ہی توڑ ڈالتے۔

"ہو سکتا ہے، عتیقہ کے ماں باپ انکار کر دیں مگر وہ کیوں انکار کریں گے۔ اتنی بڑی جاگیر اور نوابی کے اکلوتے وارث۔ وہ کیوں انکار کریں گے آخر؟ آخر کیوں؟"

"کسی ملازمہ کو خط دے کر کیوں نہ بھیجا جائے اور عتیقہ کو کہلوایا جائے کہ وہ اس رشتے، اس بیاہ پہ راضی نہیں، نہیں نہیں۔ عتیقہ کون سا تیر مار لے گی۔ کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ عورتوں کو ان کے خاندان میں کتنی آزادی حاصل تھی۔ عتیقہ کو تو بس فیصلہ سنا دیا جائے گا۔"

اف۔۔۔۔ اف یا خدا! ہم کریں تو کریں۔

UrduBooks.pk

کیا؟۔۔۔ کدھر جائیں۔ تھک ہار کر وہ سر کے بال نوچنے کو آ گئے تھے۔

"پھر......" وہ یک دم اٹھے۔

"فیصلہ سوچ بچار سے نہیں ہوتا، فیصلہ جواں مردی اور حوصلے سے ہوتا ہے۔"

سر پہ پگڑی لپیٹتے ہوئے، بل کھاتی راہداریوں میں سے گزرتے ہوئے آنکھوں میں نوابی جاہ و جلال ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ پیر زمین پہ پڑتے تو زمین ایڑیاں اٹھا کر تکتی تھی۔ ملازم ذرا ٹھہر کر انہیں تکتے تھے اور خادمائیں بے ساختہ سینے پہ ہاتھ رکھتی تھیں۔ یہ چال۔ یہ انداز۔ بھینچے ہوئے جبڑے، سخت چہرہ اور تیز تیز چلتا سانس۔

"سارگل نہیں تو کوئی اور بھی کیوں؟" راہ داری کے موڑ پہ جیسے فیصلے پہ مہر ثابت ہوئی تھی۔

اور اب وہ اچکن کے کھلے بٹن بند کرتے ہوئے آخری راہداری عبور کرنے کو تھے۔ بڑے نواب صاحب کے سامنے پیش ہونا تھا، کوئی مذاق نہیں تھا یہ۔

کمرے کے دروازے پہ پہنچ کر لمحے کا توقف بھی کیے بنا اک جھٹکے سے پٹ وا کیے تھے۔

"شجاع؟" حضرت کے لب بن آواز کے ہلے۔ بڑے نواب بھی چونکے تھے۔ اک لمحے کو وہاں سکوت سا پھیلا تھا۔

"کیا بات ہے شجاع؟" بڑے نواب صاحب نے رعب سے پوچھا

"جانتے ہیں ابا حضور وقت مناسب نہیں مگر بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"نور نظر! ابھی وقت نہیں ہے، ہم آ کر بات کر لیں گے۔" ماں ماتھا چوم کر بولی۔

"نہیں ماں جان! اگر ابھی بات نہ کہی گئی تو پھر کبھی بھی کہی نہ جا سکے گی۔ کہنا لازم ہوا اب تو۔" وہ ماں کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے، چوم کر بولے۔

"شجاع! اتنے بے ادب آپ کب سے ہو گئے؟ سنا نہیں ماں کیا کہتی ہیں؟" بڑے نواب صاحب کا جلال امڈ کر آیا تھا۔

"بے ادبی معاف ابا حضور۔" انھوں نے دونوں ہاتھ باپ کے سامنے جوڑے مگر اس طرح کہ گردن جھکی نہ تھی، شانے ڈھلکے نہ تھے اور پیر مضبوطی سے زمیں پہ جمے تھے۔ "مگر ہمیں ابھی ہی بات کرنی ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے ہاتھ کھولے اور ماں کو دیکھا۔

"ہم عتیقہ سے نکاح نہیں کر سکتے ماں جان!" اور حضرت محل بے دم ہو کر پیچھے کو ہٹیں۔

"کیوں؟" ان کے منہ سے سرسراتا ہوا نکلا۔

"اس لیے کہ ہم سارگل سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔" ماں دل پہ ہاتھ رکھ کر ڈھے گئیں اور خالہ نے دونوں ہاتھ ہونٹوں پہ رکھ لیے تھے۔

نواب وقارالملک چند لمحے اپنے پوت کو گھورتے رہے اور جب بولے تو سب نے انہیں تعجب سے دیکھا

"بیٹھیے شجاع۔ بیٹھ کر بات کیجیے۔" اور انھوں نے کمرے موجود نفوس کو بھی پرسکون رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ یہ ردعمل؟ شجاع نے رک کر باپ کا چہرہ دیکھا تھا۔ یہ مذاق نہیں تھا۔ مذاق ہو بھی کیسے سکتا تھا؟

"اوہ خدا!" بے ساختہ شجاع نے آنکھیں بند کر کے سکون بھرا گہرا سانس لیا ایسا سانس، جس نے ان کی آنکھ کو نم کر ڈالا تھا۔ تکلیف جو کسی کانچ کی مانند دل میں پیوست تھی، اُس کانچ کے نکلنے پہ بھی درد ہوا تھا۔ تو یہ اتنا آسان تھا کیا؟ بس۔ سارگل۔ اب کے یہ نام تسلی بن کر روم روم میں اُترا تھا نہ کہ آگ بن کر۔ انھیں چند لمحے لگے تھے باپ تک جانے میں۔ وہ منتظر شجاع کا چہرہ تک رہے تھے۔

"کون سارگل شجاع؟ آپ کس کی بات کرتے ہیں؟" ان کے بیٹھتے ہی بڑے نواب صاحب نے پوچھا۔

"ابا حضور! وہ دین محمد کی صاحبزادی ہیں۔"

"کون دین محمد؟"

UrduBooks.pk

" گجرات شہر کا مشہور کمہار ہے بھائی صاحب!"
اور یہ پھنکارتی آواز نظامی خاتون کی تھی۔ کچھ کہنے کے لیے شجاع کا کھلا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا تھا۔ بے اختیار حلق سے کچھ نیچے اترتا دکھائی دیا تھا۔

" کمہار؟" بڑے نواب صاحب نے اس قدر حیرت سے یہ لفظ ادا کرتے ہوئے شجاع کو دیکھا تھا کہ انہیں بے ساختہ اپنا سر جھکانا پڑا تھا۔

" جی ابا حضور کمہار۔" آواز پست تھی مگر ارادہ بلند تھا۔

" تو آپ ایک کمہاری کے پیچھے ایک نواب زادی کو ٹھکرا رہے ہیں شجاع؟" بڑے نواب صاحب کی حیرت تھی کہ جاتی نہیں تھی۔

" ابا حضور ہم پسند کرتے ہیں انہیں اور ہمیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ وہ کمہاری ہیں۔ نواب زادی نہیں"

" لیکن ہمیں ہے شجاع! ہمیں ہے غرض۔" بڑے نواب صاحب تنتنا کر اٹھے تھے۔

" اس نوابی خاندان میں۔ نوابی خون میں پچھلے ساڑھے چار سو سال سے کوئی ملاوٹ نہیں ہوئی اور آپ چاہتے ہیں کہ ہم اپنا خون گندا کرلیں۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ ایسا سوچیے گا بھی مت شجاع!" غیض و غضب وہ جو آج تک اس حویلی میں کسی نے دیکھا نہ تھا۔ آواز کی گرج لرزا کر رکھ دینے والی تھی پر شجاع نے بھی تو محبت کو منہ لگا رکھا تھا۔ ڈرتے کاہے کو؟ نظر اٹھا کر باپ کو دیکھا۔

" ابا حضور ساڑھے چار سو سال سے اس خاندان کے نوابی خون میں ملاوٹ نہیں ہوئی تو...... تو ان ساڑھے چار سو سال سے پہلے کا کیا؟ کیا ابا حضور؟ کیا تھے ہم سکھ کہ ہندو؟"

" شجاع!" نواب وقار نے اس قدر غرا کر کہا کہ حضرت دل پہ ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مارے طیش کے بڑے نواب صاحب کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہاں دل بھی اب سہم سہم کر دھڑکتے تھے، اتنی سراسیمگی پھیلی تھی۔

" شجاع! چلے جائیے یہاں سے۔ چلے جائیے بہت تکلیف دی ہے آپ نے ہمیں۔ چلے جائیے۔" حضرت بہت دلگیر تھیں۔

" ہم چلے جاتے ہیں ماں جان مگر جان لیجیے! عتیقہ کیا کوئی اور بھی ہماری زندگی میں نہیں آسکتا۔ سارگل کے علاوہ کوئی نہیں!"

بڑے نواب صاحب اس جرات پر بے حد حیرت سے انہیں تکتے تھے۔ وہ تو کہہ کر جانے کے لیے مڑ گئے لیکن۔

" حضرت......" اور یہ چیخ نظامی خاتون کی تھی۔

☆☆☆

سارگل کے لیے شادی کا تحفہ آیا تھا۔ ابا کے کسی کاروباری دوست نے بھیجا تھا اور تحفہ بھلا تھا کیا؟ سیاہ...... چمکتی ہوئی اعلا نسل کی گھوڑی۔ اتنے دنوں میں پہلی بار سارگل کے پھیکے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آئی تھی۔

" بھیجنے والا ذوق رکھتا ہے حسینی!" مدھم سا مسکراتے ہوئے اس نے گھوڑی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

" شکر ہے گل بی بی! آپ نے قفل تو توڑا۔ اللہ تیرا شکر ہے۔" حسینی دونوں ہاتھ اٹھا کر بولی اور وہ حسینی کی اس حرکت پر افسردہ سا مسکرائی۔

" اس کو تیار کرواؤ حسینی! کل پو پھٹتے سمے اسے چناب کی سیر کروا کر لاتے ہیں۔" وہ اب گھوڑی کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولی تھی۔

" ٹھیک ہے گل بی بی مگر ساتھ اور کون جائے گا؟" اس سوال پر گل بی بی نے مڑ کر حسینی کو دیکھا اور کہا۔

" اور کوئی بھی نہیں۔ تم بھی نہیں حسینی!" اور حسینی نے دہل کر اسے دیکھا

" آپ کیا کرنا چاہتی ہیں گل بی بی!" وہ خوف سے پوچھتی تھی۔ وہ ایک بار پھر سے حسینی کا چہرہ دیکھنے پہ مجبور ہوئی تھی

"فکر نہ کرو حسینی۔ پریشان نہ ہو۔ مرے غرق ہونے کے لیے میرا انور سے بیاہ ہی کافی ہے۔ چناب بھلا کیا بگاڑ لے گا میرا؟"

اور اس کے لہجے کا درد حسینی کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہوا تھا۔

☆☆☆

اور پھر اس روز کی صبح نے دیکھا ایک سیاہ، چمکتی سیاہ گھوڑی مغربی سمت سے بگٹٹ دوڑی چلی آرہی تھی۔ اپنے سموں سے خاک اڑاتی تھی اور اپنی پیٹھ پر بیٹھے سوار پہ نازاں تھی اور اس کا سوار سیاہ شلوار قمیص میں ملبوس، چہرہ کالے ڈھاٹے سے چھپائے، پگڑی کی طرح دوپٹہ سر پہ لپیٹے اسے دوڑائے چلا جارہا تھا۔ یہ گرمیوں کی ایک صبح تھی۔ سورج اچک اچک کر جہان والوں کو دیکھنے کی تگ و دو میں تھا۔ چناب پر مچھیرے جال پھینک رہے تھے اور وہ اس سوار کو حیرانی سے تکتے تھے جو لمحہ بہ لمحہ دریا کے پاس آئے جا رہا تھا۔ مچھیروں سے دور، نسبتاً اک سنسان طرف اس نے لگامیں کھینچی تھیں۔ گھوڑی کی پشت سہلا کر اسے آزاد چھوڑا وہ خود ایک پتھر پہ بیٹھی تھی۔

چہرہ ابھی تک چھپا ہوا تھا۔ ذرا سے پائنچے اٹھائے یوں کہ اس کی چوڑی پٹی والی پازیب دکھتی تھی وہ پیر پانی میں ڈالے چناب کی لہروں کا شور سنتی تھی اور یہ اندازہ لگاتی تھی کہ کہاں زیادہ شور برپا ہے۔ وہاں اس پانی میں یا یہاں خانۂ دل میں۔ افق پار پو پھٹ رہی تھی اور معلوم نہیں کیوں اسے اک لاحاصل سا انتظار تھا۔

''وہاں دور...... کنارے پار سے کوئی آئے گا۔ آئے گا کوئی صرف اس کے لیے، اس کے لیے ہی تو......''

اور اگر وہ نہ آیا تو؟ سوال اٹھا اور اس سوال کے جواب میں اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا تھا۔ تو کیا وہ اک گھڑا بنائے؟ وہ اپنے ہاتھوں کو تکتی تھی۔

''کہ کیا بنائے وہ اک گھڑا جو اسے پار لے جا سکتا ہو؟ کیا بنائے وہ؟''

اور چناب اس کی رگوں میں ٹھاٹھیں مارتا تھا۔

☆☆☆

اس چیخ پہ شجاع دہل کر مڑے اور انھوں نے حضرت کو پورے قد سے گرتے دیکھا تھا۔

"ماں جان۔" وہ وحشت سے پکارتے ہوئے ان کی طرف لپکے۔

"دفع ہو جائیے شجاع۔ چلے جائیے۔ حضرت کو کچھ ہوا نا تو یاد رکھیے گا، ہم معاف نہیں کریں گے آپ کو۔ نکلیے یہاں سے۔"

بڑے نواب صاحب نے اسی پر بس نہیں کیا تھا بلکہ گریبان سے پکڑ کر انھیں باہر کو دھکیلا تھا۔ پگڑی دور جا گری، لباس بے ترتیب ہوا۔

"ابا حضور! ہماری بات سنیے۔" اور دروازہ ان کے منہ پہ بند ہوا تھا۔

ماں جان۔ ماں جان۔ ماں جان...... ماں...... وہ بند دروازے پہ ہاتھ مار کر اس درد سے بولے کہ گلے میں خراش پڑ گئی تھی مگر ان کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

حضرت کی حالت انتہائی نازک تھی، یہ دوڑتی، اندر باہر جاتی کنیزوں کے پیروں سے پتا چلتا تھا اور وہ بے بس۔ اپنی ہی ماں کے در پہ کسی فقیر کی طرح پڑے تھے۔ حکیم اور نذیر کو اندر جاتا دیکھ کر انھوں نے بھی جانا چاہا تھا مگر سامنے خورشید تھا۔

''خورشید! ہمیں ماں جان کو دیکھنے دو۔'' اور خورشید نے روتے ہوئے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ شجاع ششدر رہ گئے۔ وہ اب ان کے پیروں کی طرف جھک رہا تھا۔

''دروازہ بند کیجیے خورشید!" بڑے نواب صاحب کی گرج دار آواز سنائی دی۔ شجاع نے آگے بڑھ کر خورشید کو کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور خود دروازہ بند کرنے لگے۔۔۔۔۔ یہ ماں جان کو دیکھنے کی ایک کوشش بھی تھی مگر مسہری کے پردے گرے ہوئے تھے۔ مایوس ہو کر انھوں نے پٹ بھیڑ دیے مگر

پورا دروازہ بند ہونے سے پہلے انھوں نے حکیم نذیر کی آواز سنی تھی

" یہ کھڑکی تو کھولیے۔ تازہ ہوا اندر آنے دیجیے۔"

☆☆☆

کتنے ہی لمحے گزر گئے۔ وہ وہاں چھپ کر کھڑے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ کمرے سے مجمع چھٹے تو وہ کھڑکی پھاند کر اندر جا سکیں۔ اب کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ وہ احتیاط سے آگے بڑھے۔ سر اٹھایا ہی چاہتے تھے کہ یک دم پھر سے نیچے ہوئے تھے۔ وہ حکیم نذیر کی آواز تھی جس نے انھیں جھکنے پہ مجبور کیا تھا۔

"علی! تم نے مریض کے بارے میں اپنی رائے تحریر کر دی؟" اور شجاع کے دماغ کو گرمی چڑھی تھی۔

"یعنی کہ حد ہے اتنی نازک صورت حال میں بھی حکیم صاحب کو حکمت سکھلانے کی پڑی تھی۔ قریب تھا کہ غصے کے مارے وہ کھڑکی پھاند لیتے لیکن......" اک بار پھر اندر سے آتی آواز نے انھیں روکا تھا۔

"اچھا! لاؤ دکھاؤ تو ذرا۔" اور پھر ذرا سی دیر کی خاموشی۔ حکیم صاحب وہ کاغذ پڑھتے جاتے تھے اور ان کے لبوں پر تبسم بکھرتا جاتا تھا۔

" شاباش میرے شیر۔ شاباش بالکل درست تجزیہ ہے تمہارا۔ ضائع کر دو اور یاد رکھنا نواب شجاع کو اس کی بھنک بھی نہ پڑے۔" اب کہ یہ ان کا خود کا نام تھا جس نے انھیں ساکت کیا تھا۔ وہ حیران ہوئے۔

"مجھے کہتے ہیں کہ مرض پکڑ میں نہیں آتا اور بچے کو درست تجزیے پہ شاباشی دی جا رہی ہے۔ یہ ماجرا کیا ہے؟" اسی اثناء میں نوجوان "جی ابا جان" کہہ کر وہاں سے چل دیا تھا۔ شجاع نے بیٹھے بیٹھے ذرا سا سر اوپر کیا تو علی دروازے سے باہر جاتا دکھائی دیا تھا۔ دوسری نظر ماں کی مسہری پہ پڑی تھی کہ جس کے پردے ابھی بھی گرے ہوئے تھے۔ وہ دل گرفتی سے پیچھے ہٹے اور پھر مڑ کر تیزی سے بیرونی گیٹ کی جانب چل دیے تھے۔

☆☆☆

ایک چناب تو وہ تھا نا جو شہر سے باہر ٹھاٹھیں مارتا تھا اور ایک چناب وہ تھا جس نے اس کے دل میں طوفان اٹھا رکھا تھا۔ اس کو انتظار لاحاصل کی سولی پہ لٹکا رکھا تھا۔ وہ روز چناب کنارے جانے لگی۔ منہ اندھیرے نکلتی اور پو پھٹتے سے واپس ہو لیتی۔ دو ملازم خاص گھوڑی کے لیے رکھ چھوڑے تھے۔

حسینی کے علاوہ وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ بی منہ اندھیرے گھڑ سواری کو نکلتی ہیں۔ ان کا منہ پیسے نے بند کر رکھا تھا۔

وہ آتی اور دبے پاؤں اوپری منزل پہ واقع اپنے کمرے کو ہو لیتی۔ کبھی جو ماں سے ٹاکرا ہوتا تو وہ کہہ دیتی باہر باغ میں ہوا کھانے گئی تھی۔ ابھی بھی وہ بلی کو مات دیتے زینہ طے کر کے اوپر آئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی حسینی کی جان میں جان آئی تھی

"گل بی بی! آپ ضرور کسی دن میری جان نکالیں گی۔" وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کر بولی۔

اس نے خاموشی سے ایک نظر اسے دیکھا اور تھک ہار کر پلنگ پہ بیٹھی تھی۔

"تمہاری جگہ میری جان کیوں نہ نکلے حسینی!" وہ اتنی آزردگی سے بولی کہ حسینی کا دل بھر آیا۔

"ایسے نہ کہا کریں۔" اس نے سارگل کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر منت کی

"میرے بس میں نہیں ہے۔" وہ بے چارگی سے بولی۔ حسینی نے تکلیف سے آنکھیں بند کیں اور اس نے تھک کر پلنگ کے ساتھ سر ٹکایا۔

"تمہیں معلوم ہے حسینی! ہر روز میرا دل کرتا ہے کہ میں ایسی ایڑھ لگاؤں۔ یوں گھوڑی بھگاؤں کہ نہ ہی کوئی سارگل بچے اور نہ ہی کبھی نواب کا خیال۔ یقین مانو، میں زمین کی حد پھلانگ جانا چاہتی ہوں۔ خود کو فنا کر ڈالنا چاہتی ہوں۔ چناب کو

خود میں ضم کر دینا چاہتی ہوں۔ نہیں چاہیے ایسی زندگی حسینی! نہیں چاہیے۔ جس کا آغاز ہی اس قدر تکلیف دہ ہے اور وہ...... وہ کم بخت آگ لگا کر خود نہ جانے کہاں مر گیا۔" یہ کہتے ہوئے سارگل کا منہ سرخ ہوا۔

"آپ جانتی ہیں یا گل بی بی! نوابوں کا یہ ہی وتیرہ رہا ہے۔" حسینی نے تسلی کے انداز میں گل کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھا۔

"تو پھر اس نواب نے منشی، ملازم بننا کیسے قبول کر لیا تھا حسینی کیسے؟ یہ بھی نوابوں کا وتیرہ رہا ہے کیا؟"

حسینی یکلخت خاموش ہوئی اور گل بی بی یوں بولتی تھیں کہ جیسے بین کر رہی ہوں۔ حسینی نے تھک کر گہرا سانس لیا تھا۔

☆☆☆

بڑے مگن سے انداز میں وہ گھر کی طرف پیدل ہی جا رہا تھا کہ یک دم کسی نے پیچھے سے قمیص کو پکڑ کر کھینچا۔ وہ توازن قائم نہ رکھ سکا اور بے اختیار لڑکھڑایا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا یا کچھ کرتا یا کوئی آواز ہی نکالتا اسے منہ پر ہاتھ رکھ کر گھسیٹا گیا اور درختوں کی اوٹ میں لے جایا گیا۔ تنے کے ساتھ لگاتے ہوئے اس کو گھسیٹنے والے نے ایک ہاتھ سے سختی سے اس کا گلا دبایا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے خنجر کی نوک اس کے پہلو میں کھبوئی تھی۔

"تم مجھے بتاؤ گے ماں جان کو کیا بیماری ہے یا پھر یہاں تمہاری لاش پڑی ہوگی۔" اور علی کا رنگ فق ہوا۔ آنکھیں ابل آئیں۔ شجاع کے چہرے کا جلال جان کھینچتا تھا۔

شجاع نے جھپٹ کر اس کی جیب سے کاغذ نکال لیے تھے۔ وہ دو رقعے تھے۔ شجاع نے علی کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھا اور اس نے اوپری کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کاغذ پڑھنے لگے۔

"میری تشخیص کے مطابق مریضہ کو کوئی مرض نہیں۔ وہ کسی پریشانی کا شکار ہو کر ناٹک کر رہی ہیں۔

مریضہ کی دھڑکن بالکل ٹھیک ہے۔ وہ کم یا زیادہ نہیں ہوتی وہ بھی اس وقت جب وہ شدید گھبراہٹ کی شکایت کرتی ہیں۔ ان کی آنکھیں بھی سفید یا زرد نہیں، وہ بالکل ایسے ہیں جیسے کسی صحت مند آدمی کی ہوتی ہیں۔ ہاتھ پیر کے ناخنوں کا رنگ بھی کسی طور ایسا نہیں جس سے کسی مرض کی نشاندہی ہو سکے۔

چہرے کی رنگت البتہ ذرا پھیکی سی ہے اور اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ انھیں کوئی پریشانی ہے۔ فشار خون بھی اسی حساب سے چلتا ہے۔ اب یا تو یہ ناٹک ہے یا پھر اپنی کوئی بات منوانے کا حربہ۔ جیسا کہ عموماً عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔ اب اصل بات کیا ہے واللہ اعلم بالصوب۔"

شجاع جیسے جیسے پڑھتے جاتے تھے ان کا رنگ فق ہوتا جا رہا تھا۔ حیرانی نے رکھ کر ان کی پسلیوں پہ گھونسا مارا تھا۔ وہ سیدھے کھڑے رہنے کے قابل بھی نہ رہے تھے۔

"یہ کیا ہے؟..." جب بولے تو آواز ایسی تھی کہ جیسے کسی کنویں سے آتی ہو۔

"کیا بکواس ہے یہ؟..." پھر یک دم غرا کر کہتے ہوئے انھوں نے پھر سے اس کا گریبان پکڑا تھا۔ علی اور سہما۔

"قسم لے لیجیے چھوٹے نواب صاحب! قسم لے لیجیے۔ یہ ہی سچ ہے۔ ابا پہلے مجھے جانچ رہے تھے مگر آج انھوں نے بھی تائید کی ہے۔" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

شجاع کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

"ماں جان۔ ماں جان ایسا کیوں۔ کیوں کریں گی۔" شل ہوتے وجود کے ساتھ وہ لڑکھڑا سے گئے۔ ان کو یوں ڈھیلا پڑتے دیکھ کر علی نے حرکت کرنا چاہی تھی مگر شجاع نے ترنت اس کے ارادے کو بھانپا تھا۔

"سنیے علی نذیر! سنیے اور کان کھول کر سنیے۔ کسی

UrduBooks.pk

کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ آپ کے ساتھ ہم نے کیا کیا اور اگر کسی کو بھی، ذرا سا بھی شک ہوا نا۔"

اور وہ اچانک رک سے گئے۔ دھیان ہاتھ میں تھامے دوسرے رقعے کی جانب گیا تھا۔ کسی خیال کے تحت کھول کر دیکھا تو۔

"جان من! تمہارے بنا دن کا چین ہے نہ رات کا آرام۔"

اور انھوں نے بے اختیار علی کو چھوڑا تھا۔

"بس اب ہمیں ۔۔۔ کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔" وہ خط ذرا سا اونچا کرتے ہوئے بولے۔

"میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ کچھ بھی نہیں۔ ایک لفظ تک نہ کہوں گا صاحب! بس آپ ابا کو اس کے بارے میں مت بتایئے گا۔" وہ اب دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے منت کرتے ہوئے بولا۔

شجاع چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتے رہے یوں جیسے سچ جاننا چاہتے ہوں۔

"یاد رکھیے گا۔ چھوڑیں گے نہیں ہم آپ کو اگر،" انھوں نے رقعہ ذرا سا ہوا میں بلند کیا اور ان کی نظریں ایک کھلی دھمکی دیتی تھیں۔

علی نے زور و شور سے نفی میں سر ہلایا اور شجاع نے اسے جانے کا اشارہ کیا تھا علی نے وہاں سے بھاگنے میں دیر نہ لگائی تھی اور شجاع کے سامنے ایک ہی سوال دھمال ڈالتا تھا۔

"ماں جان نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں کیا۔"

اور پھر یک دم کسی بھاری پتھر کی مانند دل پر ایک خیال آ گرا تھا

"کیا میری شادی کے لیے؟" اور وہ بے دم وجود تنے سے جا ٹکرایا تھا۔

☆☆☆

اور اب اگر ماضی میں جھانکیں تو...... اس پل جب خورشید کو بڑے نواب صاحب نے بلایا تھا تو تب...... ٹھیک تب کیا ہوا تھا۔

راہ داری میں سے گزرتے ہوئے اسے پیغام ملا تھا کہ حضرت محل بلاتی ہیں۔ پیغام سنتے ہی اس کا رنگ فق ہوا تھا۔

اور کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی جان ہوا ہوئی تھی۔

"بڑے نواب صاحب۔" اس کے ہونٹ بے آواز ہلے

"بڑے نواب۔" نواب وقار الملک۔ کھڑی ناک اور گھنی مونچھیں۔ سیاہ اچکن میں ملبوس، کافی سے زیادہ رعب دار شخصیت۔ سن بھی کوئی پچاس پچپن برس ہوگا۔ اونچا۔ سفید کڑکڑاتا شملہ اور وہ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے۔

"یہ خیال رکھا آپ نے؟ چھوٹے نواب کسی کمہارن سے عشق کی پینگیں بڑھاتے رہے۔ چناب کی سیر کے بہانے اس کے باپ کے ہاں نوکری کرتے رہے اور آپ ہمیں تب خبر کرتے ہیں جب پانی سر سے گزر جاتا ہے؟" بڑے نواب صاحب اس قدر جلال میں تھے کہ خورشید تھر تھر کانپنے لگا۔

"غلطی ہو گئی حضور! میرے خیال میں یہ جوانی کا ابال تھا۔ چار دن کی دل لگی تھی پر چھوٹے نواب تو سچ میں ہی دل لگا بیٹھے۔"

"یہ سارا معاملہ آپ کی وجہ سے بگڑا خورشید! یہاں اطلاع نہ کرتے۔ نظامی خاتون کو ہی بتلا دیتے، اب بھی اگر حضرت محل کی بیماری کا بہانہ نہ گھڑتے تو شجاع تو بیاہ ہی لاتے اس کمہار کی اولاد کو۔"

"معافی حضور۔ معافی۔ غلطی ہو گئی بڑے نواب صاحب۔"

"غلطی تو ہوئی پر اب اسے سدھارو گے بھی تم ہی۔"

"جان بھی حاضر ہے نواب صاحب۔" ہاتھ باندھے وہ اک بار پھر سے گھگھیایا تھا۔

اور پھر چند لمحوں تک وہاں بڑی بھاری سی خاموشی چھائی رہی تھی۔

"حضرت! آپ تب تک علیل ہی رہیں گی. جب تک شجاع کا نکاح عتیقہ سے نہیں ہو جاتا۔ آپ

UrduBooks.pk

کی بیماری ہی ہمارا ہتھیار ہے اور آپ کی بیماری ہی وہ چیز ہے جو شجاع کو مجبور کر سکتی ہے۔ ان کے عشق کا بخار تو اب ہم اتاریں گے۔" دانت پیس کر کہتے ہوئے نواب صاحب وہاں سے چلے گئے تھے۔ اور وہ دونوں خواتین اک دوجے کا منہ تکتی رہ گئی تھیں۔ عتیقہ نواب صاحب کی بھانجی تھی۔

مہینوال ہونا مشکل نہیں ہوتا صاحب! سوہنی ہونا عذاب ہے۔"

☆☆☆

"آپا دیکھیے گا ذرا شجاع دروازے سے اٹھے کہ نہیں۔ بہت تکلیف میں تھے وہ۔ ہم خود کو بھی معاف نہیں کریں گے، ایک اس بات کے لیے ہماری وجہ سے ہمارے لعل کا اتنا دل دکھا۔" حضرت بہت دل گیر تھیں۔

"رہنے بھی دیجیے حضرت! اتنا بھی چھوٹا دل نہ ہو کسی کا۔ ارے آپ کے لعل اس کمہارن کو بیاہ لاتے تب ٹھیک تھا۔ خاندان کے نام کو بٹا لگا دیتے تب اچھا تھا؟ نوابی خون میں گند ملا دیتے تو صحیح تھا؟ جو کیا بڑے نواب نے بالکل ٹھیک کیا۔ ارے آپ کی بیماری ہی شجاع کو زیر کر سکتی ہے ورنہ تو اور کوئی دوا نہیں تھی عشق کا بخار اتارنے کی۔"

نظامی خاتون ہاتھ جھلا کر نخوت سے بولیں اور کیرے کی کھلی کھڑکی سے تازہ، ٹھنڈی، نم ہوا اندر آتی تھی اور پھر......

"پھر اس رات کے چمکتے چاند نے دیکھا۔ ٹم ٹم کرتے تاروں نے دیکھا۔ درختوں پہ جاگتے الوؤں نے دیکھا اور ہو ہو کر کے سارے عالم کو بھی جگا دینا چاہا، بتا دینا چاہا۔ جھینگروں نے شور کر کر کے آسمان اٹھا دینا چاہا مگر سارا عالم سوتا ہی رہ گیا۔ حویلی نیند میں ہی ڈوبی رہی اور اک گھڑ سوار ہوا کو مات دیتا۔ چناب پار اترنے چل دیا۔"

☆☆☆

چھٹے دن کی رات کے کسی پہر میں وہ سارگل کی حویلی کے باہر پہنچے تھے۔ حالت ابتر۔۔۔ تھکن بدن کو توڑتی ہوئی۔۔۔ پیاس سے ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی ہوئیں، سانس چڑھا ہوا پر وہاں پرواہ کسے تھی۔ چھلانگ مار کر وہ گھوڑے سے اترے اور اس کی پیٹھ پہ تھپکی دیتے ہوئے اسے درخت سے باندھا۔ وہ اب سر اٹھا کر اس حویلی کو تکتے تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی دم گزرے اور صبح ہو جائے۔

ایک گہرا سانس بھرتے ہوئے وہ بہاول پور کے نواب اِکلوتا وارث۔ اکلوتا جانشین وہ وہاں زمین پر، درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر، ٹانگیں پسار کر بیٹھا اور لگا ساعتیں گننے کہ کس دم صبح ہو اور وہ سبیل کر سکے۔ سارگل سے ملنے کی سبیل کر سکے اور اس رات کے چاند نے چمک کر اسے دیکھا۔ تاروں نے پلکیں جھپک جھپک کر دیکھا۔ ہوا نے تعجب سے بل کھا کر دیکھا، الوؤں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ جھینگر حیرت سے چیخ اٹھے کہ دیکھو دیکھو ایک نواب کیسے، کسی فقیر کی سی حالت میں زمین پر پھسکڑا مارے بیٹھا ہے۔ عشق نے اس کا تخت چھین لیا۔ اس کا تاج لے لیا اور اسے سلطنت بدر کر دیا۔

اور اندر اک دو منزلہ حویلی کے بالا خانے میں سارگل لالٹین کی بتی گل کیے ماتم کی سی حالت میں بیٹھی تھی کہ پرسوں شادی تھی اس کی۔ سر گھٹنوں میں دیے وہ اس قدر ساکت بیٹھی تھی کہ لگتا تھا مر گئی ہے۔ چاند نے چمک چمک کر اس کے وجود کو جھنجھوڑنا چاہا۔ تاروں نے جل بجھ کر اشارہ دینا چاہا۔ الوؤں نے ہو ہو کر کے اطلاع پہنچانا چاہی اور جھینگروں نے تو اپنا سر ہی پیٹ لیا مگر سارگل کو نہیں جاگنا تھا۔ نہیں جاگی۔ ہوا کو تاؤ آیا۔ بل کھا کر وہ اس کے ساکت وجود سے ٹکرائی۔ اس کی پشت پر بکھرے بالوں کو اڑایا اور کہا

"ارے او کم نصیب! ذرا کھڑکی سے جھانک تو سہی، دیکھ تو سہی کہ کیسے کوئی وقت کا رانجھا اپنے تخت کو لات مار کر ترے در کا فقیر بنا بیٹھا ہے۔ ارے اک نظر دیکھ تو سہی کہ اک اور فرہاد کیسی نہر کھود کر آیا ہے۔ دیکھ نا سارگل دیکھ۔۔۔"

UrduBooks.pk
Monthly Shuaa October 2018

پر سارگل اپنے ہی غم میں غلطاں۔ مری جاتی تھی۔ اسے سانس نہیں آتی تھی۔

☆☆☆

نہ جانے کب اور کیسے آنکھ لگ گئی تھی۔ کسی شور کی۔ آواز سے آنکھ کھلی تھی اور جب درخت کی اوٹ سے جھانکا تو ایک سوار کو دبے پاؤں گھوڑے کی لگام تھامے باہر نکلتے دیکھا تھا۔ آسمان کی طرف دیکھ کر وقت کا اندازہ لگانا چاہا۔ فجر بس ہوا ہی چاہتی تھی۔ اب کی بار حیرت سے اس سوار کو غور سے دیکھا اور جیسے ہی غور کیا، وہ برق کی مانند اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ دھوکا نہیں کھا سکتے تھے۔ وہ ایک نسوانی وجود تھا۔ چاہے لاکھ مردوں والے حلیہ میں خود کو چھپائے۔ مغالطے کی تو گنجائش ہی نہیں تھی۔

''سارگل!'' وہ تعجب سے زیر لب بولے۔ وہ اب گھوڑے پہ سوار ہو رہی تھی۔ برق رفتاری سے انھوں نے اپنا گھوڑا کھولا۔ سوار ہوئے اور اب وہ سارگل کے تعاقب میں تھے۔ چونکہ ان کا گھوڑا سفر سے تھکا ہوا تھا، اس لیے وہ اس سے دور مگر اسی کے پیچھے تھے۔

اور......

"چناب اک اور ملن کا گواہ ٹھہرا۔"

☆☆☆

دوسری طرف بہاول پور میں کیا ہوا تھا؟

یہ اس صبح کی بات ہے کہ جس کی رات میں شجاع گھر سے بھاگے تھے۔ ملازمہ ناشتہ دینے گئی۔ صاحب نے دروازہ نہ کھولا۔ وہ دروازہ پیٹنے کے بعد سر پیٹ کر آ گئی۔ دوپہر کے کھانے کا بھی وہی حال۔ خورشید سے بھی کہلوا کر دیکھ لیا۔ پر وہاں اثر کسے تھا۔ اک ہی خاموشی۔ خبر حضرت محل تک جا پہنچی۔ وہ یہ سن کر تڑپ ہی تو اٹھیں۔

"ہم خود دیکھتے ہیں۔۔۔" وہ بے قرار ہو کر اٹھیں۔

"رک جائیے حضرت!۔۔۔ ٹھہر جائیے۔ بڑے نواب صاحب غصہ ہوں گے۔" نظامی خاتون نے انھیں بازو سے تھام کر روکنا چاہا مگر انھوں نے جھٹکے سے بازو چھڑا لیا۔

"ہم نواب صاحب کا غصہ سہہ لیں گے آپا لیکن اپنے بچے کی تکلیف نہ سہہ پائیں گے۔" یہ کہہ کر وہ شجاع کے کمرے کی طرف چل دیں

"شجاع۔۔۔ شجاع ماں کی جان!۔۔۔ دروازہ کھولیے۔ دیکھیے ماں جان بلاتی ہیں۔ ہم خود اٹھ کر آئے ہیں۔۔۔" وہ دروازہ بجاتی تھیں اور ساتھ ساتھ کہے جاتی تھیں مگر جواب ندارد۔

مگر اندر تو ایسے خاموشی تھی کہ جیسے کوئی تھا ہی نہیں۔

"شجاع۔۔۔" اب کے دستک میں عجلت تھی اور اب کہ بھی جواب نہ آیا تو حضرت دل پہ ہاتھ رکھ کے پیچھے کو ہوئیں۔ وہ چند لمحے کسی بدترین خیال کے زیر اثر کھڑی رہیں اور پھر غرارہ سنبھال کر ملازموں کو بلانے دوڑی تھیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ ان کا شجاع ماں کی آواز سن کر بھی قفل نہ توڑتا۔

"خورشید! خورشید......" وہ گھبرا کر چلائی تھیں۔

''کمرے کا دروازہ تڑوائیے۔ وہ دروازہ نہیں کھول رہے میری آواز سن کے بھی نہیں کھول رہے۔ جائیے جلدی کیجیے۔ الٰہی خیر'' وہ دل پہ ہاتھ رکھ کر مڑیں۔ خورشید کلہاڑی لایا اور دروازہ توڑنے لگا۔ حضرت وہیں زمین پر بیٹھ کر رونے لگیں۔

خبر بڑے نواب صاحب تک بھی جا پہنچی، نظامی خاتون بھی بھاگی بھاگی آئی تھیں۔ وہ اب بے حال ہوتی حضرت کو سنبھالتی تھیں اور نواب صاحب گرجتے تھے۔

"جب صبح سے دروازہ نہیں کھولا تھا تو ہمیں اطلاع کیوں نہ کی؟" لات مار کر ٹوٹی لکڑی کو گرایا۔

"شجاع!" وہ یوں بولے کہ گلے میں خراش سی پڑ گئی تھی۔ وہ بولتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور......

سائیں سائیں کرتا کمرا۔ انھوں نے حیرانی سے ارد گرد دیکھا اور نظر سامنے جا پڑی تھی۔ وہ

Monthly Shuaa October 2018
UrduBooks.pk

ساکت رہ گئے اور حضرت محل۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی۔ شجاع کو پکارتی جب اندر داخل ہوئیں تو وہ بھی اسی طرح ساکت رہ گئی تھیں۔۔۔۔۔

کمرے کی واحد کھڑکی میں نصب لکڑی کی جالی ٹوٹی ہوئی تھی۔

☆☆☆

گھوڑی سے اتر کر اس نے پیٹھ تھپکی اور گھوڑی کسی معمول کی طرح گھاس چرنے چل دی۔ اس نے اک گہرا سانس بھرا اور نہ جانے کس آس، کس خیال کے تحت اس نے چناب پار دیکھا اور وہاں ٹھاٹھیں مارتا دریا تھا۔ شور مچاتی لہریں تھیں اور وہ لہریں اس سے ہم کلام ہوتی تھیں۔ اسے پکارتی تھیں اور کہتی تھیں

"آؤ نا سارگل! یہ نا آشنائی کیوں؟ کیا سوہنی نے چناب سے ناراض رہنا سیکھ لیا؟"

اور وہ ایک آہ بھر کر کہتی: "ہوتا ہے۔ یہ سب اب بھی ہے مگر دریا پار کوئی انتظار کرنے والا بھی تو ہو۔"

اور لہریں بلند ہو کر کان لگا کر اس کی بات کو سنتیں اور پھر تھس ہو کر گر پڑتیں اور کہتیں۔

جا سارگل تیرے مہینوال کو تجھ سے مہینوال جیسا عشق ہی نہیں چڑھا۔ جا چلی جا ہم کو یہ نا آشنائی ہی بھلی۔" اور پھر لہریں بل کھا کھا کر، مست ہو کر اٹھتیں، گرتیں مگر سارگل کی طرف رخ بھی نہ کرتیں۔ وہ کہتی۔

ابھی جب لہروں سے کلام انجام کو پہنچا اور وہ زخم خوردہ دل لے کر پلٹی تو آنکھ نے اک عجب منظر دیکھا

دور کوئی دھول اڑتی تھی۔۔۔ کوئی سوار سیدھا اسی کی جانب چلا آ رہا تھا اور سارگل پہلی بار گھبرائی۔

"اللہ جانے کون تھا اور وہ تن تنہا، سورما بنی پھرتی تھی۔ اس نے گھوڑی کو بلانا چاہا مگر۔"

"وہ کیا تھا الہام؟ اور اک؟ یا دل سے دل کی راہ۔ وہ نہیں جانتی وہ کیا تھا لیکن وہ ٹھہر گئی تھی۔

رک کر اس سمت تکنے لگی۔۔۔ وہ سوار لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتا جا رہا تھا اور پھر وہ اس قدر قریب آیا کہ اس کے نقش واضح ہونے لگے اور وہ کیسے نہ پہچانتی۔ وہ سانس تھا، لہو میں دوڑتا جذبہ تھا۔

"یا مالک!" وہ دل پر ہاتھ رکھ کر پیچھے کو ہٹی۔ اور اب سانس روکے اسے تکتی تھی۔

اس کے ہونٹ بھینچ گئے، ہاتھوں کی مٹھیاں سختی سے بند ہوئیں۔ اس نے آنسوؤں کو آنکھ میں روکے رکھا۔ گردن موڑ لی۔ جب دیکھنا چاہتی تھی سو جتن کرتی تھی اور اب جب کہ وہ سامنے تھا تو جی چاہتا تھا کہ نگاہ غلط بھی نہ ڈالے۔

"سارگل!" آواز میں صدیوں کی تھکن پوشیدہ تھی۔

"کیوں آئے ہو اب؟ کیوں؟" وہ رخ موڑے سوال کرتی تھی اور آنسو پھسل کر اس کے گال کو چومتے تھے۔

"ہمیں۔"

"جب میں نے چاہا کہ تم آجاؤ۔ تم نہیں آئے اور اب آئے ہو کہ جب؟" وہ جھٹکے سے مڑ کر شدت سے بولی اور نواب شجاع ہک دک۔

"یہ...... اقرار تھا کیا؟" گویائی جیسے سلب ہوئی تھی۔

"تماشا دیکھنے آئے ہو نا۔ یہ دیکھنے کہ سارگل مرتی کیسے ہے؟ تو کل دوپہر دین محمد کی حویلی آجانا لاٹ صاحب! اور دیکھ لینا سارگل کسی اور کی ہو کر مرتی کیسے ہے؟" اقرار گر جان لیوا تھا تو اس انکشاف نے تو مانو جان ہی کھینچ لی تھی۔ سارگل جانے کے لیے مڑی۔

"بات سنیے۔" وہ راہ میں حائل ہوئے۔

"خدارا جانے دو۔ منت کرتے ہیں" اور اس نے دونوں ہاتھ تھاہ کر کے جوڑ کر ماتھے پہ رکھے۔

"آپ کو جانا ہی تو ہے۔ ناچیز کو آپ سمجھتی ہی کیا ہیں۔ راہ کا پتھر؟ ٹھوکر سے اڑا دیا، حرف غلط؟ جو بن لکھے مٹا دیا۔ بہاول پور سے چھ دن کا سفر محض آپ کی خاطر طے کر کے آ رہے ہیں اور آپ ہیں

UrduBooks.pk

بات سننے کی بھی روادار نہیں۔"

سارگل نے تنک کر، بھسم کر دینے والی نظروں سے انھیں دیکھا۔

"میری خاطر تم تب کہاں تھے کہ جب......اور اس نے شدت سے مٹھیاں بھینچ کر ابلنے والے طیش کو روکنا چاہا۔ وہ چند لمحے اسی حالت میں رہی اور پھر مڑ کر گھوڑی کی جانب بڑھتے ہوئے اسے آواز دی۔

وہ بھاگتی ہوئی سارگل کی جانب آئی تھی

"سنیے۔ سنیے سارگل۔" پر وہ سنتی نہ تھی۔ اس نے رکاب میں پیر رکھا۔

"ہمیں بہاول پور دھوکے سے بلایا گیا تھا سارگل! اماں جان کی بیماری کا کہہ کر۔" اور وہ ساکت ہوئی۔ کسی بے روح وجود کی مانند۔ کوئی دیر گزری تو اس نے گردن موڑی، ذرا نظر بھر کر انھیں دیکھا

"تو ان کا دھوکا دینا کام دکھا گیا شجاع! کل نکاح ہے میرا۔"

وہ زین کو پکڑ کر سوار ہوئی۔ باگ کھینچی، رخ موڑا، رکاب میں رکھے پیر کو گھوڑی سے مس کرتے ہوئے چلنے کا عندیہ دیا۔ گھوڑی کے سم زمین پر نہ پڑتے تھے وہ شجاع کے وجود پر پڑتے تھے اور جسم کو، بدن کو ادھیڑتے تھے۔

وہاں کھڑا وجود اب وجود تھا کوئی؟ وہ تو مشت بھری خاک کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

☆☆☆

وہ گھوڑی سے اتری تو سانس دھونکنی کی مانند چلتا تھا۔ وہ برے حال میں تھی، یہ نظر آتا تھا۔ وہ کس عذاب میں تھی یہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ گرتی پڑتی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اوپر جا رہی تھی۔ سر سے چادر اتار کر وہیں پھینکی، منہ پہ لپٹا کپڑا کھینچ کر اتارا، جوتے کا ایک پیر پاؤں میں تھا، دوسرا نہ جانے کہاں گرا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی، وہاں روز کی طرح بے چینی سے ٹہلتی ہوئی حسینی تھی۔ اسے دیکھ کر معمول کی طرح کہنا چاہا۔

"گل بی بی! آپ کسی روز میری جا......" اور اسے گل بی بی کی جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ پٹ پہ ہاتھ رکھے دوہری ہوئی کھڑی تھی

"گل بی بی۔" اس نے دوڑ کر سارگل کو تھاما۔

"کیا ہوا۔ ہوا کیا سارگل بی بی!" اس نے ایک ہاتھ سے گل کو اندر کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے دروازہ بند کیا، اسے بستر پہ بٹھایا، صراحی سے پیالے میں پانی بھرا اور جب سارگل کے ہونٹوں سے لگایا تو اس نے ہاتھ مار کر پیالہ دور گرا دیا۔

"نہیں جینا مجھے۔ نہیں جینا۔" وہ چیخی۔ حسینی نے گھبرا کر ہاتھ اس کے منہ پہ رکھا۔ اس نے شدت سے حسینی کے ہاتھ ہٹائے اور اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر اپنے حلق پہ رکھے

"مار دو مجھے حسینی مار دو۔ تمہیں خدا کا واسطہ۔" اور اب کے اس نے ہاتھ حسینی کے سامنے جوڑے۔

"گل بی بی۔ گل بی بی۔" اور حسینی نے اسے پوری قوت سے جھنجھوڑا۔

"ہوش کریں۔ خدارا ہوش کریں۔ ہوا کیا ہے؟" اور گل ساکت ہوئی۔ بکھرے بال، پھیلا سرمہ۔ گیلے گال اور وہ ساکت تھی۔

"گل بی بی!" حسینی نے بے حد خوف سے اسے پکارا

اور پھر اچانک اس کے چہرے پر کچھ چمکا تھا۔ ایسی روشنی۔ مانو کہ چہرہ کسی بھیگی رات کے چاند سا چمکا تھا۔

"وہ آ گیا ہے حسینی! وہ آ گیا۔" اس نے جھک کر حسینی کے کان میں سرگوشی کی اور یک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور اٹھ کر چلا اٹھی

"وہ آ گیا۔ حسینی! آ گیا۔" اب کے اس نے کھلکھلا کر قہقہہ لگایا اور قہقہہ لگا کر، دونوں ہاتھ پھیلا کر گول گول گھومنے لگی۔

"وہ آ گیا۔ آ گیا۔" وہ رکی، جھک کر خوشی سے حسینی سے کہا اور پھر سے اک جوان قہقہہ لگایا تھا اور حسینی ہکا بکا، منہ کھول کر اسے تکتی تھی اور کمرے سے

UrduBooks.pk

اندر سے آتی تہقہے کی آواز پہ زیبن ٹھٹکی اور پھر اگلے ہی لمحے وہ سر جھٹکا کر مسکرا دی۔
"شکر ہے یہ لڑکی ہنسی تو سہی۔"

☆☆☆

بڑے نواب صاحب جب سکتے سے اس ٹوٹی جالی کو تکتے تھے تبھی اچانک خورشید کی نظر میز پر رکھے اس کاغذ پر پڑی تھی۔ اس نے لپک کر وہ کاغذ اٹھایا۔

"بڑے نواب صاحب!" اس نے آواز دے کر متوجہ کیا اور کاغذ ان کی طرف بڑھایا۔ نواب صاحب نے حیرت سے وہ رقعہ تھاما اور اسے پڑھنے لگے۔

"سلام عرض کرتے ہیں ابا حضور!
معذرت خواہ ہیں کہ یوں گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں مگر ہم اماں جان کو اس حال میں نہیں دیکھ سکتے۔ آپ کو ہو گا حکیم نذیر پر اعتبار۔ ہمیں نہیں ہے۔ اسی لیے ہم دہلی جا رہے ہیں۔ سنا ہے وہاں کوئی حکیم ہے جس کے ہاتھ میں ہر مرض کی شفاء اللہ نے دے رکھی ہے۔ ہم اسے لے کر ہی آئیں گے۔ تب تک کے لیے ماں جان کا خیال رکھیے گا اور یہ دعا کیجیے گا کہ ہم اس مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔

آپ کا پسر
نواب شجاع الملک۔"

"اوہ خدا! یہ کیا ہو گیا۔ کیا؟" نواب صاحب نے سخت تکلیف کی حالت میں پگڑی اتار کر میز پر رکھی اور خود کرسی پر ڈھے گئے۔

"الٰہی خیر۔ کیا ہوا نواب صاحب کیا ہوا؟ ہمیں بتایئے ورنہ ہمارا دل پھٹ جائے گا۔"

"آپ کے علاج کے واسطے حکیم کو لانے دہلی گئے ہیں۔"

"یا خدا!" اور حضرت دل پر ہاتھ رکھ کر پیچھے کو ہٹیں۔

کہتے ہیں کہ دھوکا لوٹ کر وہیں آتا ہے کہ جہاں سے وہ چلا تھا اور ان کے تو منہ پہ پڑا تھا۔

نواب شجاع پاگل تھوڑے ہی تھے جو یوں ہی گھر سے بھاگ لیتے۔ جانتے تھے کہ ابا حضور کس قدر کائیاں آدمی ہیں سو وہ پورا بندوبست کر کے نکلے تھے۔ چلو زیادہ دیر نہ سہی۔ اس طرح سے کچھ تو وقت ان کو مل ہی جاتا ورنہ انھوں نے تو کنوؤں میں بانس ڈلوا دینے تھے، ہر طرف گھوڑے دوڑا دینے تھے اور بہاول پور کے دربار گل سے سب سے پہلا نکلنے والا گھوڑا سیدھا گجرات جاتا۔ یہ تو طے تھا۔ تب پھر کوئی سار گل بچتی نہ ہی اس کا خاندان۔

☆☆☆

حسینی نے باہر کو دوڑ لگائی مگر جانے سے پہلے وہ کمرے کو باہر سے کنڈی لگانا نہیں بھولی تھی۔ اس نے باچھڑ کا سفوف نکالا جو کہ دین محمد نے کسی دور دراز علاقے سے منگوا رکھا تھا، اسے پانی میں گھولا اور پانی لے کر اوپر کو بھاگی تھی۔ جاتے ہی اس نے پانی گل کے منہ کو لگایا تھا۔ زبردستی اس کا منہ کھلوا کر جیسے کسی چھوٹے بچے کو دوائی پلائی جاتی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں وہ سفوف سکون آور دوا تھی۔ اس کے پینے کے کچھ دیر بعد ہی سار گل غنودگی میں چلی گئی تھی اور اب بھی اس کے لب بنا آواز ہلتے تھے

"وہ آ گیا۔ وہ آ گیا۔" اور حسینی کا دم اس جملے کے ساتھ نکل نکل جاتا تھا۔

"یا مالک وہ کیوں آ گیا؟" اور حسینی بے حد فکر سے سوچتی تھی۔

اور دربار گل میں یوں خاموشی چھائی تھی جیسے کوئی مرگ ہو گیا ہو۔

☆☆☆

وہ چاند کی چودھویں رات تھی اور سخت تھی اور سار گل گہری نیند میں تھی۔ کمرے کی کھلی کھڑکی سے ہوا آتی تھی اور چہرے پر تھپکی دے دے کر جگاتی تھی اور کہتی "اٹھو نا سار گل۔ اٹھو نا۔ دیکھو تو سہی تمہارا شجاع کس طرح بے یار و مددگار اک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے تمہیں بلاتا ہے۔"

اٹھ جاؤ شہزادی سار گل! ورنہ عاشق جان سے

جائے گا اور شہزادی بے خبر سوتی تھی کہ اچانک وہ سوئے سوئے بڑبڑائی۔

"وہ آگیا۔ آگیا۔ آگیا۔" اور پھر اپنی ہی آواز کانوں میں پڑنے سے وہ یکدم اٹھی تھی۔ چند لمحے ناسمجھی سے، ساکت ہو کر چھت کو تکتی رہی۔

کمرے میں مدھم لالٹین کی روشنی تھی جو کھڑکی سے آتی ہوا سے پھڑپھڑا جاتی تھی۔ حسینی زمین پر، اس کے پلنگ کے پاس بستر ڈالے سوئی پڑی تھی۔ اس کی آنکھ نم ہوئی۔ اس نے ہونٹ بھینچے، مٹھیاں کس لیں پر آنسو۔ وہ نہیں رکتے وہ کسی آتش فشاں کی مانند ابل ابل پڑتے تھے۔

"آہ...... آہ سارگل۔ کیسے بدلتی تمہاری قسمت۔ تمہارے ہاتھ میں نسل در نسل سفر کرتا سوہنی جیسا ہنر ہی نہیں آیا۔ ساتھ میں نصیب بھی آیا ہے۔"

وہ ہچکیاں بھر بھر روتی تھی، سسکیاں بین کرتی تھیں پر سارگل سوہنی نہیں بن سکتی تھی کہ ابا کی عزت کا بھاری ٹھڑ سر پہ اٹھا رکھتی تھی۔ کیسے...... کیسے کرے وہ اپنے باپ کا شملہ نیچے؟ کیسے۔

اور پھر وہ اس قدر شدت سے روئی کہ سانس اٹکنے لگا۔ دوہری ہوتے ہوئے وہ کھڑکی تک گئی۔ اسے ہوا چاہیے تھی تازہ ہوا۔ سانس لینے کے واسطے......اور جب نظر سامنے پڑی تو آنسو ٹھٹھر گئے اور وہ بے خودی کے عالم میں اسے تکتی رہ گئی۔ چاندنی روشنی میں نہایا۔ افسردہ پر ملال، غم میں ڈوبا چہرہ۔ تنے سے ٹیک لگائے سر جھکائے بیٹھا تھا یوں جیسے انتظار میں یہیں مر جائے گا۔

"اوہ خدایا!" سارگل ہونٹوں پہ ہاتھ رکھے ساکت تھی۔ پھیلا کاجل، تر گال، بکھری لٹیں جنہیں ہوا بڑے ناز سے اڑاتی تھی اور وہ چاندنی میں نہایا، ٹھٹھرا وجود۔

شجاع نے کسی انجانے سے، انہونے سے خیال کے تحت سر اٹھایا اور...... وہ بے ساختہ بیٹھے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور منہ اٹھائے اس کھڑکی میں ساکت کھڑے وجود کو تکتے۔

"بی بی!" حسینی نے پیچھے سے اسے ہلایا اور اس نے یک دم پلٹ کر پشت دیوار سے ٹکرائی۔ مٹھیاں بھینچے، دیوار سے رگڑ کھاتے ہوئے وہ نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ حسینی نے کھڑکی سے جھانکا اور وہ دل پہ ہاتھ رکھ کر بے اختیار دو قدم پیچھے کو ہوئی تھی اور پھر اس نے مڑ کر گل کو دیکھا۔

وہ سر پکڑے بیٹھی تھی۔

"بی بی!" حسینی پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھی اور ترحم سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"اسے کہو یہاں سے چلا جائے۔ خدارا اس سے کہو کہ یہاں سے چلا جائے ورنہ......" اس نے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ ہونٹ زور سے میچے۔

"ورنہ کیا بی بی؟" حسینی سراسیمہ ہو کر پوچھ رہی تھی۔

"یہ...... یہ دیکھو۔" اس نے آستین کھینچ کر بازو ننگا کیا۔

"ان رگوں میں دوڑتے خون کو دیکھو حسینی! یہ خون...... یہ خون......" اس نے دو انگلیاں اپنے بازو پر ماریں۔ "یہ رگوں میں دوڑتا خون مجھے مجبور کر دے گا حسینی! اسی کی نسل سے جو ہوئی۔ پھر میرے یہ ہاتھ۔ یہ ہاتھ گھڑا لے کر چناب میں جا اتریں گے۔" اس نے ہاتھوں کو اونچا کر کے دکھایا۔

"اور پھر انور کی کوئی بہن......"

"گل بی بی!" حسینی نے تڑپ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھا تھا۔

"میں ایسا گناہ نہیں کرنا چاہتی حسینی پر یہ خون۔" اس نے بے بسی سے بازو زمین پر مارا۔ پھر دیوار سے ٹکرایا۔

"انھیں...... انھیں گل بی بی! حسینی اسے یہاں سے بھیج دے گی چاہے اس کے لیے کتنی ہی قیمت کیوں نہ بھرنی پڑے۔ آج کی صبح آپ کی بارات ہے اور آپ کو انور بھائی کی ہی دلہن بننا ہے، چاہے خون جتنا بھی جوش مار لے۔ حسینی آپ کو کچھ غلط نہیں کرنے دے گی کیونکہ حسینی دین محمد صاحب کی تھالی

UrduBooks.pk

میں سے کھاتی ہے۔"

وہ اسے کندھوں سے تھام کر اٹھاتی تھی اور سارگل کا دل انور کے نام پر ڈوب گیا تھا۔ اور باہر اس کھڑکی سے دو آنکھیں جیسے چپک سی گئی تھیں۔

☆☆☆

وہ صبح بہت بھاری تھی۔ ساری رات وہ قطرہ قطرہ مرتی رہی۔ لاش میں بدلتی رہی پر ہوا کچھ بھی نہیں اور معمول کی طرح سورج نکلنے کو تھا۔ تارے اک اک کر کے بجھنے لگے اور سارگل کے اندر آگ بھڑکنے لگی۔ کوئی دم گزرتا تو سورج نکل آتا اور پھر...... پھر دن چڑھ آتا اور اس کے ساتھ ہی سارگل ایک لمبا سانس بھر کر لیٹے سے اٹھ بیٹھی۔

"نہیں۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کے بال جکڑے۔ نہیں یہ دن نہیں چڑھنا چاہیے۔ اسے روکنا تھا کسی طرح سے اس دن کو چڑھنے سے روکنا تھا۔ وہ بستر پہ بیٹھی، سر کے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے جکڑے آگے پیچھے کو ہل رہی تھی اور......

اور پھر......

وہ دن کو چڑھنے سے روک نہیں سکتی تھی۔ وہ انور کو بارات لانے سے بھی روک نہیں سکتی تھی۔ وہ جو کر سکتی تھی وہ وہی کرنے جا رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑکی تک آئی۔ وہ وہیں تھا۔ کسی اجڑے فقیر کی مانند، ٹانگیں پسارے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا، گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ شاید سو گیا تھا۔ وہ چند لمحے تکلیف سے تکتی رہی اور پھر مڑ کر اس قدر احتیاط سے دروازہ کھولا کہ حسینی کی کچی نیند بھی نہیں ٹوٹی تھی۔

اس کا رخ اصطبل کی طرف تھا۔

☆☆☆

چہرے پر ڈھاٹا لپیٹتے ہوئے وہ اصطبل میں داخل ہوئی۔ ملازم آگے بڑھے۔ اس نے دو انگلیوں سے جانے کا اشارہ کیا۔ گھوڑی کو پچکارا، زین کسی۔ پھاٹک کھولنے کا اشارہ کیا گیا اور......

شجاع کی آنکھ ٹاپوں کی آواز سے کھلی تھی۔ وہ حیرانی سے اس اٹھتی خاک کو تکتے تھے۔ آج تو نکاح تھا اس کا۔ ایسے میں وہ کہاں جا رہی تھی؟

دور جاتا وہ گھڑ سوار۔ اڑتی خاک۔ سے لمحہ بالمحہ پگھلتا ہوا۔ دل جیسے ڈوب ڈوب کر ابھرتا تھا جان جیسے رخصت مانگتی تھی۔ وہ کبھی ان کی نہیں ہو سکتی تھی؟ کیا کبھی نہیں؟ ہاتھوں کی مٹھیاں بے اختیار بھینچ گئیں۔ سختی سے جڑے ہونٹ لرزتے سے تھے۔ چہرہ یوں سفید ہوا کہ جیسے سارا خون نچڑ گیا تھا۔

"یا رب! ہونی کو صرف تو ہی ٹال سکتا ہے اور اسے ٹال دے خدایا۔"

آہ جیسے عرش کے بند کواڑ ہلا ڈالنا چاہتی تھی۔ وہ اک لمحہ تھا۔ ایسا اک لمحہ جس میں آپ انتر جشتھان کی نفی نہیں کر سکتے۔ آپ اس پر عمل کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

تو بس ٹھیک اس سے شجاع کے اندر سے آواز اٹھی تھی۔

"اپنا گھوڑا کھولو اور اس کو جالو۔"

اور پھر انھوں نے اسے جالیا۔

اور ان کا انتر جشتھان غلط نہیں تھا یہ سامنے کا منظر بتلاتا تھا۔

☆☆☆

کچی نیند کب پکی میں بدلی۔ اسے معلوم ہی نہیں ہو سکا تھا۔ رات کو جو ہوا، اس نے حسینی کے اعصاب کو تھکا ڈالا تھا۔ آنکھ تو تب کھلی جب دروازہ پیٹا گیا۔ حسینی ہڑبڑا کر اٹھی۔ اور حواس سنبھالتے ہی پلنگ پر نظر ڈالی اور وہ سن رہ گئی تھی۔ "گل بی بی!" لب بن آواز کے ہلے۔ اتنے میں پھر دروازہ پیٹا گیا۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر دروازہ کی جانب دیکھا اور پھر پلنگ کو۔ مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق اٹھی اور اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے زیبن تھی۔

"ارے حسینی! غضب خدا کا۔ دن چڑھ آیا۔ دھوپ منڈیروں تک آن چڑھی، مرغے کب کے بانگیں دے چکے اور تم ہو کہ گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہی ہو۔ معلوم بھی ہے کہ کتنا کام ہے آج اور یہ سارگل کدھر ہے؟" زیبن بولتی ہی جا رہی تھی کہ

UrduBooks.UK

اچانک پلنگ پر نظر پڑی تو حیرت سے پلنگ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"باغ کی سیر کو گئی ہوں گی۔ میں دیکھتی ہوں۔" حسینی گھبرا کر بولی۔

اور کوئی دوسرا موقع دیے بنا باہر کو بھاگی۔

زیبن تعجب سے اسے تکتی رہ گئی۔"اس لڑکی کو بھی چین نہیں۔ گھر میں نکلنا تو آیا ہی نہیں۔ بھلا پوچھو اپنی شادی کے دن کسے سیریں سوجھتی ہیں۔"

بڑبڑاتے ہوئے وہ اب اس کا بستر ٹھیک کر رہی تھی۔

☆☆☆

دھک دھک کرتے دل کے ساتھ وہ باغ کی طرف گئی۔ اسے دھڑکا لاحق تھا کہ بی بی چناب کو ہی گئی ہیں۔ وہ تیز تیز چلتی جب بائیں باغ کی طرف آئی تو وہاں بس مالی تھا جو پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ حسینی بے دم ہوئی۔ چند گہرے سانس لیے اور اصطبل کی طرف پلٹ گئی۔

اور اس کا دل غلط نہیں کہتا تھا۔ بی بی چناب یاترا کو ہی گئی تھی۔

"کیوں جانے دیا؟" وہ پریشانی سے پھٹ پڑی

"ہم بی بی کو روکتے؟" ملازم نے انتہائی حیرت سے اپنی طرف انگلی کر کے پوچھا۔

اور حسینی سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

"بی بی کیوں میری جان کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ کیوں؟" اور وہ اپنا ماتھا پیٹتی تھی۔

☆☆☆

"چناب بہت بپھرا ہوا تھا۔ یوں لگتا کہ آج سب بہا لے جائے گا"

اور وہ منظر جان لیوا تھا۔

دریا کنارے ساکت وجود اسے تکتا تھا۔ سانس باقی تھی یا نہیں اس دم پتا نہیں چلتا تھا۔ پیچھے سے ٹاپوں کی آواز ابھری تو بھی اس وجود نے حرکت نہیں کی۔

"سارگل!" آنے والے نے پوری شدت سے پکارا اور جواب نہ پا کر اسے جھنجھوڑنا چاہا مگر......

"سارگل......" اس بار آواز میں ٹوٹے دل کی پکار بھی شامل تھی۔

☆☆☆

دربار محل میں ہر روز، ہر یوم سوگ کا ہوتا تھا۔ حضرت محل کی آنکھ سوکھتی نہ تھی۔ اپنا سینہ پیٹتی تھیں اور رو رو کر کہتی تھیں

"ہائے شجاع! ارے تمہیں کیوں ہائے پڑے ہائے تو ہمیں پڑے۔ کم بختی ہماری، کم نصیبی ارے دیکھو تو سہی، ایک ماں نے اپنے لال کے ساتھ آخر کیا کیا۔"

نواب صاحب کے کاندھے جھک چلے۔ بڑھاپا چند دنوں میں ان پر آیا تھا۔ کوئی خاموشی سی تھی جو ہر وقت دربار محل میں چھکتی بھرتی تھی۔ نواب صاحب شجاع کے خط پر تکیہ کر کے نہیں بیٹھے رہے تھے۔ انھوں نے اسی دن تازہ دم سوار دہلی روانہ کر دیے تھے اور کہا تھا۔

"شجاع کو لے کر آنا ورنہ شکل نہ دکھانا۔" وہ ہر پڑاؤ پر رکتے، شجاع کا حلیہ بتاتے اور پوچھتے ایسا کوئی جوان گزرا یہاں سے کیا؟ اور ہر ہر پڑاؤ جواب منفی میں تھا۔ اردگرد کی بستیوں میں سے بھی چھان بین کی گئی پھر ہر پڑاؤ کی تفتیش کا احوال لکھ کر نواب صاحب کو بھیجا جاتا اور انھیں پہلا خط ملا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ ہر ممکن چھان بین کے بعد بھی یہاں اور قرب و جوار میں چھوٹے نواب صاحب جیسا جوان کسی نے نہیں دیکھا۔ اور یہ یہیں پر نواب صاحب ٹھٹکے تھے۔ سب سے پہلا پڑاؤ پھولرا یا پھلرا تھا۔ یہ مختصر راستہ تھا اور نواب شجاع کو یہیں پر سے گزرنا چاہیے تھا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ کسی نے بھی انھیں نہ دیکھا ہو۔ وہ بنا رکے کیسے سفر کر سکتے تھے۔ اور اب انھیں دوسرے خط کا انتظار تھا اور اسی کے بعد ہی وہ کوئی رائے قائم کر سکتے تھے۔

"اور شک کا کانٹا گڑ چکا تھا"

☆☆☆

وہ سار گل کے بے جان وجود کو تک رہے تھے۔ وہ جو ماں باپ کی عزت سنبھالتے دل ہار گئی تھی۔ اس کا دل بھی بند ہو گیا تھا۔ سار گل کی گھوڑی ہنہناتی اور زمین پر سم مار مار کر بے بسی کا اظہار کرتی تھی۔ غضب ڈھاتا دریا تھا۔ اونچی اٹھتی لہریں تھیں۔ اس بار پنجاب کی سوہنی نے کچے گھڑے کو دریا میں نہیں ڈالا تھا۔

یہ سوہنی چناب کی نذر نہیں ہوئی تھی۔

اس نے اپنے خون سے بغاوت کی تھی۔ اپنے ماں باپ کی عزت سنبھالنے کے لیے۔

اور وہاں گجرات کی ایک حویلی میں حسینی بے جان وجود کے ساتھ سر پر خاک ڈالے بیٹھی تھی۔

"آجاؤ بی بی آجاؤ! اللہ کا واسطہ آجاؤ۔ کیوں جان کے درپے ہو۔" اور اسے سانس نہیں آتا تھا۔ پھاٹک پر جمی آنکھیں، پتھرایا ہوا وجود، سر پر ہاتھ رکھے اس کا روم روم "آجاؤ گل بی بی آجاؤ" کا ورد کرتا تھا۔

اور اندر حویلی میں حسینی نام کی ڈھنڈیا مچی ہوئی تھی۔ زبین کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ ملے اور فوراً سے پہلے اسے کچا چبا جائے، ذبح ہی کر ڈالے۔

وہاں شجاع کے بازو سوہنی کو سنبھالے جھکنے لگے اور یہاں حسینی کی آنکھیں۔

"سار گل او سار گل تم کہاں ہو؟"

☆☆☆

اور پھر......

اصطبل کے پھاٹک کے باہر گھوڑی کے ہنہنانے کی آواز آئی۔ حسینی نے سر سے ہاتھ ہٹا کر پھاٹک کی طرف دیکھا اور پھر۔

"کھولو۔ جلدی کھولو۔" وہ چیخی تھی۔ ملازم نے بھاگ کر دروازہ کھولا اور......

وہاں گھوڑی کی پیٹھ پر کوئی سوار نہ تھا۔ وہ اکیلی آئی تھی اپنے مالک کو ساتھ نہ لائی تھی اور یوں اندر داخل ہوئی کہ جیسے آزردہ ہو۔ حسینی نے دہشت زدہ ہو کر اسے تکا۔ وہ چند لمحے اسے تکتی رہی اور پھر تیزی سے اس کے پاس آئی تھی۔

"رانی۔ او رانی بتا نا گل بی بی کہاں ہیں۔ تجھے اللہ کا واسطہ دیکھ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ بتا دے وہ کہاں ہیں؟" اور حسینی نے سچ میں روتے ہوئے اس کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔ اور ابھی جب حسینی بلک بلک کر گھوڑی سے سار گل کا پوچھتی تھی تو......

اچانک ہی ٹاپوں کی آواز بلند ہوئی تھی۔ حسینی کے آنسو ٹھہرے۔ وہ ساکت ہوئی، ٹھہری گئی۔ یوں جیسے جانتی ہو، وہ کون ہو سکتا تھا۔ وہ اتنی صدماتی کیفیت کا شکار تھی کہ گھوڑی کے سامنے ہاتھ ابھی تک یوں ہی باندھے کھڑی تھی اور اسی کیفیت میں اس نے مڑ کر دیکھا اور جب مڑ کر دیکھا تو......

☆☆☆

دوسرا خط موصول ہوا تو اس کا متن بھی پہلے خط جیسا تھا۔ اور شک کا کانٹا اور گہرا ہوا۔ کیا شجاع دہلی ہی گئے تھے؟ گر وہیں ہی گئے تھے تو کوئی تو شہادت ملنی چاہیے تھی نا؟ اب جب ایسی کوئی شہادت مل نہیں رہی تھی تو کیا بیٹھ کر ان کا انتظار کیا جائے؟

"نہیں۔" وہ مصمم ارادے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"دہلی سے گجرات نزدیک تھا۔"

اور جب چھ سات دن کے سفر کے بعد نواب

وقارالملک کا بھیجا ہوا سوار گجرات پہنچا تو اس نے نواب شجاع کا پتا پالیا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ چناب کنارے ان کا ٹھکانا تھا اور جب وہ چناب کنارے پہنچا اور پہنچ کر جو منظر اس نے دیکھا اس نے اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہنے دیا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گرا تھا۔ وہ نواب شجاع تو نہ تھے، وہ چیتھڑوں میں لپٹا، کاندھے تک آتی لٹوں والا، بے طرح سے بڑھی داڑھی والا جوان کوئی اور تھا۔ اس کے پیروں میں جوتا تک نہ تھا اور وہ وہاں۔" چناب کنارے بھینسیں چراتا تھا۔"

☆☆☆

اور جب حسینی نے مڑ کر دیکھا تو......

شجاع کے گھوڑے پر سارگل کسی خزاں کی ڈال کی مانند لٹکی پڑی تھی۔

شجاع نیچے اترے۔ اس کا وجود ہاتھوں میں اٹھایا اور ٹوٹی کمزوری آواز میں کہا۔ "ردہ"۔

ملازم مڑ گئے اور انھوں نے سارگل کا بے جان وجود حسینی کے پاس زمین پر لا رکھا۔ حسینی پھٹی پھٹی آنکھوں سے بی بی کو تکتی تھی

"حسینی! میں محبت ہار آیا اور میری ہار کی سزا زندگی مجھے اپنے ہاتھوں سے دے گی۔"

حسینی نے منہ اٹھا کر انھیں دیکھا اور جان لیا کہ وہ محبت نہیں زندگی ہی ہار آئے تھے۔ وہ کھڑے قد سے گری۔ چند لمحے تیز تیز سانس لیتی وہ سارگل کے وجود کو تکتی رہی اور پھر۔

"ہائے بی بی گل۔" اس کے منہ سے آہ چیخ کی مانند برآمد ہوئی اور وہ اپنا منہ، سینہ پیٹ رہی تھی۔

اور خبر کو آگ بننے کے لیے کاہے کی دیر؟

☆☆☆

سال 2018

اسلام آباد کے نئے ائیر پورٹ کا افتتاح ہو چکا تھا۔ بین الاقوامی پروازوں کے لیے ہوائی اڈہ کھول دیا گیا تھا۔ وہ لندن سے اپنی تعلیم مکمل کر کے آرہا تھا۔ اس کو لینے کے لیے ایک بلٹ پروف گاڑی کے ساتھ ساتھ ایک پولیس موبائل بھی تھی۔ وہ مخدوم سلمان وارث کا چشم و چراغ تھا۔ کوئی چھوٹی بات تھی۔ جیسے ہی اس نے وی آئی پی لاؤنج میں قدم رکھا تو اس کی توجہ سرامکس کے ایک مرتبان نے کھینچ لی تھی۔ وہ مرتبان آرٹ کا شاہکار تھا اور اس پر نیلے رنگ کے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ وہ ہونٹ سکیڑ کر اس مرتبان تک آیا، چند لمحے تکتا رہا اور دوسرے ہی لمحے حکم جاری ہو چکا تھا کہ معلوم کیا جائے یہ مرتبان کہاں سے اور کس سے بنوایا گیا ہے۔ اور اس کام میں دیر نہ لگی تھی۔ وہ مرتبان فرازین نے بنایا تھا اور اب فرازین کون؟

کالری گیٹ گجرات کی سڑک پر واقع وہ ایک چھوٹی سی دکان تھی جس کا انٹریئر دیکھنے لائق تھا۔ دکان میں سجے سرامکس کے برتن انتہائی دیدہ زیب تھے اور جب گلاس ڈور دھکیل کر اندر آؤ تو دھیمی روشنیوں کا خنک ماحول استقبال کرتا ہے۔ باہر کی تیز روشنی سے اندر جب آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوتی ہیں تو وہ اونچی کرسی پر بیٹھی اپنے آفس میں لیپ ٹاپ پر جھکی مصروف نظر آتی ہے۔ نہ صرف پاکستان میں بلکہ وہ آن لائن سیل کی مدد سے دوسرے ممالک میں بھی اپنے نمونے بھیجتی ہے۔ اور وہ "فرازین سجاد" ہے کہ جس نے این۔سی۔اے سے سرامکس ڈیزائننگ میں ڈگری حاصل کر رکھی ہے۔ اس کے باپ کا چینی کے برتن بنانے کا کارخانہ ہے۔

اور ابھی جب فرازین سجاد اپنے لیپ ٹاپ پر جھکی مصروف ہے تو ایک آرڈر بک کروایا جاتا ہے اور وہ آرڈر بک کروانے والا مخدوم طیب سلمان وارث کے علاوہ اور بھلا کون ہو سکتا تھا۔

قصہ وہ کہ جس کا موچنگ کل بھی بجتا تھا اور آج بھی...... تو جب جب تار ملتے ہیں، سر بکھرتے ہیں، وجود رقص کرتے ہیں اور موچنگ بجتا ہے تو بجتا ہی چلا جاتا ہے۔

☆

ثمرہ بخاری

حاصل لاحاصل

ناولٹ

urdubooks.pk

"اے ہے بھابھی! یہ اتنی کالی چائے پلاؤ گی اماں جان کو۔"

انجم کے ہاتھ میں پکڑی چائے کی پیالی کچھ لرز سی گئی۔ ساس کی جانب دیکھا، شاید وہ بیٹی کو بتادیں کہ زیادہ دودھ والی چائے انہیں پسند نہیں۔ خود کہہ کر زیادہ پتی اور کم دودھ والی چائے بنوائی ہیں مگر وہ چہرے پر ہزار مظلومیت طاری کیے بیٹھی رہیں۔ انجم کو اپنی نند سے کچھ کہنے کی جرأت نہیں تھی اور یہ بھی علم تھا اس کے کہے کا اعتبار کب کریں گی۔ انجم خاموشی سے چائے ساس کو تھما کر ہٹ گئی۔

"ہماری بات کا تو جواب دینا بھی پسند نہیں۔"

جاتے جاتے یہ جملہ ضرور سن لیا۔

"امی! امی۔ مجھے چاول کھانے ہیں۔" نفیسہ کا بیٹا کامران، ماموں کے گھر آتے ہی فرمائشی پروگرام نشر کرنے لگتا تھا۔

"اے تو مجھے کیا کہہ رہے ہو، کہو جا کر اپنی ممانی سے پکا کر دیں تمہیں چاول۔"

"امی! ممانی تو مٹر قیمہ پکا رہی ہیں۔" رشنا نے بتایا۔

"تو کیا ہوا۔ ساتھ میں چاول بھی پکا لے گی، اب یہ بھی کوئی بات ہے، بچہ ماموں کے ہاں آئے اور پسند کا کھانا بھی نہ ملے۔"

"کامران بیٹے! جاؤ کہو ممانی سے، پکا دے گی چاول۔" نانی نے چائے کا کپ لبوں سے الگ کر کے چمکارا۔

"پھوپھو! کامران بھائی نے میری بال لے لی ہے۔" نبیل رونے کو ہو رہا تھا۔

"تو کیا ہوا۔ کھیل کر واپس کر دے گا، یوں ذرا ذرا سی بات کی شکایت نہ لگایا کرو۔ توبہ ہے اماں! بچے بھی بالکل انجم پر پڑے ہیں۔ ہمارا آنا انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔"

"اب دفع بھی ہو جا، کھڑا کیا دیکھ رہا ہے۔" دادی نے نبیل کو ڈانٹا اور بولیں۔

"نفیسہ! تم جی میلا نہ کرو۔ یہ میرا گھر ہے، ان کی مجال ہے کہ تمہیں یا تمہارے بچوں کو کچھ کہہ سکیں۔"

"بھابھی کا تو منہ بن جاتا ہے مجھے اور آصفہ کو اپنے ہاں دیکھ کر۔"

"اس کی تو شکل ہی ایسی ہے، تم دل پر نہ لو۔" نفیسہ پاؤں پسار کر وہیں لیٹ گئی۔

دوپہر کا کھانا تیار کر کے انجم نے نفیسہ اور اپنی ساس کو بلایا تو انہوں نے پوچھا۔

"بہو! اماں بیٹا گھر آ گیا ہے یا نہیں؟"

"ان کا فون آیا تھا، کہہ رہے تھے۔ آفس میں کام زیادہ ہے، دیر ہو جائے گی۔"

"تم نے ہماری بات کیوں نہیں کروائی اور یہ بھی نہیں بتایا ہوگا کہ نفیسہ آئی ہوئی ہے۔"

"اماں! وہ جلدی میں تھے، بس بات کی اور فون نہیں بتایا ہوگا کہ نفیسہ آئی ہوئی ہے۔"

"اماں! وہ جلدی میں تھے۔ بس بات کی اور فون بند کر دیا۔"

"اور جو جلدی میں نہ ہوتا تو تم تو جیسے ضرور ہی بتا دیتیں، ہے نا۔"

"بھابھی! ہمیں تو کھانا یہیں لا دو۔ اب کہاں اٹھ کر کھانے کے کمرے تک جاؤں۔ میری تو کمر میں پہلے ہی بڑا درد ہے۔"

انجم سارا دن کی تھکی ہوئی مگر بول کچھ نہیں سکتی تھی۔ اثبات میں سر ہلا کر چلی گئی۔ دونوں ماں بیٹیوں کے لیے کھانا وہیں لگایا اور خود کھانے کی ٹیبل پر اس کے بدتمیز کو ہی سنبھالتی۔ رہی نبیل تو گھبرا کر ایک کونے میں دبک گیا تھا۔

☆☆☆

نفیسہ شام تک ادھر ہی رہی۔ میاں لینے آئے تو ان کے ساتھ روانہ ہوئی۔ جاتے جاتے کہہ گئی۔ اماں اگلے جمعہ کو آؤں گی۔ آصفہ کو بھی بلوا لیجیے گا۔ سسرال میں وہ ملنے آتی ہے تو میں ہزار کاموں میں الجھی ہوتی ہوں اور پھر میری ساس نند بھی میکے سے کسی کی آمد کو پسند نہیں کرتیں۔ میاں نے اس بات

UrduBooks.pk

پر گھور کر دیکھا مگر وہ انجان بن گئی۔

راستہ بھر ہی دکھڑے روتی رہی۔ ''میکے جا کر بھی آرام نہیں۔ بھابھی بیگم دیکھتے ہی منہ بنا لیتی ہیں۔ وہاں جا کر بھی سارے کام خود کرنا پڑتے ہیں۔''

بچے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے آپس میں باتوں میں مشغول تھے، کبھی کبھار ماں باپ کی گفتگو بھی سن لیتے۔ ویسے زیادہ توجہ آپس کی باتوں کی جانب تھی۔

گھر آئے تو بیاہی نند اپنے میاں کے ساتھ آئی بیٹھی تھی۔ روکھے پھیکے انداز میں ملی اور ساتھ ہی سر درد کا بہانا بنا کر کمرے میں آ گئی۔

''نفیسہ! تم کچھ دیر تو بیٹھ جاتیں۔ طیبہ پہلی بار شوہر کے ہمراہ ہمارے گھر آئی ہے۔''

''ہاں۔ اماں بہنوں کا خیال ہے اور میں مر بھی جاؤں تو نہیں پوچھیں گے۔'' آواز خاصی اونچی اور دردناک تھی۔

وہ گھبرا گئے، سمجھانے لگے۔

''اس وقت تو چپ ہو جاؤ طیبہ اور نعیم کیا سوچیں گے۔''

''ہاں ہاں، آپ تو چاہتے ہیں میں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاؤں۔ کہہ کر آئی ہوں اماں سے، اگر کسی روز میرے جل مرنے کی خبر آئے تو اسے اتفاقی حادثہ مت سمجھیے گا۔ ان کے خاندان کی خدمتیں کرتے کرتے بستر سے آ لگی ہوں مگر میرا کوئی احساس نہیں بس یہ فکر ہے۔ بہنوئی نہ سن لے، میرا بہنوئی بھی تو آتا ہے اس گھر میں۔ اس کی کتنی قدر ہوتی ہے میری بہن کے پاس تو کبھی آپ کی ماں بہنیں آ کر نہیں بیٹھیں مگر میرے لیے حکم ہے ہر ایک کی خدمت میں حاضری دوں، ہاتھ جوڑ کر سلام کروں۔''

''امی امی چپ کریں ناں۔ نعیم انکل ساری باتیں سن رہے ہیں۔'' بڑا عمران شرمندہ ہو کر کہہ رہا تھا۔

''جاؤ، دفع ہو جاؤ، کبھی ماں کی حمایت نہ کرنا۔ کرو گے بھی کیوں، آخر ہے تو یہی خاندان، نہ باپ کو میری فکر ہے نہ تم لوگ احساس کرو گے۔''

''اچھا اب میں کچھ نہیں کہتا۔ تم آرام کرو۔''

وہ مزید ہنگامہ آرائی سے بچنے کے لیے باہر نکل گئے۔

''کیا ہوا؟ بھابھی جان بڑے خوش گوار موڈ میں تھیں۔'' نعیم نے ہنس کر چھیڑا۔

''اصل میں میکے سے آئی ہے ادھر بھابھی تک چڑھی ہے۔ نفیسہ جاتی ہے تو وہاں سارا کام اسے کرنا پڑتا ہے۔ تھک گئی ہے اس لیے بھابھی کا غصہ بھی مجھ پر اتار رہی ہے۔''

''مگر انجم تو بڑی اچھی طبیعت کی مالک ہے۔''

اماں جان حیرت سے گویا ہوئیں پھر نظر بیٹے پر پڑی۔ وہ اشارے سے مزید کچھ کہنے سے منع کر رہا تھا۔ سمجھ گئیں بہنوئی کے سامنے بھرم رکھنے کو ایسا کہا ہے۔

''فرحان نظر نہیں آ رہا؟'' طیبہ نے چھوٹے بھائی کے بارے میں پوچھا۔

''آ جائے گا۔ دوستوں میں نکل گیا ہوگا۔''

اماں بتا نہیں سکیں بھابھی کے طعنوں سے تنگ آ کر شام کو باب کرنے لگا ہے۔

چھوٹی راضیہ نے ٹرے میں چائے، سموسے اور دیگر لوازمات رکھ کر کامران کو پکڑا دی کہ جا کر اپنی امی کو دے آؤ۔ جانتی تھی، بعد میں یہ ہنگامہ بھی کریں گی کہ سارا کچھ خود ہڑپ کر گئے تھے۔ کسی نے پوچھا تک نہیں۔

نعیم اور طیبہ نے رات کا کھانا ادھر ہی کھایا۔ صبح راضیہ کا پیپر تھا۔ اسے پڑھنا تھا مگر وہ نفیسہ سے کام میں مدد کے لیے نہیں کہہ سکتی تھی۔ کچھ کام طیبہ نے کروایا، اماں بھی بار بار بیٹے اور داماد کے پاس سے اٹھ کر کام کا پوچھنے آتی رہیں۔

عمران کچن میں ہی پھوپھو کے پاس کرسی ڈالے پڑھ رہا تھا، راضیہ کام بھی کر رہی تھی اور اسے پڑھا بھی رہی تھی۔ راضیہ نے دبے لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کی۔ گھر آئے مہمان کا احسان

UrduBooks.pk

دلایا مگر اس گھر میں ان کی دادی، چاچو اور پھوپھو کی کیا اہمیت تھی۔ وہ بخوبی واقف تھے، سو ان کی بات کم ہی سنا کرتے تھے۔

ابھی وہ عمران کو پڑھا کر فارغ ہوئی تھی کہ نفیسہ کی بہن آصفہ اپنے بچوں کے ساتھ چلی آئی۔

"اف اب مزید کام۔" راضیہ پر جھلاہٹ سوار ہونے لگی۔ آصفہ ادھر آتی تو ان لوگوں سے سلام کی ضرورت محسوس نہیں کرتی تھی۔ سیدھی بہن کے پاس ہی جایا کرتی اور نفیسہ کسی بچے کے ہاتھ چائے کا پیغام بھیج دیتی۔

ابھی کچھ دیر پہلے نعیم اور طیبہ کی آمد پر جو چائے بنی تھی، وہ کچھ بچی ہوئی تھی۔ راضیہ نے وہی چائے گرم کی اور کامران کے ہاتھ اندر بھجوادی۔

آصفہ نے رات کا کھانا بھی ادھر ہی کھایا۔ طیبہ اور آصفہ آگے پیچھے ہی گھر سے نکلے اور ان کے جاتے ہی نفیسہ نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

"یہ اوقات ہے اس گھر میں میری بہن کی۔ اسے بچی ہوئی چائے پلائی گئی۔ سب بتا دیا تھا مجھے رشنا نے اور نہ بھی بتاتی تو بھی کیا پتا نہیں چلتا۔ تازہ اور باسی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"بھابھی! صبح میرا پیپر ہے۔ اتنی دیر سے کاموں میں لگی ہوئی تھی اور یہ چائے ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو بنی تھی۔" راضیہ کی آواز میں واضح کپکپاہٹ تھی۔

"اگر کاموں میں لگی تھیں تو مجھ پر کیا احسان ہے۔ اپنی بہن کی ناز برداریاں ہی تو ہو رہی تھیں۔ میری بہن کو تو باسی چائے ہی بھیجی ہے۔ اتنا بھاری لگ رہا تھا تو صاف کہہ دیتیں۔ میں خود آ کر چائے بنا لیتی۔ کام کر کے مر جاؤ یہاں، کسی کو احساس نہیں جو ذرا چائے بنانی پڑ گئی تو مصیبت آ گئی ان پر۔"

"اچھا اب بس کرو، جو ہونا تھا ہو گیا۔" اعجاز نے بیوی کو سمجھانا چاہا۔

"ہاں بس کر جاؤ، چپ ہو جاؤ۔ خاموش رہو۔ تم ہمیشہ مجھے یہی کہتے رہے ہو، کبھی بہن اور اماں سے سوال و جواب نہیں کیے۔ یہ مہارانی، سوائے پڑھنے اور کھانے کے اسے کوئی کام نہیں اور اکڑتی کیسے ہے مجھ پر۔"

اس الزام پر راضیہ رونے لگی۔ حقیقت تو یہ تھی صبح کالج جانے سے پہلے وہ ناشتا بنا کر جاتی تھی۔ دوپہر میں نفیسہ ہانڈی بنا کر صرف اپنے بچوں اور میاں کے لیے روٹی ڈالتی۔ اماں اور فرحان کے لیے راضیہ آ کر روٹی بناتی اور رات کا کھانا بھی اس کی ذمہ داری تھی۔

اعجاز خوب سمجھتے تھے بیوی کو، مگر تھے روایتی سے شریف مرد۔ نہیں شریف سے زیادہ بزدل کہا جائے تو بہتر ہے۔ بڑی فکر تھی آس پاس کے لوگ کیا سوچیں گے۔ اگر لڑائی کی آواز گھر سے باہر جائے گی تو لوگ باتیں بنائیں گے۔ نفیسہ بولتی رہتی اور وہ دھیمی آواز میں سمجھانے کی کوشش کرتے رہتے۔

راضیہ اور اماں صلح جو طبیعت کی مالک، پھر یہ بھی دیکھتی تھیں جب اعجاز ہی بیوی کو کچھ نہیں کہتا تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ وہ نفیسہ کے منہ کم ہی لگتیں۔ نفیسہ بیگم دل ہوا تو کوئی کام کر لیا ورنہ پڑے رہے اور کالج سے واپس آ کر راضیہ کو ہی دیکھنا پڑتا۔

شادی سے پہلے طیبہ اسکول میں پڑھاتی تھی اور اپنی اور بھائی کی چھوٹی موٹی ضروریات وہ اپنی تنخواہ سے ہی پوری کرتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد فرحان نے جاب کر لی۔ صبح یونیورسٹی شام کو جاب، صرف اس لیے کہ نفیسہ کو میاں کا ایک پیسہ بھی ان پر خرچ ہوتے دیکھ کر آگ لگ جاتی تھی۔

سب سے لڑنے جھگڑنے کے بعد نفیسہ خود ہی منہ بگاڑے کمرے میں بیٹھی تھی۔ تینوں بچے راضیہ کے پاس تھے۔ اعجاز جانتے تھے۔ کمرے میں جائیں گے تو نفیسہ ایک بار پھر شروع ہو جائے گی۔ کتنی دیر ڈرائنگ روم میں بیٹھے کتاب پڑھتے رہے، مگر کب تک، کمرے میں تو آخر جانا ہی تھا اور وہاں نفیسہ بھی ان کے انتظار میں جاگ رہی تھی، ویسے وہ چپکے سے باہر جا کر یہ تسلی تو کر آئی کہ اعجاز اپنی ماں یا

بہن کے کمرے میں نہیں ہیں، وہ کمرے میں آئے تو اس نے کروٹ بدل کر اپنی بے داری کا احساس دلایا۔

''اب طبیعت کیسی ہے نفیسہ؟'' انہوں نے بڑی دردمندی سے دریافت کیا۔

''ہائے، سر درد سے پھٹا جاتا ہے۔ کمر میں الگ درد ہے، سچ میرے لیے تو کروٹ بدلنا بھی محال ہو رہا ہے۔''

''تم آرام سے سو جاؤ۔ اب تک کیوں جاگ رہی ہو؟''

''آپ کی فکر ستا رہی تھی، ایک تو اس گھر میں سکون نام کو نہیں۔ پریشان ہو رہی تھی میں کہ اس شور سے گھبرا کر آپ جانے کدھر نکل گئے ہیں۔''

''نہیں۔ میں تو ڈرائنگ روم میں تھا، ایک کتاب کافی دنوں سے شروع کر رکھی تھی، سوچا آج ختم کرلوں۔''

''ہا آہا۔ کیا قسمت ہے ہماری بھی، جب سے شادی ہوئی ہے ایک دوسرے سے تنہائی میں بات کرنے کو بھی ترستے ہیں اور پھر اتنی ذمہ داریاں، لگتا ہے اسی طرح بوڑھے ہو جائیں گے ہم۔''

وہ شوہر کو جب ساس نند کے خلاف بھڑکانا چاہتی تو لہجہ بڑا دردمند اور معصوم سا ہوتا تھا۔ اعجاز بھول ہی جاتے یہ وہی عورت ہے جس نے کچھ دیر پہلے گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔

☆☆☆

راضیہ پر سخت غصہ تھا۔ اسے سزا دینے کا فیصلہ رات کو ہی کر لیا اور اسی منصوبے کے تحت صبح بستر پر لیٹی کراہ رہی تھی۔

''نفیسہ! میری شرٹ پریس کرنے والی ہے اور رومال بھی نہیں مل رہا۔''

''ہائے اعجاز! مجھ سے تو ہلا بھی نہیں جا رہا۔ راضیہ سے کہو وہ شرٹ استری کردے اور رومال بھی تلاش کردے اور اس سے کہہ دیں، ذرا بچوں کو بھی تیار کر کے اسکول بھیج دے۔ بڑی مہربانی ہوگی مجھ پر۔''

''نہیں نہیں، مہربانی کیسی۔ آخر اس کا بھی تو فرض ہے۔'' اعجاز بڑی آسانی سے نفیسہ کے مکر میں آجاتے۔ اب بھی راضیہ سے جا کر کہہ دیا۔

''تمہاری بھابھی کی طبیعت خراب ہے، بچوں کو تیار کردو اور کچھ میرے کام بھی کردو۔'' اس کا آج ٹیسٹ تھا مگر بھائی سے کہہ نہیں سکی۔

یہ بھائی بھی شادی کے بعد کتنے پرائے سے ہو جاتے ہیں، اب اگر فرحان اسے شرٹ استری کرنے اور رومال ڈھونڈنے کو کہتا تو بے دھڑک جواب دے دیتی۔ بتا دیتی۔ آج میرا بہت اہم ٹیسٹ ہے مگر وہ اعجاز سے اب یہ بات نہیں کہہ سکتی تھی حالانکہ جب تک ان کی شادی نہیں ہوئی تھی وہ ان کی لاڈلی بہن ہوا کرتی تھی۔

سوچا تھا رات تو پڑھ نہیں سکی، چلو صبح کچھ دیر پڑھ لوں گی مگر اس گھر میں سکون کہاں ہے۔ ٹھنڈی سانس کھینچ کر وہ کاموں میں جت گئی۔

بچوں کو تیار کر کے اسکول بھیجنا بھی ایک مرحلہ تھا، دادی اور پھوپھو کو وہ کوئی اہمیت ہی کہاں دیتے تھے۔ عمران تو خیر سمجھ دار تھا، خود ہی تیار ہو گیا مگر کامران اور رشنا تو ہاتھ آنے والی چیزیں ہی نہیں تھے۔ ادھر بھائی شرٹ کے لیے شور کر رہے تھے، جیسے تیسے یہ سب سمیٹا اور کچن میں آئی تو اماں ناشتا بنا رہی تھیں۔

''ارے اماں! آپ کیوں یہ کرنے بیٹھ گئیں۔''

''مجھے پتا ہے، تمہیں دیر ہو رہی ہے۔ جاؤ، شاباش تیار ہو جاؤ، میں کر لیتی ہوں۔''

''مگر اماں! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''میری فکر مت کرو، میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

اتنی دیر میں فرحان بھی کچن میں آچکا تھا۔

''کتنے بدتمیز بچے ہیں، کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے گلا گھونٹ دوں ان کا۔''

''کیا ہوا بھائی! اتنے غصے میں کیوں ہو؟''

''تو کیا کروں؟ پھر اپنی ہی جان کو جلایا جا سکتا ہے اس گھر میں۔'' وہ بہت ہی تپا ہوا تھا۔

''آخر کچھ پتا چلے'' راضیہ رسان سے بولی۔

urdubooks.pk

"میرے نوٹس خراب کر دیے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں ان کا، اگر بھیا سے شکایت کروں تو ان کی لاڈلی بیگم گھر سر پر اٹھا لیتی ہیں۔"

"بس بیٹا! تھوڑے دنوں کی بات ہے، صبر کر لو۔ تمہاری تعلیم مکمل ہو جائے گی۔ اچھی جگہ نوکر ہو جاؤ گے تو الگ گھر لے لینا۔ یہاں رہنا واقعی بڑا مشکل ہے۔"

ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ کامران کے چیخنے اور رونے کی آواز آنے لگی۔ ساتھ ہی اعجاز بھائی راضیہ کو پکارنے لگے۔ وہ جلدی سے ادھر لپکی، جا کر دیکھا تو کامران کے ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا اور انک کی شیشی ٹوٹی ہوئی تھی۔ سیاہی فرش پر بھی تھی اور اس کا یونیفارم بھی خراب ہو چکا تھا۔

"ایک دن بھی آرام کا نصیب نہیں ہوتا ذرا جو بستر پر لیٹ گئی ہوں تو کوئی میرے بچوں کو دیکھنے والا بھی نہیں۔ حالانکہ گھر میں اتنے لوگ ہیں۔"

نفیسہ اسے سنانے کو کہہ رہی تھی اور آنکھوں میں آنسو میاں کو دکھانے کے لیے تھے۔

راضیہ کامران کا ہاتھ پکڑ کر باتھ روم میں لے آئی، اسے چوٹ اتنی نہیں آئی تھی مگر ماں کی طرح شور وہ بھی بہت کرتا تھا۔

جیسے تیسے اسے دوبارہ تیار کیا، ناشتا کروایا اور اسکول روانہ کر دیا۔ اسے کالج سے دیر ہو رہی تھی، ناشتا کیے بغیر ہی چلی گئی۔

"اماں! چلیں میں آپ کو خالہ کے پاس چھوڑ آتا ہوں۔" فرحان نے اماں سے کہا۔

"مگر کیوں بیٹا؟" برتن دھوتی اماں جان نے مصروف سے انداز میں پوچھا۔

"یہاں رہیں گی تو سارا دن کام ہی کرتی رہیں گی۔ ہماری بھابھی صاحبہ کو تو پلنگ توڑنے کا ہی کام رہ گیا ہے۔"

"ایسا نہیں کہتے بیٹا! ہو سکتا ہے سچ مچ اس کی طبیعت خراب ہو۔"

"ان کی طبیعت ہمیشہ ہی لڑنے جھگڑنے کے بعد یوں ہی خراب ہو جاتی ہے اور اماں اگر واقعی خراب ہے تو بھی آپ کو ہمدردی کرنے کی ضرورت نہیں۔ خیال اس کا کیا جاتا ہے جو ہمارا خیال کرے، جب ان کو پروا نہیں تو آپ بھی مت جان کھپائیں۔ بس اٹھ جائیں اب، میں چھوڑ آتا ہوں خالہ کے ہاں۔"

"نہیں بیٹے! تمہیں اس کی عادت کا پتا ہے، بہت ہنگامہ کرے گی۔ سب سے کہے گی میری طبیعت خراب تھی اور یہ چھوڑ کر چلتے بنے۔"

"مت پروا کیا کریں آپ۔"

"پروا کرنی پڑتی ہے بیٹا! اب بروں کے ساتھ ہم بھی برے بن جائیں تو پھر فرق کیا رہ جاتا ہے۔"

فرحان نے بہت عقیدت اور پیار سے ماں کی طرف دیکھا اور چلا گیا۔

☆☆☆

جمعہ کے روز دونوں بہنیں اپنے بھائی امان کے ہاں چلی آئیں۔ انجم کو پہلے سے کوئی اطلاع نہیں تھی۔ وہ تو واشنگ مشین لگائے گھر بھر کی دھلائی کرنے والی تھی۔ اب جو دونوں نندوں کو بچوں کے ہمراہ آتے دیکھا تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"ارے آج تو عید ہو گئی بھئی، دونوں بہنیں میرے گھر میں آئی ہیں۔" امان بہت خوشی کے ساتھ دونوں سے مل رہے تھے۔

"بس بھائی دل بڑا تڑپتا ہے آپ کے لیے، ورنہ بچوں کے ساتھ گھر سے نکلنا کوئی آسان تھوڑی ہوتا ہے۔ سو کام کرنے ہوتے ہیں چھٹی کے دن، مگر سب چھوڑ چھاڑ بس آپ سے ملنے چلے آئے ہیں۔" آصفہ بھائی کے ساتھ لگی کہہ رہی تھی۔

"میں تو سسرال کے ساتھ رہتی ہوں، وہ لوگ جان نہیں چھوڑتے، کسی حال میں بھی۔ رات بخار میں پھنکتی رہی ہوں۔ صبح اٹھ کر ناشتا بنایا گھر بھر کے لیے اور دوپہر کے لیے کوفتے بنا کر آئی ہوں۔" نفیسہ نے بڑے اعتماد سے جھوٹ بولا تھا۔

جواب میں امان نے اس کی سسرال کو خوب کوسنے دیے۔

"انجم! چھوڑو یہ فضول کام نفیسہ اور آصفہ آئی

UrduBooks.PK

ہیں۔ اچھی سی چائے بناؤ اور دوپہر کا کھانا ان کی پسند کے مطابق بننا چاہیے۔"

انجم نے اثبات میں سر ہلایا۔

"انجم بھابھی بڑی خوش نصیب ہیں۔ راج کر رہی ہیں اپنے گھر پر۔ ایک ہم ہیں ساس، نند، دیور ساری مصیبتیں سر پر ہیں اور اب کوئی ہماری اماں کی طرح سیدھا سادہ تھوڑی ہوتا ہے جو کھلاؤ جس وقت کھلاؤ چپ کر کے کھا لیا۔ وہ ہماری جان کو آ جاتی ہیں، نہ نند کسی کام کو ہاتھ لگاتی ہے نہ ساس پلنگ سے اٹھنا پسند کرتی ہیں۔ ہاں فرمائشیں دونوں خوب کرتی ہیں اور ان کے بھائی صاحب کا حکم ہے کہ میری اماں اور بہن کی کوئی بات ٹالی نہ جائے۔" نفیسہ انجم کو سنانے کو ہمیشہ ایسے مکالمے بولا کرتی تھی۔

آصفہ اور اماں کئی بار اس کے ہاں آ چکی تھیں۔ اس کی ساس نند کو بھی جانتی تھیں مگر پھر بھی ہاں میں ہاں ملاتی نہ صرف برا بھلا کہتیں بلکہ دل میں بھی ان کے لیے کدورت رکھتی تھیں۔

انجم چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔ ساتھ ہی عائشہ کو بھی بلا لیا۔ وہ ابھی صرف سات برس کی مگر برتن اٹھانے رکھنے میں ماں کی مدد کر دیا کرتی تھی۔ نبیل تو پھوپھیوں کے بچوں سے ویسے ہی ڈرتا تھا، وہ بھی ان دونوں کے پاس کچن میں چلا گیا۔

"بھیا! ہم تو آپ کی محبت میں یہاں چلے آتے ہیں۔ کوئی کیسا بھی سلوک کرے برا نہیں مناتے۔ بھابھی تو ہم سے ملنا پسند نہیں کرتیں اور اب تو بچے بھی انہیں دیکھ کر ایسا ہی رنگ اختیار کرنے لگے ہیں۔"

"چلو بہو کی مرضی، ہم تو کچھ نہیں کہتے۔" اماں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"نبیل او نبیل، ادھر آؤ۔" امان نے بڑی سختی سے بیٹے کو پکارا۔

"جی ابو۔" وہ ڈرا ہوا سا باہر نکلا۔

"دیکھ نہیں رہے، بہن بھائی آئے ہیں۔ ان کے ساتھ کھیلو، باتیں کرو، تم اندر کیوں گھس گئے ہو؟"

"جی ابو۔" وہ آ کر عمران کے قریب کھڑا ہو گیا کہ ان سب میں یہی ذرا شریف اور معقول تھا۔

"امی! مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" رشنا نے ٹھنکنا شروع کر دیا۔

"مجھے کیا کہہ رہی ہو، جاؤ ممانی سے کہو تمہیں کچھ کھانے کو دے دے۔"

"ابھی چائے بنا کر لائیں گی ممانی۔" آصفہ نے سمجھایا مگر رشنا کسی کی کب سنتی تھی۔ پانچویں کلاس میں تھی مگر رونا دھونا بچوں کی طرح تھا۔

دوپہر کو انہوں نے فرمائش پر قورمہ، پلاؤ کباب بنوائے۔ بھابھی کو باتیں بھی سناتی رہیں، بچوں کو تمیز سکھانے کا مشورہ بھی دیا حالانکہ نبیل اور عائشہ تو آرام سے بیٹھے تھے، ان کے اپنے بچوں نے ہی آفت مچا رکھی تھی۔

ایک دفعہ آصفہ نے بچوں کو شور کرنے سے منع کیا تو نفیسہ بولی۔

"کھیلنے دو، تمہارے تو اپنے گھر بھی ہنس بول لیتے ہوں گے مگر میرے بے چارے تو ترس گئے ہیں کھیل کود کو۔ ان کی دادی کا تو بس نہیں چلتا، باندھ کر ایک جگہ بٹھا دے۔"

"تم اعجاز سے کہہ کر الگ ہو جاؤ۔" امان بھائی کو بڑا غصہ آ رہا تھا، مظلوم بہن کے سسرال پر۔

"کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔" نفیسہ نے منہ بنایا۔

"اگر تم کہو تو میں سمجھاؤں اعجاز کو۔" امان سنجیدہ تھے۔ نفیسہ نے فوراً منع کر دیا کہ سسرال سے الگ تو وہ خود بھی ہونا نہیں چاہتی تھی۔ بھلا اسے وہاں تکلیف ہی کیا تھی، دل کیا تو کام کیا ورنہ پڑے رہے بستر پر۔ راضیہ نے کالج سے آ کر برتن دھوئے، کھانا بنایا، کبھی بچوں کو گھر چھوڑ کر وہ اور اعجاز گھومنے بھی نکل جاتے۔ آصفہ کے ساتھ شاپنگ کا پروگرام ہوتا تو وہ اپنے بچے ساتھ لے کر ادھر آ جاتی۔ ان سب کو راضیہ اور اماں کے سپرد کر کے دونوں شاپنگ کے لیے نکل کھڑی ہوتیں، بھلا الگ رہ کر یہ مزے کہاں تھے۔

"بھیا! ہم ان عورتوں میں سے نہیں ہیں جو

شوہروں کو لے کر الگ ہو جاتی ہیں، آخر ان کی اماں اور بہن کا بھی کچھ حق ہے ان پر۔'' اور اماں نے ستائش بھرے انداز میں بہن کو دیکھا۔

''رشنا بیٹا! مجھے پانی تو پلانا۔''

اس کی نانی نے پکارا، رشنا نے کبھی کسی کا کام کیا ہو تو پتا ہو، یوں بھی گھر میں جو سلوک بوڑھی دادی سے ہوتا تھا۔ بچے یہ سمجھتے تھے کہ سب بوڑھوں سے ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے، نانی نے دوبارہ کہا، وہ کھیل کود میں مصروف رہی آخر آصفہ اٹھ کر گئی اور پانی لا کر دیا۔

شام کو اماں اور نبیل بازار گئے اور ڈھیر سارا فروٹ لے کر آئے سارے کا سارا لا کر اماں کے آگے رکھ دیا تو عمران کو خاصی حیرت ہوئی۔ ان کے ہاں تو ایسی چیزیں دادی سے چھپائی جاتی تھیں۔ امی بہت سنبھال کر اپنے کمرے میں رکھ لیتیں کہ فریج میں رکھیں گے تو پھر وہ لوگ بھی کھائیں گے۔ اکثر پھل خراب ہو جاتے اور بعد میں پھینکنے پڑتے مگر یہاں سب کچھ نانی کو دے دیا گیا تھا۔ وہی سب کو دے رہی تھیں اور نانی کتنے آرام سے صاف ستھرے بستر پر بیٹھی بس حکم جاری کرتی رہتی ہیں جب کہ دادی سارا دن کسی نا کسی کام میں مصروف رہتی تھیں۔

رات گئے دونوں بہنیں اپنے اپنے گھروں کو لوٹیں ساتھ ہی پروگرام بنالیا۔ آصفہ اس کی طرف آجائے گی بچوں کو وہاں گھر پر چھوڑ کر دونوں بازار جائیں گی۔ آج کل سیل لگی ہوئی ہے، اپنے اور بچوں کے کپڑے خریدنے کا بڑا اچھا موقع ہے۔

''امی! ہم بھی بازار جائیں گے۔'' عائشہ نے ان دونوں کی باتیں سن کر انجم سے فرمائش کر دی۔

''لو تھوڑے کپڑے ہیں تمہارے پاس۔'' دادی نے ڈانٹ کر رکھ دیا۔

''اور کیا تمہیں بھلا سیل سے لینے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارا بھائی تو بن کہے ہی قیمتی سے کپڑا گھر لے آتا ہے۔'' نفیسہ بھی خود بول پڑی۔

☆☆☆

نفیسہ گھر آئی تو دروازے پر تالا لگا ہوا تھا، جا کر پڑوس کا دروازہ کھٹکھٹایا اور گھر والوں کے بارے میں پوچھا۔

''پتا نہیں وہ سب طیبہ کی طرف گئے ہیں اور چابی اسے دے گئے ہیں۔''

''طیبہ کی طرف، یہ اچانک بیٹھے بٹھائے کیسے پروگرام بن گیا۔''

''پتا نہیں، میں نے تو زیادہ پوچھا نہیں۔''

نفیسہ کے لڑائی جھگڑے سارے محلے میں مشہور تھے غصے میں وہ خوب اونچی آواز میں چلایا کرتی تھی۔ پڑوسنیں اسے پسند نہیں کرتی تھیں، دروازے پر ہی چابی لا کر دے دی اور رسمی طور پر بھی بیٹھنے کو نہیں کہا۔

''امی! بھوک لگی ہے۔'' گھر آتے ہی کامران نے شور مچا دیا اور اسے دیکھ کر رشنا بھی شروع ہو گئی۔

''اتنا کچھ ٹھونسا تھا دوپہر کو۔ اب پھر بھوک لگ گئی تمہیں۔'' وہ ان پر الٹ پڑی۔ ساری دوپہر ماں بہن سے باتیں کرتی رہی، ایک لمحے بھی آرام نہیں کیا۔ سوچا تھا، گھر جاتے ہی لیٹ جائے گی مگر بچوں نے بھوک کا شور مچا دیا۔ اس نے جلدی سے کپڑے تبدیل کیے اور کچن میں آگئی۔ یہ دیکھ کر غصے کی انتہا نہیں رہی کہ کچھ بھی پکا ہوا نہیں تھا۔

کامران کھانا مانگ رہا تھا، اب اتنی جلدی کھانا تو تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ دو طمانچے اسے رسید کیے تو شور مچاتی رشنا خود بخود خاموش ہو گئی۔

پیسے نکال کر عمران کو دیے کہ بازار سے کچھ لے آئے۔

''نہیں امی! اتنی رات کو میں بازار نہیں جاؤں گا۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''ڈرنے کی کیا بات ہے، قریب ہی تو بازار ہے اور تم تو میرے بہادر بیٹے ہو۔'' نفیسہ نے اسے چمکارا۔

''اتنا بھی قریب نہیں اور جو راستے ہیں، اندھیری گلی پڑتی ہے میں نہیں جا سکتا۔ ساتھ والوں کے لڑکے کو بھیج دیں۔''

''ہاں جب تم میرے بیٹے ہو کر نہیں مانو گے تو

UrduBooks.PK

وہ تو ضرور ہی مان جائے گا۔ چلو اٹھو کھانا لاؤ ورنہ بھوکے ہی سونا پڑے گا۔"

"سو جاؤں گا بھوکا ہی اور جب رات کو راضیہ پھوپھو آئیں گی تو ان سے کہہ دوں گا، کھانا بنا دیں۔"

"ہاں ہاں، وہ تیری مجھ سے زیادہ سگی ہے۔ توبہ توبہ، اس چڑیل نے کیسا جادو کر دیا ہے میرے بچوں پر۔ میں کہے دیتی ہوں عمران! خبردار جواب تم مجھے اس کم بخت کی قریب بھی نظر آئے، چلو اٹھو اب پکڑو پیسے اور لے کر آؤ کھانا۔"

مگر وہ بھی اسی کا بیٹا تھا انکار کر دیا۔ سو کر دیا۔

آخر اسے خود ہی کھانا تیار کرنا پڑا۔ کچھ تھکن تھی باقی کسر غصے نے پوری کر دی۔ سر میں شدید درد ہونے لگا، پکا ارادہ کر لیا، ان لوگوں کی آنے پر دروازہ نہیں کھولے گی مگر منصوبہ ادھورا رہ گیا جب وہ آئے تو عمران جاگ رہا تھا۔ اس نے پہلی ہی بیل پر دروازہ کھول دیا۔

پہلے تو یہ ارادہ تھا سوتی بنی رہے گی لیکن پھر اعجاز سے سوال وجواب کے لیے تیار ہو کر بیٹھ گئی۔

"السلام علیکم!" اعجاز کا موڈ خاصا خوش گوار تھا اور ہاتھ میں پکڑے تین پیکٹ نفیسہ کی طرف بڑھا کر مزید مسکرائے بھی تھے۔

"ہیں، کیا ہے یہ؟" نفیسہ کی آنکھوں میں ذرا کی ذرا چمک ابھری پھر فوراً پہلے والے موڈ پر آ گئی۔

"کہاں گئے تھے سیر سپاٹے کو، کبھی اتنا تو ہوا نہیں کہ بیوی بچوں کو گھمانے پھرانے لے جائیں۔ ادھر ہم گھر سے نکلے ادھر آپ لوگوں کو موقع مل گیا۔"

"ہم لوگ طیبہ کی طرف گئے تھے، اس کا فون آیا تھا۔ اس کی نند امریکہ سے آئی ہوئی ہے، کہنے لگی۔ "آپ لوگ بھی رات کا کھانا ہماری طرف کھائیں۔"

"ہوں، جیسے میں سمجھتی نہیں ہوں کہ یہ سب پہلے سے پلان کیا گیا تھا۔ پتا تھا ناں راضیہ اور تمہاری اماں کو جمعہ کے روز مجھے اپنے بھائی کے گھر جانا ہے بس اسی روز یہ پروگرام رکھ لیا کہ کہیں بھابھی اور بچے نہ شریک ہو جائیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں نفیسہ! طیبہ کا فون میں نے ہی اٹینڈ کیا تھا۔"

"اعجاز صاحب آپ سمجھتے نہیں ہیں، بڑی مکار ہیں یہ۔"

"نفیسہ خواہ مخواہ بدگمانی مت کرو۔" اب اعجاز کی آواز بھی کچھ اونچی اور سختی لیے ہوئے تھی۔

"ہاں میں تو ہوں ہی بری۔" وہ آنسو بہانے کی تیاری کرنے لگی۔

"اب خدا کے لیے آدھی رات کو نحوست مت پھیلانا۔" انہوں نے کپڑے الماری سے نکالے اور باتھ روم میں چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی نفیسہ نے پیکٹ ہاتھ میں لے کر وزن کا اندازہ کیا۔ لگتا ہے سوٹ ہے جی خوش ہو گیا مگر جلدی سے چادر تان کر سوتی بن گئی۔ پیکٹ سنبھال کر رکھے بھی نہیں اعجاز کو یہی تاثر دیا کہ مجھے ان کی کوئی پروا نہیں۔

☆☆☆

آصفہ نے اس کے ہاں آنے سے پہلے فون کیا اور کہا۔ میں بس ابھی گھر سے نکلنے والی ہوں۔ تم بازار جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

"تم بس پہنچنے کی کرو میں تو دو منٹ میں تیار ہو جاتی ہوں۔" مگر جب آصف بچوں کو لے کر ان کے ہاں آئی تو نفیسہ سر پر دوپٹا باندھے بستر پر پڑی تھی۔

"ہائیں، ابھی جب میں نے فون کیا تب تک تو تم ٹھیک تھیں۔ اچانک کیا ہو گیا؟" وہ بے حد پریشان ہو کر پوچھ رہی تھی۔

"امی کو کیا ہونا ہے خالہ! اصل میں آج گھر میں مہمان آ رہے ہیں ناں تو اس لیے۔" عمران نے اصل بات کھولی تو تینوں بچے ہنسنے لگے۔

"چپ بدتمیز! ذرا بھی ماں کا احساس نہیں۔ سمجھ رہے ہیں میں جھوٹ موٹ کی بیمار بنی ہوں۔ چلو بھاگو یہاں سے۔" نفیسہ نے تینوں کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔

"کیا ہوا نفیسہ؟" آصفہ اب بھی فکر مند تھی۔ بچوں کے جاتے ہی نفیسہ نے سر پر باندھا دوپٹہ اتار پھینکا اور بولی۔

"تم کیوں پریشان ہو گئیں۔ میں ٹھیک ہوں۔"

"تو پھر یہ کیا تھا؟" وہ حیران ہوئی۔

"اصل میں آج طیبہ بیگم کی نند تشریف لا رہی ہیں۔ دوپہر کا کھانا ہمارے ہاں کھائیں گی۔ امریکہ سے تشریف لائی ہیں محترمہ، خوب خاطر مدارت کی جائے گی اور مصیبت ہماری جان پر۔ ارے میں کوئی مفت کی نوکرانی ہوں جو اُن کی بیٹی کے سسرالیوں کی خدمت کرتی رہوں۔ خود ہی پکائیں ماں بیٹی اور کھلائیں اپنی مہمان کو۔ ہم سے نہیں ہوتی خوشامدیں۔"

"تم مجھے پہلے بتا دیتیں، میں بچوں کو لے کر نہ آتی۔"

"کیوں بھئی، کیوں نہیں لاتیں۔"

"دیکھو ناں میں تو بازار جانے کے لیے آئی تھی، تم بیمار بنی لیٹی ہو۔ کیسے جاسکتے ہیں بازار۔"

"کیوں نہیں جاسکتے۔ مجال ہے کسی کی جو مجھے روکے، بس میں بچوں سے یہ کہہ دیتی ہوں کہ تمہاری خالہ کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں جا رہے ہیں۔"

"اور جو اتنی دیر سے واپسی ہوگی تو تمہاری ساس پوچھیں گی نہیں۔"

"وہ میرا مسئلہ ہے، تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔"

نفیسہ نے اٹھ کر کپڑے بدلے، بال بنائے اور بچوں سے کہہ کر کہ تمہاری خالہ کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں جا رہی ہوں، چلی گئی۔

☆☆☆

"اماں! کیا ساری بھابیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔" راضیہ بہت آزردہ ہو رہی تھی۔

"تم اپنا دل کیوں میلا کرتی ہو؟" اماں نے سمجھایا۔

"اماں! میری پڑھائی کا بہت حرج ہوتا ہے۔"

راضیہ ابھی سیکنڈ ائیر میں تھی، جب نفیسہ بیاہ کر آئی تو بہت چھوٹی تھی۔ تب طیبہ موجود تھی اور اماں کی صحت بھی اچھی تھی۔ دونوں مل کر کام کرلیتیں ہاں نفیسہ ضرور کہتی رہتی تھی راضیہ اب بڑی ہوگئی ہے اسے بھی کام کرنا سکھائیں اور اب اپنی رشنا پانچویں میں تھی۔ ٹیبل پر برتن بھی نہیں لگا سکتی تھی اور راضیہ یا اماں کی مجال نہیں تھی کہ اسے کچھ کہہ سکیں۔

نفیسہ کا خیال تھا اعجاز روزانہ کی طرح کھانے کے ٹائم پر ہی آفس سے آئیں گے مگر آج وہ جلدی آگئے۔ نفیسہ کے بارے میں پوچھا تو دادی سے پہلے رشنا بولی۔

"ابو امی کے سر میں درد تھا، وہ ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں۔"

"کوئی نہیں ابو، امی تو بازار گئی ہیں شاپنگ کے لیے۔ انہوں نے خود آصفہ خالہ سے فون پر بات کی تھی۔" عمران بیچ میں بول پڑا۔

اعجاز خاموش سے ہوگئے۔ اماں راضیہ اور فرحان کی خاموشی انہیں شرمندہ کر رہی تھی، جا کر کمرے میں لیٹ گئے۔ جب نفیسہ آصفہ کے ساتھ شاپنگ کرکے لدی پھندی گھر واپس آئی تو مہمان آچکے تھے۔ آصفہ اور نفیسہ کے بچوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ کامران پھسل کر گر گیا تھا اور نازو سے لڑ رہا تھا کہ تم نے دھکا دیا ہے۔

نفیسہ کا خیال نہیں تھا کہ اعجاز آفس سے آگئے ہوں گے، وہ بڑے فریش چہرے کے ساتھ شاپر اٹھائے اپنے کمرے میں آئی، انہیں بیڈ پر موجود پایا تو چونکی پھر فوراً ہی سنبھل کر بولی۔

"تو۔ یہ تو آصفہ تو یوں سمجھتی ہے کہ میرے پاس بھی اسی کی طرح کھلا پیسہ ہے۔ میں تو ڈاکٹر کے پاس گئی تھی مگر وہ زبردستی دکانوں پر لیے پھری اور اتنی بہت سی چیزیں خریدلیں۔"

اعجاز نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا، اٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ آصفہ باہر ہی کھڑی تھی، سلام کیا جواب بس سر کے اشارے سے ہی دیا اور مہمانوں کے پاس ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔

"اچھا نفیسہ! میں چلتی ہوں۔"

"کیوں بھئی اتنی جلدی کیا ہے، کھانا کھا کر جانا۔" نفیسہ پر کوئی اثر نہیں تھا۔

"نہیں پھر کبھی سہی۔" وہ بچوں کو لے کر چلی گئی۔

نفیسہ نے ہاتھ دھو کر ہلکا سا میک اپ کیا کہ آخر طیبہ کی نند امریکہ سے آئی تھی اور اسے گفٹ بھی

UrduBooks.pk

تو بھیجا تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کا رویہ طیبہ کے ساتھ کیسا ہے۔

وہ ڈرائنگ روم میں آئی، طیبہ اٹھ کر بڑے پیار سے ملی۔ اس کی نند نے بھی ہاتھ ملایا جب کہ نعیم اور فرحان اسے مکمل طور پر نظر انداز کر کے آپس کی باتوں میں لگے رہے۔ راضیہ، اماں اور اعجاز بھی باتوں میں مصروف تھے۔ وہ جا کر اس کی نند کے پاس بیٹھ گئی اور ذرا دیر بعد ہی اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔ میٹھا لہجہ، دوستانہ مسکراہٹ کوئی سوچ تھا، یہ عورت گھر والوں کا جینا حرام کیے رکھتی ہوگی۔ طیبہ کی نند نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ لکی ہیں کہ اتنی اچھی بھابھی ملی ہے۔'' فرحان کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ رینگ گئی جب کہ اعجاز نے بظاہر ہنستے ہوئے کہہ دیا۔

''دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں آپا۔''

نفیسہ کھول ہی تو گئی مگر بظاہر ہنس پڑی۔

پھر جتنی دیر یہ لوگ موجود رہے وہ بھی بیٹھی رہی۔ طیبہ، راضیہ کی مدد کے لیے اٹھ کر کچن میں چلی گئی مگر اماں بھی نزدیک ہی بیٹھی تھیں۔ نفیسہ، طیبہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کر سکی، ان لوگوں کے جاتے ہی کمرے میں آ گئی۔

اعجاز کافی دیر کے بعد آئے، اسے مخاطب نہیں کیا آ کر خاموشی سے لیٹ گئے۔ نفیسہ نے بھی مخاطب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

اگلے روز بھی وہ کاسے بجھے بجھے تھے۔ نفیسہ نے توجہ نہیں دی۔

''میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں نفیسہ۔'' شام کو آفس سے آ کر بڑی سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

''فرمائیے۔'' نفیسہ سمجھ رہی تھی بات کس قسم کی ہوگی۔ سو جھکنا مناسب نہیں تھا۔

''مجھے صرف اتنا بتا دو۔ تم چاہتی کیا ہو آخر؟''

''میں نے بھلا کیا چاہنا ہے۔'' نفیسہ نے ٹھنڈی سانس کھینچی۔

''تم اتنی مظلوم ہو نہیں، جتنا بنتی ہو۔''

''اچھا تو پھر کون ہے مظلوم آپ یا آپ کی اماں اور بہنیں یا وہ بھائی جو مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتا ہے جسے بڑی بھابھی سے بات کرنے کی بھی توفیق نہیں۔''

''نفیسہ! گھر یوں نہیں چلا کرتے، تم خود کو بدلو۔ اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔''

''میں نے اس گھر کو ہمیشہ اپنا گھر سمجھا ہے مگر باقی لوگ مجھے اپنا نہیں سمجھتے۔''

وہ خاصی اونچی آواز میں بول رہی تھی اور بولتے بولتے رونے لگی، اعجاز کے لیے مزید بات کرنا ہی مشکل ہو گیا۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ کچھ مزاج بھی بدل جاتے ہیں اور کچھ لوگ ہر حال میں اپنی روش میں قائم رہتے ہیں۔ ضد، غصہ، کینہ، نفیسہ نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

فرحان کو سروس ملی تو وہ راضیہ اور اماں کو لے کر الگ ہو گیا۔ اعجاز ایسا نہیں چاہتے تھے مگر فرحان نے نفیسہ کے سامنے کہا۔

''میں اپنی ماں کی مزید بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا اور نہ ہی بہن کو دن رات ملازماؤں کی طرح کام کرتے دیکھ سکتا ہوں۔''

''دیکھیں گے تمہاری بیوی کون سے تخت پر بٹھاتی ہے انہیں۔'' نفیسہ نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا۔

''بیوی اگر آپ جیسی آئی تو دوسری دن گھر سے باہر نکال دوں گا۔ میں بھیا کی طرح نہ تو اپنی بے عزتی برداشت کروں گا نہ اپنی ماں اور بہن کی۔''

وہ لوگ چلے گئے اور اعجاز کو اتنے سال بعد بیوی کے سگھڑاپے کا احساس ہوا۔ گندے فرش، فرنیچر پر دھول مٹی اور بدمزا کھانا۔ اگر اعجاز کا کوئی دوست گھر آ جاتا تو نفیسہ کے لیے چائے بنانا ہی مشکل ہوتا۔ اتنے سال آرام سے بستر پر گزار کر اب اسے کام بہت مشکل لگتا تھا۔ رشنا کو اس نے صرف اس لیے کوئی کام نہیں

سکھایا تھا کہ پھر راضیہ کو آسانی ہو جائے گی اور اب تو رشنا کوئی بات سنتی ہی نہیں تھی۔ اسے ماں کا کوئی احساس نہیں تھا، ہاں بس ماموں کے ہاں جانے کو تیار رہتی تھی اب تو انجم ممانی کی بھی عزت کرنے لگی تھی کہ مطلب ان کے بیٹے سے تھا۔ کام وام تو کرنا آتا نہیں تھا ان کے ہاں جاتی اور باتیں خوب بناتی۔

جب کہ نفیسہ کا خیال تھا رشنا کا یوں انجم کے سامنے جھکنا، اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرنا فضول ہی ہے۔ وہ میرا بھتیجا ہے، سب سے زیادہ حق میرا ہے جس روز بھائی سے اس خواہش کا اظہار کروں گی، وہ انجم کی رائے لینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کریں گے، فوراً ہاں کہہ دیں گے۔

☆☆☆

راضیہ کی شادی چند سال پیش تر ہوئی تھی۔ اعجاز نے بھرپور حصہ لیا۔ عمران، کامران بھی جاتے رہے۔ رشنا اور نفیسہ مہمانوں کی طرح ہی شامل ہوئیں۔ فرحان کی شادی ہوئی تو نفیسہ بڑی خوش تھی کہ اسے آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا مگر بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کی بیوی بھی انجم کی طرح تھی۔ یہ اور بات کہ اسے سسرال انجم کی سسرال سے بہت بہتر ملی۔ نفیسہ کا دل برا ہو گیا اور دیور کے ہاں جانا چھوڑ دیا۔

فرحان کا گھر نفیسہ کے بھائی امان کے گھر کے قریب ہی تھا۔ رشنا کا ہر دوسرے روز وہاں جانا اور نبیل کے آگے پیچھے رہنا کئی لوگوں کے علم میں تھا۔ محلے کی ایک دو لڑکیاں عائشہ کی سہیلیاں تھیں۔ انہوں نے رشنا کو نبیل میں دلچسپی لینے اور اوچھی حرکتیں کرتے دیکھا تو سارے محلے میں بات پھیلی، اعجاز کی اماں تک بھی پہنچی تو انہوں نے بیٹے کو بلایا اور سمجھایا۔

”اماں! یہ میری بدنصیبی تھی کہ مجھے نفیسہ جیسی بیوی ملی جسے دوسروں کے گھروں کی تو بڑی فکر رہتی ہے مگر اپنی اولاد کی پروا نہیں۔“

اعجاز بہت گرم ہو کر گھر آئے۔ نفیسہ سے بات کی اس نے صاف انکار کر دیا۔

”یاد رکھو نفیسہ بیگم! اگر آئندہ میں نے رشنا کو تمہارے بھائی کے ہاں دیکھا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

نفیسہ نے اس دھمکی پر کوئی توجہ نہیں دی، یوں بھی اس کا ارادہ تھا اب وہ جلد ہی بھائی سے بات کرلے گی۔

☆☆☆

اگلے روز ہی رشنا کے ساتھ خود بھائی کے گھر گئی۔ انجم پر اتنے برس گزر جانے کے باوجود اس کا خوف حاوی تھا۔ وہ نفیسہ کے سامنے بات کرتے بھی گھبراتی تھی۔ نبیل نے سلام کیا اور جا کر اپنے کمرے میں بیٹھ گیا۔ رشنا بھی پیچھے ہی اس کے کمرے میں چلی گئی۔

”بھائی کدھر ہیں؟“ نفیسہ نے انجم کو کوئی اہمیت نہیں دی اور پوچھ کر امان کے کمرے میں چلی گئی۔

اس کا خیال غلط تھا، امان کو رشنا ہرگز پسند نہیں تھی۔ وہ اس کا ہر دوسرے روز یہاں آنا اور نبیل کے آگے پیچھے رہنا بھی دیکھ رہے تھے مگر بہن کو جواب دینا بھی مناسب نہیں تھا۔ انہیں اقرار کرتے ہی بنی، وہ بہت خوشی خوشی وہاں سے گھر لوٹیں مگر اس سے پہلے کہ اعجاز کو یہ خبر سنائیں اماں کا فون آ گیا۔ وہ بہت معذرت کر رہے تھے، شرمندہ تھے، بہن سے کہ بیٹا ہی راضی نہیں تھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے امان بھائی؟“ وہ سکتے میں آ گئی۔

”نبیل نہیں مان رہا اور سچ تو یہ ہے نفیسہ کہ اب وہ دور نہیں رہا۔ ہم بچوں پر زبردستی کر کے اپنی بات منوا سکیں۔“

اگلے روز آصفہ بہن کے ہاں آئی۔ نفیسہ نے اسے نہیں بتایا کہ رشنا کے لیے نبیل کو مانگا تھا مگر نبیل نے انکار کر دیا۔ آصفہ کا ناصر بھی اچھا لڑکا تھا، وہ سوچ رہی تھی بھیا سے بات کروں گی کہ وہ آصفہ سے رشنا کے لیے کہیں۔

”آصفہ نازو کی بات پکی ہونے کی خوش خبری سنانے آئی تھی اور بتا رہی تھی۔ اگلے ہفتے منگنی کی باقاعدہ رسم ہوگی، تم سب کی شرکت لازمی ہے۔

UrduBooks.pk

آصفہ کے جاتے ہی نفیسہ نے اماں کو فون کیا اور آصفہ سے بات کرنے کو کہا۔ اسے جواب کا انتظار تھا مگر بہت دن ہونے کو آئے بھائی کا فون نہیں آیا آخر تھک کر خود ہی نمبر ملا لیا۔

''بھائی جان! ایک کام کہا تھا آپ سے، لگتا ہے آپ بھول گئے ہیں۔''

''نہیں نفیسہ! میں تمہارا کام کیسے بھول سکتا تھا۔ میں نے اسی روز آصفہ سے بات کر لی تھی۔''

''اچھا پھر کیا کہا آصفہ نے؟'' بے تابی چھپا کر پوچھا۔

''نفیسہ! آصفہ بھی میری بہن ہے اور میں سمجھتا ہوں ایک لحاظ سے اس کی بات درست بھی ہے۔ اس کا کہنا ہے رشنا نفیسہ کی بیٹی ہے اور نفیسہ نے کبھی اپنے سسرال سے اچھا رویہ نہیں رکھا۔ ساس نندوں کے ساتھ اس کے گھر میں جو سلوک ہوتا تھا، وہ میرے سامنے ہے۔ بچے خصوصاً بیٹیاں ماؤں سے ہی تربیت حاصل کرتی ہیں۔ اب میرا تو ایک ہی بیٹا ہے اگر رشنا کو بہو بنا کر لاؤں گی تو پھر میرا کیا بنے گا۔''

''ہونہہ...... نہیں تو نا سہی۔ میری بیٹی کے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے۔ وہ تو میں نے اس لیے پوچھ لیا تھا کہ پہلا حق تو رشتے داروں کا ہوتا ہے۔''

وہ یہ بات بھائی سے کہہ نہیں سکی، بس کھولتے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچ کر رہ گئی۔

نازو کی منگنی پر صرف اس لیے چلی گئی کہ آصفہ یہ نا سمجھے مجھے اس کی بات کی پروا ہے۔ اس نے میری بیٹی نہیں لی تو میں نے یہ دکھ دل سے لگا لیا ہے۔ سوچ لیا تھا۔ اب عمران کی شادی کر دوں گی جب تک نبیل نے انکار نہیں کیا تھا، یہی سوچے بیٹھی تھی۔ بھائی کی عائشہ کو مانگ لوں گی، سیدھی سادی سی لڑکی ہے۔ میرے کہنے سننے میں رہے گی مگر اب جب کہ ادھر سے رشنا کے لیے انکار ہو چکا تھا تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ تب بھی اس گھر کی بیٹی لے آتی۔

نازو کی رسم والے روز ہی انہیں صائمہ پسند آ گئی۔ بڑی معصوم سی بھولی بھالی لڑکی تھی بالکل ایسی ہی تو بہو چاہیے تھی، رشتہ مانگا تو ہاں ہوئی اور انہوں نے فوراً شادی کر دی۔ دلہن کو سسرال کی دہلیز پر آتے ہی مزاج دار ساس نند سے پالا پڑ گیا اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر غلطی کیا ہوئی ہے۔ دونوں کیوں منہ پھلائے رکھتی ہیں۔ بہت ڈرتی تھی وہ اپنی ساس سے۔ شادی کے چار دن بعد ہی رشنا نے اسے سمجھا دیا کہ مجھے کچن سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ یہ تمہیں دیکھنا ہو گا اور ڈسٹنگ میں نہیں کر سکتی، الرجی ہے مجھے۔

عمران آفس سے آیا تو صائمہ کچن میں کھڑی نفیسہ کے لیے چائے بنا رہی تھی۔

''ارے تم نے کام بھی شروع کر دیا؟'' وہ حیران تھا۔

''امی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ چائے بنا رہی ہوں۔''

''رشنا کہاں ہے؟''

''پتا نہیں، شاید اپنے کمرے میں ہو گی۔''

''ویسے ہوا کیا ہے امی کو؟''

''کہہ رہی تھیں، سر میں درد ہے، دوپٹہ باندھے لیٹی ہیں۔''

جواب میں عمران نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔

''یہ تو بہت پرانا درد ہے جب دادی اور پھوپھو ہمارے ساتھ رہتی تھیں، تب بہت شدید درد اٹھتا تھا اور اب ایک عرصے کے بعد میرا خیال ہے اتنا ہی شدید درد اٹھا ہو گا۔''

''کیا مطلب؟'' صائمہ حیران تھی۔

''ارے تم نہیں سمجھ سکتیں، ہماری امی کو۔ آؤ چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔ چائے رشنا بنا لے گی ویسے مجھے پورا یقین ہے۔ امی کو چائے کی ہرگز ضرورت نہیں۔''

وہ ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے آیا اور ڈانٹ ڈپٹ کے ارادے سے ادھر آتی نفیسہ کھڑکی کے قریب ہی جمی کھڑی رہ گئیں۔

UrduBooks.pk

رخسانہ نگار عدنان

شام کی حویلی میں

کشف اپنے پرانے طرز کے گھر سے شدید بے زار ہے اور وہ اپنی آنی سے ہزار بار کہہ چکی ہے کہ وہ اس گھر سے جان چھڑا لیں لیکن وہ ہر بار اس کی بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔ کشف گلیوں سے گزرتے خوانچا فروشوں سے بھی سخت بے زار رہتی ہے اور انہیں حسب توفیق بد دعاؤں نوازتی رہتی ہے۔

طاہرہ بیگم کا اپنے گھر پر کافی ہولڈ ہے۔ ان کی بہو سونیا اور بیٹا آزر دونوں ہی۔ ان کے فرماں بردار ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی پوتی کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہو۔

جبکہ ردا اپنے آفس میں کام کرنے والے جبران سے محبت کرتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ وہ اس کا رشتہ لے کر آئے۔

دوسری جانب کشف کا پڑوسی اسے چھیڑتا ہے اور وہ اس کے پاؤں پر اینٹ دے مارتی ہے۔ بعد میں اسی لڑکے کی ماں سے بھی خوب جھگڑا کرتی ہے۔

زینب شاعری کرتی ہے اور ساتھ ہی ایک اسکول میں بھی پڑھاتی ہے وہ اپنا مسوّدہ حیدر کے پاس لے کر جاتی ہے تاکہ وہ سرفراز سے بات کر کے اسے چھپوا سکیں۔

آفس سے واپسی پر اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور وہیں تیز برستی بارش میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

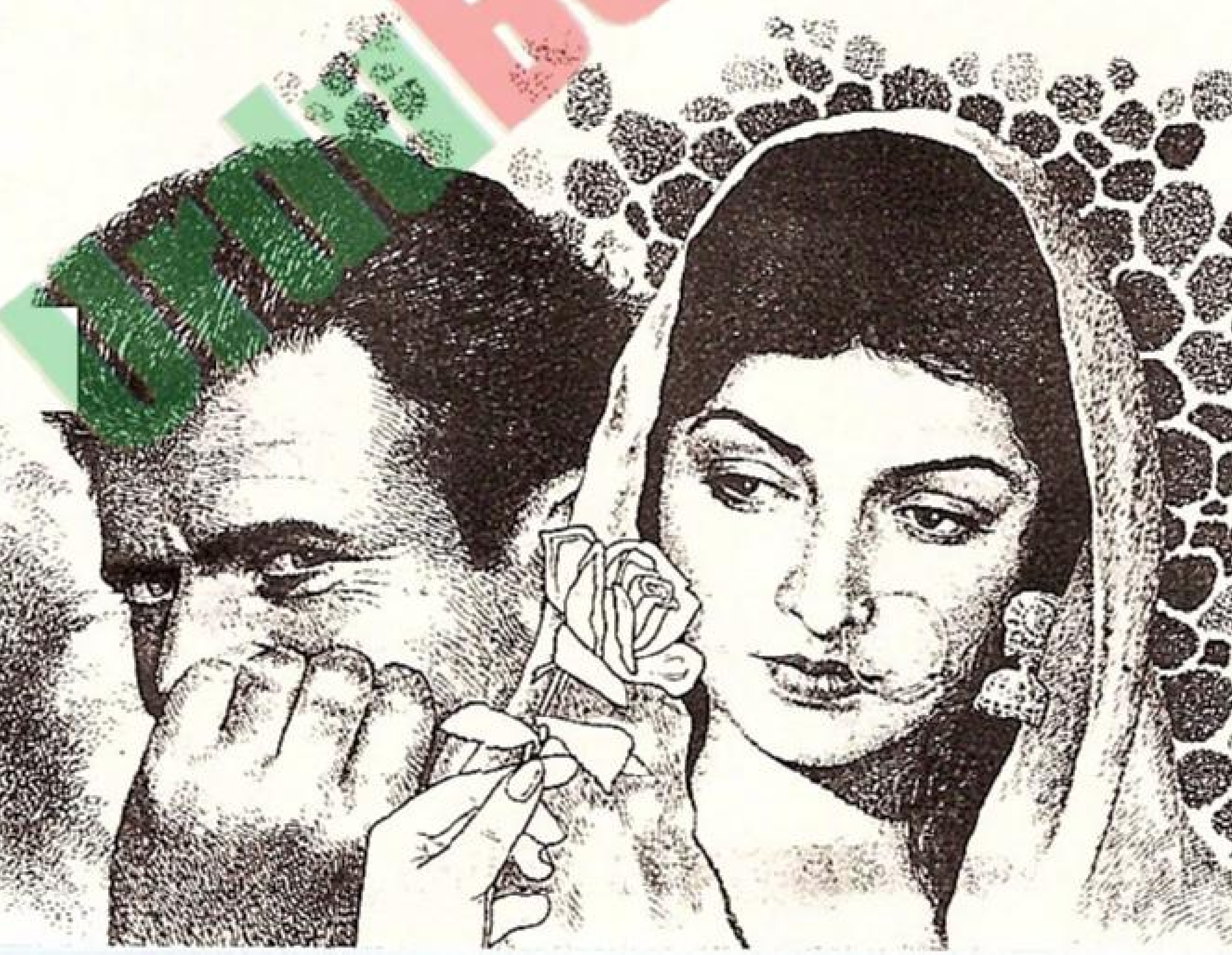

UrduBooks.pk

دوسری قسط

UrduBooks.pk

آڈیٹوریم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔
ہال میں طلبہ، ڈاکٹرز، طب کے شعبے سے تعلق رکھنے والے ماہرین عام شہری اور بہت سارے دوسرے لوگ موجود تھے، جنہیں اس سیمینار میں مدعو کیا گیا تھا۔
سیمینار کا موضوع بھی تو بہت خاص لیکن ضرورت سے زیادہ ہی عام تھا کہ اس اتنے بڑے ہال میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس کے اردگرد اس کے گھر، آفس یا خاندان میں ان تین بڑی بیماریوں کا شکار کوئی مریض نہ ہو۔
سینٹرل ایشیا خصوصاً پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش میں ہارٹ، ذیابیطس، بلڈ پریشر کا بڑھتا ہوا دباؤ کیسے ان ملکوں کی بڑی آبادی کو متاثر کر رہا ہے اور یہ دباؤ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے جبکہ عوامی شعور اور اب بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے لیے حفاظتی اقدامات بھی بڑھائے جا رہے ہیں مگر اعشاریے کم ہونے کے بجائے اوپر کی طرف جا رہے ہیں۔
اسی ہال کے اسٹیج پر غیر ملکی ڈاکٹرز اور ماہرین کی سات رکنی ٹیم بھی بیٹھی تھی جو باری باری ڈائس کے سامنے جا کر ان بیماریوں کے جنم لینے کے نتیجے میں سنگین صورت حال کی حتی الامکان تصویر کشی کر چکی تھی۔
احتیاط، کھانے پینے میں اعتدال، بازاری کھانوں اور جنک فوڈ سے پرہیز سب سے بڑھ کر ورزش، سیر اور جسم کی حرکت جو سائنسی کرشموں کی وجہ سے بالکل محدود ہو کر رہ گئی ہے، اس کو بڑھانے پر زور دیا گیا۔
ہال میں موجود اسی، سے نوے فیصد لوگ یہ ساری باتیں جانتے تھے لیکن ان میں سے ایک تہائی بھی نہیں تھے جو ان ساری گزارشات پر عمل کرنا نہ چاہتے ہوں بلکہ چاہتے تو ہوں گے لیکن کر نہیں پاتے تھے یہ سب کچھ سننے میں جتنا آسان اور دلکش لگتا ہے شاید عملاً یہ اتنا ہی دشوار اور بورنگ ہے کہ خود پر اپنی خواہش اور نفس پر کنٹرول حاصل کرنا منہ زور گھوڑے کو قابو کرنے سے زیادہ مشکل عمل ہے۔
''میرے دوستوں نے وہ سب باتیں، ساری وجوہات بیان کیں جن کی وجہ سے یہ دائمی امراض انسان کے وجود میں پنجے گاڑنا شروع کرتے ہیں پھر جن کا علاج مستقل پرہیز، علاج اور احتیاط ہی ہوتا ہے لیکن میرے خیال میں ان بیماریوں کی دو بنیادی وجوہات غربت جسے عام زبان میں حالات کی مار اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا ذہنی دباؤ جو ام الامراض، سمجھا جا سکتا ہے اور یہ ذہنی دباؤ صرف غربت کی وجہ سے نہیں بہت سارے اور عوامل ہو سکتے ہیں جس میں گھر کر انسان پہلے ٹینشن پھر مایوسی، ناامیدی اور ڈپریشن کا شکار ہوتا ہے اور میرے خیال میں ایک بیمار انسان بھی بیماری سے لڑ سکتا ہے حالات کا مقابلہ کر سکتا ہے لیکن ڈپریس، ناامید اور مایوس شخص لڑنے سے پہلے ہی ہتھیار ڈال دیتا ہے، ہمیں اس پوائنٹ کو فوکس کرنا چاہیے جب بھی ہم بیماریوں کے ان تین ٹرائینگلز کو ڈسکس کریں جن کا لازمی نتیجہ جسمانی لاچاری اور اختتام بے بس موت کی شکل میں ہوتا ہے۔''
ڈاکٹر موحد اپنے خوب صورت انگلش لب و لہجے میں ایک دو جملوں کے بعد اردو کا سہارا لیتے ہوئے۔ بڑے مدلل انداز میں ہال میں موجود اور متوجہ ہجوم کو جیسے سمرائز کرتا چلا جا رہا تھا۔
''ہمت، امید اور مقابلہ کرنے کی سکت انسان کی سب سے بڑی طاقت ہے، ناامیدی اور مایوسی سب سے بڑی کمزوری ہے۔''
وہ ٹھیک اس پوائنٹ کو ہٹ کر رہا تھا جہاں سے بیماری اور کمزوری اپنی جگہ مضبوط کرتی ہے۔
''لیکن دوستو! میں آپ کو بتاؤں ہر مصیبت کے ساتھ ایک آسانی جڑی ہوتی ہے، وہ اس مصیبت کے ساتھ ہی آپ کی زندگی میں آتی ہے۔ بس وہ ہمیں نظر نہیں آتی، شاید مصیبت کی سیاہ بختی اس پر اندھیرا کیے ہوئے ہوتی ہے یا پھر ہم خود ہی اس کو دیکھ نہیں پاتے، دیکھنا نہیں چاہتے۔'' اس کی مسکراہٹ اس کی باتوں کی طرح

جان دار اور دلکش تھی۔

''یہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ صحیح بات ہے یہ تو۔'' سامنے بیٹھے ہر فرد نے دل میں ایک بار تو یہ سرگوشی ضرور کی تھی۔

''ہر بیماری خواہ وہ جسمانی ہو یا دماغی اس کا علاج ہی ایک لفظ میں چھپا ہے۔

وہ لفظ تو میں آپ کو کچھ دیر بعد بتاؤں گا میری نظر میں یہ مایوسی اور ناامیدی ایک اور اہم فیکٹر کے ساتھ جڑی ہے۔''

وہ سانس لینے کو رکا تھا۔

''ساتھ۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔'' آپ کے ساتھ کون ہے۔ یہ زیادہ اہم ہے خود آپ کے لیے اور آپ کی مایوسی کے لیے کوئی ایسا ساتھی ضرور آپ کے ساتھ ہونا چاہیے جو بھلے آپ کی کوئی مادی مدد نہ کرسکے' آپ کی مشکلات کم نہ کر سکے مگر آپ کے اور آپ کے دکھ کو سن سکے' چن سکے جس کے سامنے بیٹھ کر آپ بلاتکلف رو سکیں، آنسو بہا سکیں تو یہی آپ کے لیے بہت بڑی ۔ میڈیسن ہے۔'' وہ سانس لینے کو رکا۔

''میں ایشین فیملی ہسٹری اسٹڈی کر رہا تھا تو مجھے ایک بات بہت اچھی لگی کہ چند سال پہلے تک یہاں جو جوائنٹ فیملی سسٹم تھا۔ بھلے اس میں دس ہزار برائیاں تھیں کہ فرد کے پاس خود کو space دینے کی گنجائش بہت کم تھی' ایک ایک گھر میں چار سے سات خاندان اکٹھے رہتے تھے لیکن پھر بھی وہ لوگ کافی حد تک مطمئن اور آسودہ ذہن تھے۔ اس طرح کی بیماریوں کا تناسب بھی کم تھا کیونکہ ان کے پاس اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے' اپنے دکھ درد شیئر کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی رشتہ موجود ہوتا تھا کوئی ایسا بزرگ' چچا' کوئی خالہ' کوئی ماموں' پھوپھی کوئی بھی جو راز دار بھی پکا ہوتا تھا اور جس کا ظرف اور دامن بھی وسیع ہوتا تھا لیکن ہم نے ترقی کرلی اور ان خود ساختہ سہاروں سے پیچھا چھڑا کر اکیلے ہو گئے تو ان ذہنی جسمانی بیماریوں میں گھر گئے تو ایسے میں اس لفظ کی شمع جلائیں۔''

اور وہ لفظ ہے ''کوشش''

''آپ کو وہ سب کچھ کر دیکھنے کا سوچنا تو چاہیے جب آپ بہت ساری مشکلوں میں گھرے ہوں اور آپ کا دل آپ کو بھی کبھار کہہ رہا ہو کہ ایک بار پھر کوشش کرنی چاہیے اور آپ مایوسی اور ناامیدی میں گھرے اس سرگوشی کو پرے جھٹک دیتے ہوں۔''

باہر شاید بادل چھا گئے تھے یا سورج کا جھکاؤ ادھر سے رخ پھیر کر اپنی روشنی سمیٹ رہا تھا ایئر کنڈیشنڈ ہال میں بہت آہستگی سے مدھم سی تاریکی داخل ہوئی تھی۔

تالیوں کے شور میں ڈاکٹر موحد اپنی نشست تک واپس جا چکا تھا۔

اس کی تقریر اور ریسرچ بہت متاثر کن تھی اس کی پرسنیلٹی میں بھی عجیب ساحر تھا۔ ایک مستقل دھیمی سی مسکراہٹ جو ہمہ وقت اس کے روشن چہرے کا احاطہ کیے رہتی تھی' شاید اس کی عادت تھی جو اس پورے دورانیے میں اس کے چہرے سے جدا نہیں ہوئی تھی۔

مقررین کے بعد ہال میں موجود طلبہ اور دوسرے لوگ باری باری ماہرین سے سوال و جواب کر رہے تھے۔

ڈاکٹر موحد جب اپنی ٹیم کے ساتھ سیمینار ہال سے باہر نکلا تو موسم کے تیور بگڑ چکے تھے۔ کالی گھٹاؤں کے ساتھ بادلوں کی گڑگڑاہٹ اسے اچھی لگی۔ سر اٹھا کر ایک نظر آسمان کو دیکھا اور پارکنگ ایریے کی طرف عجلت سے بڑھا کہ بارش شروع ہونے کو ہی تھی۔

''موسم کافی خراب ہو رہا ہے ڈاکٹر صاحب! آج میرے خیال میں اس علاقے کا وزٹ رہنے دیتے ہیں

کل یا کسی اور وقت چلیں گے۔''
اس کا ڈرائیور رجب علی۔ اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی صلاح دینے والے انداز میں بولا۔
''ارے رجب علی! پختون ہو کر پہاڑوں کی گود میں پل کر بھی ایسے موسم سے ڈرتے ہو۔'' ڈاکٹر موحد کی دلکش مسکراہٹ ہلکی سی ہنسی میں بدلی تھی رجب علی بھی ہنس پڑا۔
''ام تو ڈاکٹر صاحب! انہیں موسموں میں پیدا ہوتا ہے اور انہیں میں شوق سے مرتا ہے بلکہ میدانوں میں آ کر تو ہمارا دم گھٹتا ہے زمین پہ سیدھا چلنا سپاٹ رستوں پہ قدم اٹھانا بڑا عجیب لگتا ہے بلکہ سچ پوچھو تو اچھا نہیں لگتا۔''
رجب علی کو بے اختیار اپنے اونچے اونچے پہاڑوں میں گھرے گھر اور وطن کی یاد آئی تھی بے وطنی کی کسک اس کی آنکھوں میں اتر آئی تھی اور ایسا اس دن ضرور ہوتا تھا جب میدانوں میں پہاڑوں جیسا موسم اترتا تھا۔
''تو چلو یار! پھر کیا گھبرانا' جب رستے نہ تو پہاڑوں کی طرح اونچے نیچے ہیں تو سیدھے رستے پہ گاڑی دوڑانے سے کیا ڈرنا موسم بھلے کیسا بھی ہو۔'' ڈاکٹر نے سامنے کی طرف ٹانگیں ذرا سی پھیلا کر ریلیکس انداز میں باہر دیکھتے ہوئے رجب علی سے کہا اور پھیلتی گھٹاؤں اور دل ربا موسم کو انجوائے کرنے لگا۔
☆☆☆
کشف نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولا اور سامنے کھڑی پینتیس چالیس سالہ ناہید کو دیکھ کر بے اختیار اس کے ساتھ لپٹ گئی۔
کشف بہت بہادر تھی بلکہ زینب اکثر اسے بے حس بھی کہہ دیتی تھی مگر اس وقت اس کی ساری بہادری، بے حسی اس خوف ناک موسم کے ریلے میں کہیں بہہ گئے تھے وہ ناہید سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگی تھی۔
''کشف...... کشف بچہ! میری بٹی! کیا ہوا ٹھیک تو ہے نا سب کچھ زینب ٹھیک ہے کیا؟'' ناہید اس کے یوں بے اختیار ہونے پہ ڈر گئی تیز تیز پوچھتی چلی گئی۔
''مجھے کیا پتا' کیا ٹھیک ہے۔ کیا غلط ہے۔'' وہ اپنے آنسوؤں پر کچھ خجل سی رخ پھیرتی ناگواری سے بولی تھی۔
''مجھے تو جو ٹھیک لگتا ہے، میں تو وہ کرتی ہوں۔ آنی تو مجھے بچہ سمجھتی ہیں' کبھی کچھ نہیں بتاتیں۔''
زینب کے لیے اس کے دل میں بہت سی شکایتیں بھری تھیں' شاید اسے ماں کی تکلیفوں کا احساس تھا جو وہ اکیلی اس کی خاطر برداشت کر رہی تھی اور اب کشف بھی اسی طرح سے اس کا ساتھ دے کر کم کرنا چاہتی تھی۔
''افوہ تو گھر میں اتنا اندھیرا کیوں کر رکھا ہے شام کے وقت اندھیرا نہیں کرتے گھر میں اور وہ جو تمہاری ماں اوپر کی منزل میں چراغ جلاتی ہے عصر کے بعد' وہ بھی بند پڑا ہے۔''
ناہید نے تابڑتوڑ برستی بارش میں باہر صحن کی طرف سر نکال کر اوپر کی اندھیری منزل کو سر اٹھا کر دیکھا۔
''شاباش ہے آپ پر بھی ناہید خالہ! اتنی بارش، اتنے طوفان میں سو ہزار چراغ جلائیں تو بھی ایک جلا نہ رہے۔ آپ بھی آنی کی کمپنی میں رہ کر انہیں کی طرح خیالی باتیں کرنے لگی ہیں۔'' کشف کچھ اور چڑی۔
''کہاں رہ گئی زینب؟ تم نے فون نہیں کیا۔ اتنی دیر تو اس نے کبھی بھی نہیں لگائی۔'' ناہید کو اس کی فکرستائی تو تشویش سے پوچھنے لگی۔
''کئی بار کر چکی ہوں۔ فون ہی نہیں اٹھا رہیں میرا دل سخت گھبرا رہا ہے۔'' کشف آخر میں رندھی آواز میں بولی۔
باہر بارش اور بادلوں کا شور ابھی بھی ــــ گھن گرج کے ساتھ جاری تھا۔
''لاپروا تو وہ کبھی بھی نہیں رہی، خدا خیر کرے۔ وہ خیریت سے ہو۔ میں جا کر کسی کو بھجواتی ہوں۔ پتا

کرنے۔ اسکول سے تو وہ اپنے ٹائم پر نکل گئی تھی۔ تم لائٹیں تو جلاؤ۔ بجلی گئی تو نہیں۔ باہر سارے میں لائٹیں جل رہی ہیں۔'' ناہید بڑے کمرے کی کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر دیکھ کر بولی۔

''ہماری لائٹ شاید خراب ہو گئی ہے، جل نہیں رہی۔'' کشف روہانسی ہو کر بولی۔ ''اس بابا آدم کے کھنڈر میں کوئی بھی چیز ٹھیک نہیں۔ آخر چیزوں نے عمر خضر تو نہیں لکھوا رکھی کہ کبھی خراب ہی نہ ہوں۔'' وہ جل کر کہہ رہی تھی۔

''فیوز نہ اڑ گیا ہو۔ میں کسی کو بلا کر لاتی ہوں۔'' ناہید فکر مندی سی چادر ٹھیک کرتی باہر جانے لگی۔

''ناہید خالہ! خدا کے لیے آپ مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جائیے گا۔ مجھے واقعی بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ پھر سے اس کے ساتھ چمٹ کر فریادی لہجے میں بولی۔

''افوہ! نہیں جا رہی میں تم پریشان نہ ہو۔'' وہ اس کا چہرہ تھام کر بولی۔

''اور سنو میری بات۔ یہ آج تم نے بتول خالہ سے کیا پنگا لیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے نا، وہ کس خصلت کس نیچر کی عورت ہے پھر بھی تم نے اس کے ساتھ یوں منہ ماری کر لی۔'' تو ناہید کو سارا قصہ معلوم ہو چکا تھا۔

''خیر آج جو کچھ ہوا تھا، وہ ناہید تو کیا اس محلے کے در و دیوار کو بھی خوب سنائی دے چکا ہوگا۔'' اس نے دل میں سوچا۔

''لڑائی انہوں نے شروع کی تھی۔'' وہ دفاعی لہجے میں بولی۔

''اور تم نے تمیز، لحاظ، ادب کی ساری حدود پھلانگ لیں۔'' ناہید غصے سے بولیں۔

''آپ بھی اس عورت کی فیور کریں گی۔'' وہ خفگی سے ناک سکوڑ کر بولی۔

''کشف! تم جانتی ہو ناں، کیچڑ میں پتھر پھینکنے سے کیا ہوتا ہے۔'' ناہید جتا کر بولی۔

''افوہ! یہ آنی کہاں رہ گئیں۔ اب تو بارش بھی کم ہو گئی ہے۔ میں خود جا کر پتا کرتی ہوں۔'' وہ صاف بات ٹالتے ہوئے دوپٹا ٹھیک کرتی باہر جانے لگی۔

''کہاں جاؤ گی اس کا پتا کرنے اور بارش اسی رفتار سے ہو رہی ہے۔ کم نہیں ہوئی۔ ہاں تم اس موضوع سے جان چھڑانا چاہتی ہو تو یہ اتنا آسان نہیں ہے کشف! سمجھو تم نے کانٹے دار جھاڑیوں میں اپنے کپڑے پھنسا لیے ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑیں گے۔'' ناہید تنبیہی انداز میں بولی۔

''افوہ! اب آپ مجھے ڈرائیں گی۔ وہ کون سی چنگیز خان ہے، دیکھ لوں گی میں کسی سے ڈرتی ورتی نہیں ہوں۔'' وہ مصنوعی بے خوفی سے ہاتھ جھاڑ کر کچن کی درازوں میں موم بتی تلاش کرتے ہوئے بولی۔

''خیر اس کا جواب تو تمہیں آنے والے کچھ دنوں میں خود ہی مل جائے گا۔ ابھی تو مجھے زینب کی فکر ہو رہی ہے۔ باہر تم مجھے جانے نہیں دے رہیں تو پتا کیسے کراؤں اس کا جا کر۔ چلو تم میرے ساتھ میری طرف۔ میں سنی کے پاپا کو فون کرتی ہوں۔ شاید وہ راستے میں ہوں گے۔''

''تو میرے فون سے بات کر لیں ناں۔'' ناہید گہرا سانس لے کر اس کے فون پر نمبر ملانے لگی۔

☆☆☆

باہر دو رویہ سڑک پہ دور تک سرخ ہرے پیلے زرد پتوں کی جیسے چادر سی بچھی تھی۔ کچھ پتے گاڑی کی ونڈ اسکرین پر بھی بے حس پڑے تھے۔

تیز چلتی ہوا کی لہر سے وہ تھوڑا سا اپنی جگہ پر ہلتے پھر وہیں ساکن ہو کر ٹھہر جاتے۔

اس نے دستانے اتار کر کوٹ کی جیب میں رکھے اور گاڑی میں بیٹھتے ہوئے چابی سے گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا تھا کہ جیسے تھم سا گیا۔

UrduBooks.pk

''میرو!'' وہ ایک دم سے ٹھٹکا اس نے یونہی گردن گھما کر دائیں اور پھر بائیں دیکھا۔ سب طرف سرد اکیلی ہوا تھی۔

''میرا دل چاہتا ہے جب خزاں ہو اور راستہ پیلے پتوں سے اٹا ہو یخ ہوائیں چل رہی ہوں۔''

''ہم بوینیز ا کے سویٹر پہنیں۔'' اس نے لقمہ دیا۔

''شٹ اپ!'' اس کے رومانس کو اس فضول جملے نے بری طرح سے ڈسٹرب کیا تھا' وہ منہ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔

اس کی کھڑی ناک کی نوک سردی سے سرخ ہو رہی تھی اور سنہری گندمی رنگت میں برف گھل رہی تھی' رخ پھیرے ہوئے بھی اس کے ہونٹوں کے سرخ دہانے اتنے پرکشش لگ رہے تھے کہ اس نے بمشکل ان سے نظریں چرائی تھیں۔

''اچھا بولو ناں آگے' سوری بھئی! تم بھی خواہ مخواہ اکڑ جاتی ہو' خود تو اتنی دیر سے بولے جا رہی تھیں۔ بغیر سانس لیے۔ میں نے ایک جملہ بول دیا۔ تم تو کان پکڑوانے پر اتر آتی ہو۔''

اس کا ہلکے سے سویٹر میں چھپا نازک سراپا کندھوں پہ جھولتی چھوٹی سی شال دونوں بازو سینے پر لپیٹے وہ مکمل حسن کی تصویر بنی کھڑی تھی۔

''تو پکڑو نا کان اگر چاہتے ہو کہ میں لڑائی ختم کروں۔'' وہ اسی طرح رخ پھیرے کچھ اور بھی اکڑ کر بولی۔

''اے...... اے یہ لڑائی کہاں سے آ گئی بیچ میں؟ یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہو گی کہ ہم تم میں لڑائی ہو گئی۔'' اس نے ہاتھ ہلایا جیسے ناک سے مکھی اڑائی ہو۔

''سنو اگر ہمارے درمیان لڑائی ہو گئی۔ لمبی لڑائی تو پلیز تم مجھے منا لینا' اس ناراضی کو بہت طویل نہیں کرنا۔'' وہ ایک دم سے ناراضی بھول کر منت کرنے لگی تھی۔ وہ بس اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''بائی دا وے ہمارے درمیان کبھی لڑائی بھی ہو سکتی ہے۔ کبھی نہیں' تم نے ایسا سوچا بھی کیسے۔'' وہ بظاہر مذاق اڑاتے ہوئے اسے تسلی دے رہا تھا۔

''یہاں کچھ بھی ناممکن نہیں...... دیکھو ناں' جب گرمی ہوتی ہے تو کوئی سوچ سکتا ہے ایسا کٹیلا جما دینے والا جاڑا بھی پڑ سکتا ہے اندھیری رات سے روشن دن بھی نکل سکتا یا اتنے چمکیلے روشن دن کو اندھیری رات کھا بھی سکتی ہے' یہاں تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے میرو۔'' وہ عجیب طرح سے خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگی تھی۔

کچھ لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہیں سکا۔ اس کے لہجے کے شکوک نے اسے بھی ڈگمگا سا دیا تھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہونے والا اور محبت نہ تو موسم ہوتی ہے کہ بدل جائے نہ دن یا رات جو ایک دوسرے میں ڈھل جائے۔ محبت ایک بار دل میں اتر جائے' وجود میں بس جائے تو پھر یہ چٹان جیسی قد آور مضبوط اور ناقابل شکست ہوتی ہے اور میری محبت تو چٹان سے بھی بڑھ کر مضبوط ہے۔'' اس نے بڑے یقین سے دعویٰ کیا تھا۔

''چٹانیں ہی تو ٹوٹا کرتی ہیں بھربھرا کر ٹوٹتی ذروں میں بدلتی سکڑتی جاتی ہیں۔ محبت کو چٹان سے تشبیہ تو نہیں دو میرو! میرا دل تو پہلے ہی بہت اداس ہے۔ آج کل جو کچھ گھر میں چل رہا ہے۔'' وہ ایک دم سے رنجیدہ ہو گئی۔ ڈھیر ساری اداسی اس کی آنکھوں سے چھلکتی پلکوں پہ لرزنے لگی۔

اور یہی لمحہ میرو کے دل پر بھاری ہوتا تھا کہ اس کی سیاہ لانبی لانبی پلکیں لرزیں اور وہ بے بس اپنی جگہ پر کھڑا رہے۔ انہیں ہاتھ بڑھا کر اپنی پوروں میں سمیٹ بھی نہ سکے۔

''ہم یہاں موسم کا مزہ لینے کے لیے نکلے تھے۔ گھر کے ٹینس ماحول سے دور وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے تم نے پھر سے وہی اداسی اور پریشانی کی شال اوڑھ لی۔ جانے دو ناں ابھی ان باتوں کو۔'' وہ نرمی سے اس کی جھولتی

UrduBooks.pk

شال پھر اس کے کندھوں پر ڈالتے ہوئے اس کے قریب ہوا۔

''رومانس کی باتیں کرو تو تم اپنا گھٹیا مزاج لے آتے ہو بیچ میں۔ گھر کی پریشانیوں کی بات کرو تو تمہارا رومانٹک ہونے کو جی چاہنے لگتا ہے۔'' اس نے بڑی صفائی سے خود کو اس سے تھوڑا دور کیا تھا۔

''بہت چالاک ہو تم قسم سے۔'' اس کے یوں فاصلہ بڑھانے پر وہ بے ساختہ ہنسا تھا' شرمیلی سی مسکان تو اس کے چہرے پہ بھی آ گئی تھی۔

معلوم نہیں اسے خود پر اتنا کنٹرول کیسے حاصل تھا۔ میں جانتا تھا اس کے دل میں میری محبت بہت اندر تک جڑیں جمائے ہوئے ہے لیکن اس نے ہمیشہ اسے سرسری ہی ظاہر کیا جیسے یہ چاہت' یہ عشق' جنون فقط میرا ہی درد سر تھا۔'' وہ گاڑی اسٹارٹ کیے تلخی سے سوچتا جارہا تھا۔

''ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ایسے پتوں بھرے زرد راستے پہ چلتے چلے جائیں' چلتے جائیں۔'' وہ اس دن خواب ناک سے لہجے میں تھوڑی دیر بعد کہہ رہی تھی۔

''اوہ یار! کیا فقط چلتے رہیں گے۔ چلا چلا کر تم مار دو گی مجھے۔'' وہ پھر سے اسے چھیڑنے سے باز نہیں آیا مگر شاید وہ اپنے تصور میں پوری طرح سے کھو چکی تھی۔ ''تو کیا تم میرے ساتھ نہیں چلو گے تھک جاؤ گے۔'' وہ دکھی سی ہو کر پوچھنے لگی۔

''تمہارے ساتھ تو میں قیامت تک چلتا رہوں گا' مذاق کر رہا تھا۔'' وہ اسے دیکھ کر جذباتی پن سے یقین دلانے لگا۔

''پتا نہیں میرو! میں کبھی کبھی الجھ جاتی ہوں تمہاری سنجیدگی کہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے تمہارا مذاق ختم ہوتا ہے یا۔'' وہ پھر سے وہی انداز میں اس کی بات پکڑ کر پریشان ہو رہی تھی۔

''اوہ! چھوڑو ان فضول باتوں کو۔ چلو ہم دونوں اس پتوں بھری روش پر لمبی واک پر چلتے ہیں اور اس وقت تک چلتے رہیں گے جب تک تم تھک کر نہیں کہو گی کہ میرو واپس چلیں۔'' وہ ایک دم سے اس کا ننھا سا سرد دودھیا ہاتھ اپنے گرم مضبوط ہاتھ میں پکڑ کر اپنے ساتھ اسے کھینچتے ہوئے تقریباً دوڑنے لگا تھا۔

''پاگل ہو گئے ہو۔ اوہ میرے ہاتھ کا کیا قیمہ کرو گے چھوڑو تو۔'' وہ اس کی مضبوط گرفت پر چلائی تھی' وہ اسے بھگا رہا تھا۔

''ہاں تو موسم بھی ہے نا تمہارے ہاتھ کے قیمے کے کباب بنا کر گھر جا کر کھائیں گے۔ اف کتنا دل چاہنے لگا ہے' ایک دم سے گرما گرم کباب کھانے کو۔'' وہ پھر سے اسے ستا رہا تھا۔

''تم یونہی اسی طرح مجھے تھوڑا تھوڑا کر کے اپنے مزے کے لیے ختم کرتے جاؤ گے۔ مجھے یقین ہے۔'' وہ اس کے ساتھ بھاگتے ہوئے رو دینے کو تھی۔

''کیونکہ تم صرف میری ہو' صرف میرو کی...... میں تمہارے ساتھ جو بھی سلوک کروں' تمہیں اس پر بولنے کا کوئی حق نہیں۔'' وہ اونچی آواز میں منہ اوپر کر کے بول رہا تھا۔

آسمان پر جمع ہوتے بادلوں نے شاید اس کے جھوٹے یقین پہ طنز سے مسکرا کر بوندیں برسانا شروع کر دی تھیں۔

اس نے گاڑی کی چابی باہر نکالی۔ گاڑی لاک کر کے چابی جیب میں ڈال لی۔ گاڑی سے باہر نکل کر سرد ہوا میں دو تین گہرے سانس لیے۔

اس کی نظریں پتوں بھری اس زرد پیلی چادر پر جمی تھیں جو راستے پر دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

وہ دونوں ہاتھ لانگ کوٹ کی جیبوں میں ڈالے سر جھکا کر اس خزاں رسیدہ رستے پہ جو دور تک اکیلا جارہا

UrduBooks.pk

تھا، چل پڑا۔

☆☆☆

"او مائی گاڈ! یہ اتنے لوگ یہاں کیوں جمع ہیں کوئی حادثہ ہو گیا ہے شاید۔" برستی بارش میں بہت سارے لوگوں کو بیچ رستے میں دائرے کی شکل میں ___ دیکھ کر موحد سیدھا ہوا تھا۔

"راستہ بھی بند کر رکھا ہے الو کے پٹھوں نے۔ صاب ان لوگوں کو تو موقع چاہیے۔ کوئی بھلے بندر کا تماشا دکھا رہا ہو یہ فارغ لوگ، گھر بار سے فارغ وہیں مجمع لگا کر کھڑے ہو جائیں گے۔"

رجب علی کو پتا نہیں کس بات پر اتنا طیش آیا تھا موحد نے ایک ناپسندیدہ نظر اس پر ڈالی۔

"تم رکو یہاں۔ میں دیکھتا ہوں۔" اگلے ہی لمحے وہ فیصلہ کر کے برستی بارش میں رجب علی کے روکنے کے باوجود اتر کر ہجوم کے اندر گھس چکا تھا۔

زینب اسی طرح سڑک کے بیچوں بیچ بے ہوش پڑی تھی۔ کوئی بھی آگے بڑھ کر اسے اٹھانے یا کسی قریبی میڈیکل سینٹر تک پہنچانے کے لیے مستعد نظر نہیں آ رہا تھا۔

موحد کو طیش تو بہت آیا۔

"کیا ہوا ہے انہیں؟" اس نے اونچی آواز میں پوچھا تھا۔

"بے ہوش ہے نظر نہیں آ رہا۔" کوئی چلایا تھا۔

موحد نے مڑ کر رجب علی کو گاڑی سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

"یہ آپ کی کون ہے جناب؟" کسی نے اس کی مستعدی دیکھ کر کچھ متاثر ہو کر پوچھا۔

"اے بھائی کون ہو تم اور اسے کہاں لے کر جا رہے ہو۔" کسی نے موحد کا کندھا پیچھے سے کھینچا تھا۔

"ہاسپٹل لے کر جا رہے ہیں، جس کی اللہ نے شاید آپ لوگوں کو توفیق نہیں دی۔" اس نے کندھا چھڑا کر چلا کر جواب دیا تھا۔

دوسرے لمحے وہ زینب کو گاڑی میں ڈال کر قریبی ہاسپٹل میں لے جا رہا تھا۔ باہر ہجوم چھٹنے لگا تھا۔

مفت کا تماشا جو ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

آذر عجلت بھرے انداز میں آفس ٹیبل سے اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے میز پر پڑے فون کی بجتی گھنٹی پہ فون ایک ہاتھ سے کان سے لگائے دوسرے ہاتھ سے بیگ اٹھاتے بے اختیار چونکا۔

"کیا؟" وہ لمحہ بھر کو ساکت رہ گیا تھا۔

"کہاں؟" اس کی ڈوبی ہوئی آواز ابھری تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں آتا ہوں، دس منٹ میں پہنچتا ہوں۔" کہہ کر فون بند کر کے لمحہ بھر پریشان سا کھڑا رہ گیا۔

پھر سر جھٹک کر اپنا بیگ اٹھا کر فون پر کوئی نمبر ملا کر کال ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

"ہاں رضی! مجھے ذرا ضروری کام سے جانا پڑ گیا ہے۔ اٹس ارجنٹ۔ تو اگر جمال الدین کا فون آئے یا وہ خود آ جائیں تو پلیز میری طرف سے ایکسکیوز کر لینا۔ کل نہیں بلکہ پرسوں مارننگ پہلی میٹنگ ان ہی کے ساتھ سیٹ کر لینا۔ اوکے۔" کہہ کر فون بند کرتا تیزی سے باہر نکل گیا۔ پریشانی اور عجلت اس کے چہرے پر عیاں تھی۔

اس کا فون گاڑی تک پہنچنے میں دوبارہ پھر سے بجا، وہ فون کو سائلنٹ پر لگا کر گاڑی میں بیٹھا تھا

UrduBooks.pk

☆☆☆

کشف کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ کھڑے سے جیسے گرنے لگی تھی۔ ناہید نے اسے اپنے ساتھ لگا کر سہارا دیتے ہوئے کرسی پہ بٹھایا۔

''سہیل! آپ نے اچھی طرح دیکھا ہے جا کر۔ لوگوں سے معلوم کیا ہے۔ کچھ تو پتا چلا ہوگا زینب کا۔'' ناہید بھی سخت پریشان ہوگئی۔

سہیل نے ایک نظر کشف کی حالت پر ڈالی۔

''جہاں بھی ممکن ہو سکتا تھا۔ اور جس سے بھی میں معلوم کر سکتا تھا۔ اسکول بھی چکر لگا آیا ہوں۔ کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں میری حالت تو دیکھو تم سارے کپڑے نچڑ گئے ہیں۔'' اس کے کپڑوں سے ابھی بھی پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ کشف دوپٹا لے کر تیزی سے جانے لگی۔

''فار گاڈ سیک کشف! تم تو خود کو سنبھالو۔ اس وقت کہیں نہیں جاؤ۔ یوں بھی باہر بہت پانی اکٹھا ہو چکا ہے۔'' ناہید اسے زبردستی پکڑتے ہوئے بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''تو کیا گھر بیٹھ کر خدانخواستہ کسی بری خبر کا انتظار کروں؟ ناہید خالہ! یہ تو مجھ سے نہیں ہوگا اور پانی جتنا بھی اکٹھا ہو جائے۔ کیا یہ منظر یا مشکل میں پہلی بار دیکھوں گی۔ ایسے ہی موسموں میں ایسی ہی سختیوں میں پل کر بڑی ہوئی ہوں۔ یہ چیزیں مجھے کیا ڈرائیں گی۔''

وہ پوری طاقت سے خود کو ناہید سے چھڑا کر بولی۔

''جذباتی مت بنو۔ تم کہاں جاؤ گی؟ کہاں تلاش کرو گی؟ میں سب طرف معلوم کر آیا ہوں۔ ہاں اس کی کسی دوست جس کے گھر یا ساتھ وہ ایسے میں جا سکتی ہے۔ اس کا مجھے بتاؤ۔ میں معلوم کر آتا ہوں۔'' سہیل نے بھی اسے ذرا سختی سے ٹوکا۔

''سہیل انکل! ناہید خالہ! آپ دونوں کا بہت شکریہ۔ میں اس سے زیادہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتی۔'' کشف کی طبیعت کتنی اکھڑ اور ضدی ہے۔ اس کا کچھ اندازہ تو ناہید کو تھا مگر وہ ایسے موقع پر بھی اکھڑ جائے گی اور اگر وہ اکیلی باہر نکل جاتی ہے۔ زینب واپس آ گئی تو وہ اسے کیا جواب دے گی۔

''تم شکریہ تو ہم دونوں کا بعد میں ادا کرنا جب زینب گھر آ جائے گی۔ اب تم جہاں بھی جاؤ گی یا جانے کا ارادہ رکھتی ہو، میں تمہارے ساتھ ہی جاؤں گی۔ سہیل! آپ گھر جا کر چینج کر لیں۔ اگر اس دوران زینب گھر آ جاتی ہے تو آپ پلیز مجھے فون پر بتا دیجیے گا۔''

ناہید کشف کا ہاتھ پکڑ کر چلنے کو تیار تھی۔

''اچھا تو میں کیا جھک مار کر آیا ہوں اور تم دونوں کے پاس کون سا خاص عمل ہے جس سے تم اسے تلاش کر لو گی۔ کوئی ضرورت نہیں ایسے موسم میں یوں باہر جانے کی۔''

سہیل کی مردانگی پر شاید چوٹ پڑی تھی۔ وہ درشتی سے بولا۔

''ہاں کشف! وہ بھی تو ہیں تمہاری امی کے رشتہ دار، وہ جو اخبار کے آفس میں کام کرتے ہیں تم ان سے معلوم کرو، مجھے یاد آیا' کل زینب مجھے بتا تو رہی تھی۔ اسے اپنی کتاب کے سلسلے میں ان سے آج کل میں ملنے جانا تھا۔'' ناہید پر سہیل کی تندی کا تو کچھ اثر نہیں ہوا' ہاں ایک خیال اسے سوجھ گیا۔

''اور یہ بات میں نے کیوں نہیں سوچی؟'' تیزی سے انکل حیدر کا نمبر ملاتے ہوئے کشف نے خود کو کوسا۔

''اور مجھے بلال کو ہی فون کر لینا چاہیے تھا۔ خوامخواہ ان دونوں کو پریشان کیا۔'' دوسری طرف بیل جانے کے دوران وہ اپنی عقل کو کوستی رہی۔

Monthly Shuaa October 2018

UrduBooks.PK

"آنی تمیں آپی آپ کے آفس...... پھر واپس چلی گئیں پانچ بجے سے پہلے۔" وہ سن کر بھونچکا رہ گئی۔
"کیا ہوا؟ زینب ٹھیک تو ہے نا' کیا وہ گھر نہیں پہنچی ابھی تک۔" دوسری بار حیدر کے اونچا اونچا بولنے پر کشف کو ہوش آیا۔
حیدر انکل کی فکر مند مشفق آواز سن کر اتنی دیر سے جو دل کو سنبھال رکھا تھا۔ اس کے ضبط کے پیمانے ٹوٹنے لگے۔
"نہیں' نہیں حیدر انکل۔" وہ گھٹی آواز میں بامشکل بول پائی۔
"تم پریشان نہیں ہو...... میرے خیال میں موسم خراب ہونے کی وجہ سے وہ کچھ دیر کے لیے کہیں رک گئی ہو گی۔"
وہ ٹھہر ٹھہر کر اسے سمجھانے والے انداز میں نرمی سے بولے۔
"کچھ دیر انکل!" وہ ضبط کھو کر بولی۔ "بارش بھی رک چکی ہے اب تو اور موسم بھی ٹھیک ہے۔ ایسا کچھ ہوتا تو وہ گھر پہنچ چکی ہوتیں اب تک۔"
کوشش اور ضبط کے باوجود آنسو گالوں پہ پھسل پڑے تھے۔
حیدر سے جواب میں فوری طور پہ کچھ نہیں بولا گیا۔
"رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں میں۔ کال تو کی ہو گی تم نے بھی۔" وہ کچھ دیر بعد یہی کہہ سکے۔
"کئی بار کر چکی ہوں پہلے تو بیل جا رہی تھی پھر شاید فون ہی بند ہو گیا۔ انکل! میرا دل اب بری طرح سے گھبرا رہا ہے۔ آنی اگر ٹھیک ہیں۔" آگے اس سے بولنا مشکل تھا۔
"کشف بیٹا! حوصلہ کرو میں بلال کو بھیجتا ہوں۔" وہ اس کی پریشانی پر کچھ بوکھلا سے گئے تھے۔ "بلکہ میں خود کوشش کرتا ہوں۔ آفس سے اٹھ کر آ جاؤں تمہاری طرف۔"
"اس کی ضرورت نہیں ہے انکل!" اس نے دوسرے لمحے خود کو سنبھالا اور ہاتھ کی پشت سے چہرہ رگڑ ڈالا۔
"اسے یوں خود کو کمزور ظاہر نہیں کرنا۔" اس نے دل میں خود کو جھڑکا۔
"آپ فکر مند نہیں ہوں۔ میں خود جاتی ہوں بلکہ آنی کی کولیگز کو فون کر کے پوچھتی ہوں' شاید کچھ پتا چل سکے تو پھر میں آپ کو فون کروں گی۔"
وہ چند لمحوں میں حیرت انگیز طور پر خود کو سنبھال کر بالکل نارمل کر چکی تھی۔ سہیل نے کچھ ناگواری سے پہلے بیوی کو اور پھر کشف کو دیکھا۔
"تم چل کر مجھے کپڑے تو نکال دو دوسرے یا مجھے بیمار کر کے ہی تمہیں اچھا لگے گا۔" وہ چڑے ہوئے انداز میں کہہ کر ناہید کا جواب سنے بغیر بیرونی دروازے کی طرف مڑ گیا تھا۔
ناہید فوری طور پر فیصلہ نہیں کر پائی کہ وہ سہیل کو روکے یا اس کے پیچھے جائے۔
کہتے ہیں عورت کو سمجھنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ کتنی بڑی بکواس بات ہے یہ ورنہ مرد کو سمجھنے میں عورت اپنی پوری جوانی' پوری زندگی بھلا بیٹھتی ہے پھر بھی مرد کے مزاج کو مکمل طور پر نہیں سمجھ پاتی۔
ابھی کچھ دیر پہلے تک ناہید کو لگ رہا تھا سہیل سے بڑا انسانیت کا ہمدرد اور کشف کی فکر کرنے والا کوئی نہیں اور اب؟
"ناہید خالہ! آپ جائیں میں آنی کی کولیگز کو کال کرتی ہوں اور ہو سکتا ہے' انکل بلال کو بھی بھجوا دیں' میں اس کے ساتھ جا کر پتا کر آؤں گی۔" اس نے نرمی سے پریشان کھڑی ناہید سے کہا وہ کچھ کہنا چاہتی تھی پھر یونہی سر ہلا کر گہرا سانس لے کر جانے لگی۔

Monthly Shuaa October 2018

UrduBooks.pk

''میں کچھ دیر بعد پتا کرنے آؤں گی اگر زینب آجاتی ہے تو مجھے اطلاع کروا دینا۔'' وہ دروازے کے پاس جا کر بولی۔

''جی ضرور کیوں نہیں۔'' ناہید کے جاتے ہی کشف کا اکیلے پن اور اندھیرے کا خوف عود کر آ گیا۔

بڑے کمرے میں جلتی اکلوتی موم بتی کی محراب تھرتھرانے لگی تھی۔ اوپری منزل میں رکھے دیوں میں ہمیشہ بتی اور تیل موجود ہوتا تھا زینب کبھی بھی یہ دونوں چیزیں کمیاب، نہیں ہونے دیتی تھی مگر اوپر جانے کا حوصلہ کس میں تھا۔

''میں ابھی کسی کو بھجواتی ہوں آ کر تو تمہاری بتی کا فیوز چیک کر دیتا ہے، یہ ساتھ والوں کا جگنو کافی اچھا کام جانتا ہے بجلی کا۔ اس کو بھجواتی ہوں۔'' ناہید کو دروازے تک جا کر پھر سے خیال آیا تھا۔ تھوڑا اندر آ کر اسے حوصلہ دینے والے انداز میں کہہ کر جانے لگی۔

''نہیں، نہیں جگنو کو نہیں بھجوانا۔ بالکل بھی نہیں۔'' وہ بولتے ہوئے ناہید کے پیچھے گئی مگر وہ اس وقت تک جا چکی تھی۔

''کیا مصیبت ہے اگر وہ آ گیا بری فلم کا ہیرو تو اپنے گھٹیا رومانس سے دماغ چاٹ جائے گا میرا اور جو میں نے اس کا پیر زخمی کیا تھا صبح میں......؟ آ جائے میں دروازہ ہی نہیں کھولوں گی۔'' وہ دروازہ بند کرتے ہوئے عزم سے بولی۔

اسی وقت اس کا فون بجنے لگا۔

اس نے تیزی سے میز پر پڑا فون جھپٹ کر اٹھایا۔

دوسری طرف کوئی اجنبی بھاری سی آواز اور اجنبی سا لہجہ تھا فوری طور پر وہ سمجھ نہیں سکی، وہ اس سے کیا پوچھ رہا ہے۔

''آر یو کشف؟ خوب صورت ایکسنٹ کے ساتھ لیا گیا اس کا نام کشف کو چونکا گیا۔

''کون؟''

جواب میں دوسری طرف سے جو کہا گیا' وہ سنتے ہی کرسی کو تھامتے ہوئے اس پر بیٹھتی چلی گئی۔

اسے یہ خیال تو بھول کر بھی نہیں آیا تھا کہ زینب کہیں سڑک کے کنارے بے ہوش ہو کر گر بھی سکتی ہے۔

اس کی اتنی عزم و حوصلے والی بہادر ماں۔ جس کی آنکھ میں اس نے اداسی کے بادل کے سوا کبھی کوئی مایوسی کی بارش نہیں دیکھی۔ وہ یوں بے بسی کی حالت میں سڑک کے کنارے گری ہو گی۔

اس کا دل چاہا' وہ دھاڑیں مار مار کر روئے' وہ جو ہر وقت زینب سے جھگڑتی تھی اور اسے لگتا تھا اسے عام بچوں کی طرح اپنی ماں سے ویسی محبت ویسی انسیت نہیں ہے جیسی ایک سنگل پیرنٹ کے بچے کو ہوتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو اسے لگتا تھا شاید وہ زینب کو سخت ناپسند کرتی ہے مگر اس لمحے اس کے یوں خدانخواستہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے کے خیال سے ہی اسے لگا اس کا دل بند ہو جائے گا۔

وہ فون یونہی رکھے' بس روئے جا رہی تھی جیسے زینب اس کے سامنے ہے اور وہ اس کی حالت دیکھ کر خود پر بند نہیں باندھ پا رہی۔

فون سے ابھرنے والی ہلکی سی آواز نے اسے یاد دلایا کہ سامنے والا ابھی لائن پر ہے۔

''پتا نہیں آنی کہاں ہیں میں نے پوچھا بھی نہیں۔'' اس نے تیزی سے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔

دوسری طرف سے لائن بے جان ہو چکی تھی۔

جس وقت وہ فرصت سے رونے کا شغل جاری رکھے ہوئے تھی بتانے والے نے اکتا کر فون ہی بند کر دیا

UrduBooks.pk

تھا۔
وہ جلدی سے نمبر ڈائل کرنے لگی۔
اور ساکت سی رہ گئی۔اس کے فون میں اتنا کریڈٹ ہی نہیں تھا کہ وہ کال بیک کر کے اپنی ماں کا پتا ہی معلوم کر سکے۔
''بالکل ٹھیک کہتی ہیں آنی! منزل کو سامنے دیکھ کر ہاتھ پیر چھوڑ دینے والے لوگ ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔'' ماں پاس نہیں تھی تو اس کی ہر نصیحت ہر بات جسے وہ اس کے سامنے ایک کان سے سنتی تھی دوسرے سے نکال دیتی تھی' اب زیر زبر کے ساتھ یاد آ رہی تھی۔
وہ اپنا بیگ اٹھا کر اس کی تلاشی لینے لگی کہ فون میں کریڈٹ ڈلوا سکے' اس کے بیگ سے صرف بیس روپے کا ایک نوٹ نکل سکا تھا۔

☆☆☆

زینب نے نیم ملگجی روشنی میں آنکھیں کھول کر اجنبی نظروں سے در و دیوار کو دیکھا۔
فوری طور پر اسے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا وہ کہاں ہے ایک لمحے کو تو اسے لگا شاید وہ اپنے گھر میں ہی ہے۔
''کشف!'' اس نے ذرا سا اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کمزور آواز میں کشف کو پکارا تھا۔
اس کے سر میں درد کی لہر سی اٹھی تھی۔اس نے بے اختیار سر کے پچھلے حصے کو چھو کر جیسے اس درد کو محسوس کرنے کی کوشش کی تھی۔
اسی وقت موحد ہاتھ میں جوس کا گلاس لیے اندر آیا۔زینب کو اٹھتا دیکھ کر اس نے طمانیت بھرا گہرا سانس لیا تھا
''کیسی ہے اب آپ کی طبیعت؟ کچھ بہتر فیل کر رہی ہوں گی یقیناً۔'' اس کے دوستانہ لہجے کے باوجود زینب اپنے آپ میں جیسے سمٹی تھی۔
اس نے غیر ارادی طور پر اپنے دوپٹے کو اپنے گرد لپیٹنا چاہا تو جسم پر موجود کپڑوں نے اسے چونکا دیا۔
''یہ، یہ کپڑے میرے تو نہیں۔'' ذرا سا غور کرنے پر ہی اس کو اندازہ ہو گیا تھا' پریشان لہجے میں بے ساختہ بول اٹھی۔
''اور یہ مجھے کس نے پہنائے؟''
وہ ایک دم بہت زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔
اس وقت ایک ادھیڑ عمر عورت ٹرے میں کچھ اسنیکس لے کر لے آئی اور زینب کے بیڈ کے آگے تپائی کھینچ کر رکھنے لگی۔
''آپ کے تو جی سارے کپڑے گیلے ہوئے پڑے تھے' کچھ دیر اور پہنے رکھتیں تو رات تک خدانخواستہ نمونیہ ہی ہو جاتا۔ میں نے ہی بدلے تھے آپ کے کپڑے' بے ہوش جو تھیں آپ۔'' وہ عورت روانی سے بولتی چلی گئی۔
زینب کچھ اور بھی الجھ گئی۔
''اللہ معاف کرے۔کیا زمانہ آ گیا ہے یہاں کوئی مرتے کو پانی نہیں پلاتا نفسا نفسی کا عالم ہے۔بس اپنی جان بچے۔دوسرے جائیں بھاڑ میں خدا نے ڈاکٹر صاحب کو آپ کے لیے رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیجا جو آپ کو سڑک سے اٹھا کر یہاں لائے۔''

UrduBooks.pk

وہ عورت بولنے کی شوقین لگتی تھی۔ پلیٹ میں اسنیکس اور جوس زینب کے آگے رکھتے ہوئے مسلسل بولے جارہی تھی۔

''بس شکریہ جمیلہ آنٹی! میں انہیں سمجھا دیتا ہوں ساری بات' بلکہ میں نے ان کے گھر فون بھی کیا ہے۔ شاید کوئی آتا ہی ہوگا۔''

ڈاکٹر موحد نے اپنا کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے زینب کو گویا تسلی دینے والے انداز میں سنایا تھا۔

اور زینب کو جیسے کسی فلمی سین کی طرح وہ سارا منظر یاد آنے لگا کس طرح وہ جس بھری دوپہر میں حیدر بھائی کے آفس سے نکلی تھی اور گھر کے باہر والے چوک پر بس سے اترتے ہوئے گر کر بے ہوش ہوگئی تھی۔

''کشف میرا انتظار کررہی ہوگی۔ مجھے جانا ہے۔'' وہ جلدی سے گھبرائے ہوئے انداز میں بستر سے نیچے اترنے لگی۔

''پلیز آپ ابھی لیٹی رہیں۔ آپ کا بی پی اتنا لو ہے کہ مجھے لگتا ہے' آپ کا زندہ بچ جانا ہی کسی معجزے سے کم نہیں۔'' موحد نے بے اختیار اس کا ہاتھ ذرا سا پکڑ کر چھوڑتے ہوئے اسے پھر سے لیٹنے کو کہا۔

''نہیں' نہیں۔ مجھے گھر جانا ہے۔ میں مزید نہیں رک سکتی۔ میری بیٹی میرا انتظار کررہی ہوگی۔ اتنا وقت ہو گیا مجھے۔''

''ڈاکٹر...... ڈاکٹر ہیں آپ؟'' بولتے بولتے اسے اچانک خیال آیا تو کچھ جھجک کر پوچھنے لگی۔

وہ جواب میں فقط مسکرایا تھا۔

''یہ پلیز تھوڑا سا جوس پی لیں اور ساتھ میں یہ ایک سینڈوچ لے لیں میرے خیال میں آپ نے صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا جس کی وجہ سے آپ کا بلڈ پریشر اتنا گر گیا اور مجھے آپ کے سر کے پچھلے حصے کی چوٹ بھی چیک کرنی ہے جو گرنے کی وجہ سے لگی ہوگی۔'' زینب نے غیر ارادی طور پر پھر سے اپنے سر کے پچھلے حصے کو چھوا۔

''نہیں...... زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ اب ٹھیک ہے۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''پلیز۔'' موحد اب اسے جوس پیش کررہا تھا۔

''آپ......!'' وہ شاید اس کا نام پوچھنا چاہ رہی تھی۔

''موحد...... ڈاکٹر موحد احمد!'' وہ حسب عادت ہلکا سا مسکرا کر بولا۔ تو لمحہ بھر زینب اسے دیکھتی رہ گئی۔

نہ جانے دل نے کیوں ایک دھڑکن مس کی تھی۔ کچھ ہوا تھا جو اس سارے کے دوران الگ سا تھا۔ نہ برا نہ اچھا۔ بس الگ سا!

''آپ یہ لیں ناں آنٹی!'' وہ کچھ جھجک کر بولا تو وہ بھی کچھ سوچ کر ہلکا سا مسکرائی۔

''بہت شکریہ' آپ کا بیٹا! اللہ آپ کو جزائے خیر دے اور اس نیکی کا اچھا بدلہ دے ورنہ بہت سارے لوگ کسی مرتے کو دیکھ کر نظریں چرا کر گزر جاتے ہیں۔ وہ موت کے منہ میں جانے والا شخص اگر وہ اسے بچانے کی کوشش کریں گے تو شاید اس کے گلے ہی پڑ جائے اس لیے ایسے موقع پر لوگ کترا کر گزر جاتے ہیں اور میرے خیال میں ٹھیک ہی کرتے ہیں۔'' وہ جیسے خود سے باتیں کررہی تھی۔ گہرا سانس لے کر دو گھونٹ جوس پی کر گلاس واپس رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ اسے زور کا چکر آیا تھا اس نے جیسے اندھیرے میں کچھ تھامنا چاہا۔

موحد نے اسے ہاتھ پکڑ کر بے اختیار سہارا دیا تھا۔

''بالکل بھی ٹھیک نہیں کرتے اگر سب ہی لوگ اس طرح سے سوچنے لگیں تو پھر انسانی معاشرہ ایک زندہ لاش بن جائے۔ گلی سڑی' بدبو دینے والی' زندہ لاش۔''

وہ اسے سہارا دے کر پھر سے بٹھا رہا تھا۔ زینب کو وہ بہت اچھا لگا۔

UrduBooks.pk

''ٹھیک کہا تم نے اور اس معاشرے کے زندہ رہنے کی ایک وجہ آپ جیسے لوگ بھی ہیں ڈاکٹر موحد......میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔ شاید ہماری سوسائٹی کا مزاج ہی کچھ ایسا ہو گیا ہے۔'' گھڑی پر نظر پڑتے ہی وہ پھر سے بے قرار ہوئی تھی۔

''بیٹا! مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میری بیٹی واقعی پریشان ہو رہی ہو گی۔ آپ مجھے یہاں سے ٹیکسی یا رکشہ کروا دیں۔ میرا بیگ تھا۔''

اس نے متلاشی نظروں سے دیکھا تو بیڈ کے ایک طرف اس کا بیگ پڑا تھا۔ وہ بیگ اٹھانے لگی۔

''سوری آپ کی اجازت کے بغیر......ظاہر ہے آپ کی فیملی سے کانٹیکٹ کرنے کے لیے مجھے کوئی کلیو تو چاہیے تھا آپ کے فون کے لیے میں نے آپ کا بیگ کھولا تھا' مگر آپ کا فون۔'' اس نے کچھ شرمندہ سے لہجے میں اس کا فون اس کے ہاتھ میں دیا تو وہ ہنس پڑی۔

''ہاں کشف کہتی ہے۔ مجھے آثار قدیمہ کے کسی عجائب گھر میں اس فون کو رکھوا دینا چاہیے۔ یہ اس کمپنی کا پہلا ماڈل تھا جسے بند ہوئے بھی سال ہو گئے۔ کشف کو سوچ کر اس کے چہرے پر روشنی سی چمکی تھی۔

موحد نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔

''آپ کی بیٹی ہیں؟''

''جی......ایک ہی بیٹی ہے میری' مجھے اس دنیا میں سب سے پیاری......اب تو میں بہتر ہوں جا سکتی ہوں۔'' وہ بیگ کندھے پہ ڈال کر جانے کو تیار تھی۔

''مگر یہ آپ کے کپڑے' میں کیسے واپس بھجواؤں گی؟'' خیال آتے ہی وہ کپڑوں کو دیکھ کر پریشان سی ہو گئی۔

''نو پرابلم۔ بلکہ اس شاپنگ بیگ میں آپ کا ایڈریس بھی ہے۔ آیئے میں آپ کو اپنے ڈرائیور کے ذریعے بھجوا دیتا ہوں۔'' اس نے دیکھ لیا تھا' زینب اب نہیں رکے گی وہ اسے کپڑوں والا شاپنگ بیگ تھماتا ہوا بولا۔

''ایکچوئلی میں خود آپ کو ڈراپ کر آتا مگر مجھے یہاں کے رستوں کا زیادہ علم نہیں۔ یہ نہ ہو رات بھر آپ کو سڑکوں پہ بھٹکاتا رہوں۔'' وہ پھر سے اسی اپنائیت بھری مسکراہٹ سے بولا تھا۔

وہ دوسری بار چونکی تھی۔

''آپ کہیں باہر سے ہیں۔ آئی مین؟'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیسے یہ بات پوچھے۔ اس کو عجب طرح سے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ دل کی دھڑکن تیز تیز چلنے لگی تھی۔

''کہیں یہ وہی تو نہیں۔'' اس کے اندر دھیما دھیما شور سا مچنے لگا۔

''ہاں۔ میں ایکچوئلی کینیڈا سے بی لونگ کرتا ہوں مگر پچھلے چھ ماہ سے میں ایشیا میں ہوں اور تقریباً ڈھائی ماہ سے یہاں پاکستان میں۔ اچھا لگا ہے مجھے یہ ملک بہت زیادہ۔'' وہ عادتاً مسکراتا ہوا اسے بتا رہا تھا اور زینب گم صم' یک ٹک اس کو دیکھتی جا رہی تھی۔ اس کے یوں مسلسل دیکھنے پہ موحد بھی لمحہ بھر کو چونکا تھا۔

''آر یو او کے میم؟'' وہ کچھ تشویش سے بولا۔

''وہ یونہی سر ہلا کر نقاہت سے دو قدم چلی۔

''تمہارے......آپ کے والد ہیں نا......آئی مین حیات ہیں نا؟'' پتا نہیں اسے کیا خیال آیا تھا جو واپس پلٹ کر اس سے مضطرب لہجے میں پوچھنے لگی۔

''الحمد للہ میم!'' اس نے بڑے پرزور انداز میں یقین دہانی کرائی تھی۔ وہ بس اسے دیکھتی رہ گئی۔

UrduBooks.pk

پھر گہرا سانس لے کر شکست خوردہ سی سر جھکا کر اپنے پیروں میں پڑی سیل میں خریدی ہوئی چپل کو دیکھنے لگی جس کے اسٹریپ بارش میں بھیگنے کی وجہ سے بس نکل جانے کے قریب تھے۔

''نام ...... نام کیا ہے ان کا؟'' اس کے دل پر بڑا بھاری پتھر آ پڑا تھا۔ بمشکل سانس نکال کر اس نے پوچھا تھا۔

''مجھے لگتا ہے آپ میرے والد کو جانتی ہیں۔'' وہ پر اشتیاق لہجے میں بولا۔ آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ اور زینب کا اضطراب!

جیسے ایک سانس لینے کے دوران دوسری سانس نکلنے کا وقت بڑھ جائے تو اس سے اگلی سانس نہیں آیا کرتی ...... کچھ ایسا ہی لمحہ بھر کو اسے بھی لگا تھا۔

''نام ...... ان کا معلوم ہو تو شاید۔'' وہ خشک لبوں پر یوں زبان پھیر کر بولی جیسے صدیوں سے پیاسی ہو۔ حلق میں کانٹے سے اگے ہوں۔

''محمود الحسن!'' وہ حسب عادت مسکرا کر بولا تھا۔

اور زینب کو یوں لگا دل پر پڑا وہ بھاری بھرکم پتھر بھاپ بن کر کہیں فضا میں تحلیل ہو گیا ہو۔

''آپ پلیز' مجھے کسی رکشہ یا ٹیکسی میں بٹھا دیں ڈاکٹر صاحب۔'' وہ دوسرے لمحے متوازن لہجے میں بولی تو موحد سر ہلا کر مسکرایا۔

پھر ایک لکھا ہوا کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ کیا ہے؟'' زینب ناسمجھی سے بولی۔

''آپ کے لیے میڈیسن لکھی ہیں۔ آپ کو ان کی اشد ضرورت ہے بلکہ آپ کا مکمل چیک اپ بھی ہونا چاہیے اور آپ کو اپنی صحت کے معاملے میں تھوڑا کیئرفل ہونا چاہیے۔'' وہ پروفیشنل لہجے میں بتاتے ہوئے نسخہ اس کی طرف بڑھا کر بولا۔

وہ نسخہ لیتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی۔

''کسی نے بہت زمانوں بعد دھیان دلایا کہ مجھے بھی اپنا خیال رکھنا چاہیے۔ شکریہ بیٹا بہت آپ کے احساس، آپ کے خیال کا۔''

بہت ہی نرمی سے اس پر شفقت بھرا ہاتھ رکھ کر وہ اس کے پاس سے گزر کر باہر نکل گئی۔ موحد چند لمحے یونہی کھڑا رہا پھر اس کے پیچھے چلا گیا۔

☆☆☆

''بھئی اسی نمبر پر کال بیک کر دو ناں' جہاں سے فون آیا تھا۔ زینب آنٹی کے لیے۔'' بلال باہر نکلتے ہوئے کچھ جھلا کر بولا۔

''وہ میرا فون گڑبڑ کر رہا ہے۔ کال نہیں ہو رہی۔'' وہ کچھ گڑبڑا کر بولی۔

''دکھاؤ مجھے' میں چیک کروں۔'' بلال نے اس کے ہاتھ سے فون خود ہی لے لیا۔ وہ منع کرتے ہوئے کچھ بولنے سے رک گئی۔

وہ خود ہی کال لسٹ میں سے لاسٹ کال دیکھنے لگا۔ اجنبی نمبر دیکھ کر اس نے نمبر ملا کر فون کان سے لگایا۔

''تمہیں بتایا ناں۔ میرا فون ہینگ ہو جاتا ہے آج کل تنگ کرنے لگا ہے سوچ رہی ہوں کسی دن ٹائم نکال کر چینج کر لوں اسے۔'' وہ کمزور لہجے میں بولتی جا رہی تھی۔

ناکافی کریڈٹ کا اعلان ہونے کے بعد فون خاموش تھا۔

UrduBooks.pk

بلال نے وہ نمبر اپنے فون پر ڈائل کیا اور فون کرنے لگا۔ اسی وقت بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ کشف نے دوڑ کر دروازہ کھولا اور سامنے کھڑی زینب کو دیکھ کر بے اختیار اس سے لپٹ کر سسکنے لگی۔

☆☆☆

آزر ردا کو اپنے ساتھ لگائے گھر میں داخل ہوا تھا۔ جہاں طاہرہ بیگم بے قراری تسبیح ہاتھ میں لے بیٹھی تھیں اور فکر مند نظریں دروازے پر جمی تھیں۔

سونیا تو یوں چوکھٹ کے ساتھ لگ کر بے جان چہرہ اور جسم وجان لیے کھڑی تھی جیسے ابھی اسے کوئی ہاتھ لگائے گا اور اس کی روح پرواز کر جائے گی۔ خالی وجود دروازے میں ڈھیر ہو جائے گا۔

حمزہ اور رمشا ماں اور دادی کا ساتھ دینے کے لیے تھوڑا فکر مند' تھوڑے بیزار اور اکتائے ہوئے حالت انتظار میں بیٹھے تھے۔

آزر کو دیکھتے ہی تینوں اپنی جگہ سے اٹھے تھے۔ سونیا تو اسی طرح پتھر کی بت بنی ساکت کھڑی تھی۔

طاہرہ نے ردا پر اپنی تسبیح پر پڑھا ورد پھونک کر بے قراری سے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا جس کے چہرے کا خون جیسے نچڑا ہوا تھا۔

کہاں...... کہاں رہ گئی تھی۔ یہ شام سے یہ وقت آ گیا۔ کانپ کانپ لرز کر سمجھ آدھی جان میری اور اس کی ماں کی تو نکل ہی چکی۔ بھلا بتاؤ یہ کون سا وقت ہے دفتر سے چھٹی کا یہ طاہرہ غصے رنج اور فکر میں بولتے ہوئے کبھی ردا کا بغور جائزہ لیتیں کبھی آزر کا اور کبھی پتھر بنی سونیا کا۔

سونیا! کیا ہوا ہے۔ ردا ٹھیک ہے۔ گاڑی بارش کی وجہ سے بند ہو گئی تھی۔ یہ گھبرا گئی تھی اب ٹھیک ہے سب۔ آزر گویا اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

سونیا ردا کو سامنے کر کے بے یقین سی نظروں سے دیکھنے لگی۔

اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیے سرد نظروں سے اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

''اتنی دیر اس نے کیوں لگائی۔ مگر دیر ہو جاتی تو اسے کچھ اندازہ ہے کیا ہو سکتا تھا۔'' کانپتی آواز میں سونیا جیسے سرگوشی میں بول رہی تھی۔

طاہرہ نے اسے الجھ کر دیکھا۔

''کیا کہہ رہی ہے یہ سونیا! اس کی پریشانی کا تو عجب ہی ڈھب ہے مانو پتھر میں ڈھل جاتی ہے، تین بچوں کی ماں ہو تھوڑا دل کو مضبوط کرو۔ گھر سے باہر نکلتے ہیں تو اونچ نیچ ہو جاتی ہے۔ طاہرہ جتانے والے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

''اور جو میں منع کرتی ہوں اس طرح لڑکیوں کے گھر سے نکلنے کو بھی پڑھ لکھ لیا کالج یونیورسٹی سب سے علم سمیٹ لیا تو کیا تک بنتی ہے اب دفتروں میں مارے مارے پھرنے کی۔ طاہرہ کو اپنا پرانا دکھڑا دہرانا نہیں بھولا۔

''اماں! ردا پریشانی سے تھکی ہوئی ہے اور کچھ ڈری بھی ہوئی ہے۔ پلیز اس وقت یہ باتیں نہیں کریں۔'' آزر کو کچھ ناگوار سا گزرا۔

''رمشا! بہن کو اندر لے جاؤ۔'' انہوں نے رمشا کو اشارہ کیا جو ماں کی نظروں سے خائف کھڑی اپنے ہاتھوں کو دیکھتی ردا کو ساتھ لگا کر اندر لے گئی تھی۔

''آپی! آج تو تم نے حد کر دی ایمان سے ممی غلط نہیں ہیں ڈر تو میں بھی گئی تھی۔ ایک تو اتنا جلالی موسم اوپر سے تمہارا فون بھی بند۔ آفس فون کیا وہاں سے بھی کوئی فون نہیں لے رہا تھا۔ ہوا کیا وہ اسے اس کے کمرے میں لے آئی تھی۔

UrduBooks.PK

''پلیز رمشا! مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ ابھی مجھے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی' وہ نظریں چراتے عجیب بے رخی سے بولی تو رمشا ٹھٹک کر رہ گئی۔

''کیا مطلب کیا ہوا ہے؟'' رمشا کی طبیعت ردا جیسی تھی کرید نے اور جانچنے کی۔

''افوہ! کہا ناں جاؤ' میرے سر میں بہت درد ہے۔ ابھی کسی سے کوئی بات نہیں کرنی مجھے۔ چیخ کر بات کرنا ردا کا مزاج نہیں تھا مگر اس وقت وہ واقعی نارمل نہیں لگ رہی تھی۔ رمشا کچھ خائف اور ناراض سی ہو کر باہر جانے لگی۔

وہ الماری سے اپنے کپڑے لے کر واش روم میں گھس گئی۔

وہ کپڑے بدل کر بال کھولے ڈریسنگ ٹیبل سے برش اٹھانے کے لیے مڑی تو آئینے میں سونیا کا عکس دیکھ کر وہ بری طرح سے گڑبڑائی تھی۔ وہ سرد نگاہیں اس کے چہرے پر جمائے یک ٹک اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

خود پر قابو پاتے ہوئے بھی ردا گھبرا سی گئی! اسے ماں کی نظروں سے خوف سا آ رہا تھا۔

''ماما! کیا ہوا ہے؟'' وہ دبے لہجے میں ڈر کر بولی۔

''یہی میں تم سے پوچھ رہی ہوں' تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔''

وہ جیسے گن گن کر قدم اٹھاتی اس کے بالکل مقابل آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ سرد کٹیلی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے۔ سرد سی لہر ردا کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرتی محسوس ہوئی۔

وہ ساکت سی ماں کو دیکھتی جا رہی تھی جس نے ہاتھ بڑھا کر کمرے کا دروازہ پشت سے لاک کر دیا تھا جیسے ردا کے بھاگنے کے تمام راستے بند کر رہی ہو۔ ردا شاکڈ کھڑی تھی۔

☆☆☆

''یہ ڈاکٹر موحد ہیں اللہ انہیں جزا دے۔ انہوں نے میری مجھو زندگی بچائی ورنہ شاید اب تک...... زینب آخری میں ہلکا سا مسکرا کر چپ ہوئی تھی۔

''میں نہ ہوتا میم تو میری جگہ کوئی اور ہوتا۔ کوئی بھی۔ اگر اللہ کو آپ کی زندگی آپ کی مزید سانسیں درکار ہیں اس دنیا کے لیے تو وہ کسی کو بھی بھیج سکتا تھا۔ آپ کو زندہ رکھنے کے لیے۔

اس میٹھی مسکان کے ساتھ موحد نے کہا تو پتا نہیں کیوں بلال کو وہ بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔

''بہرحال بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ آپ نے زینب خالہ کی نا صرف جان بچائی' بلکہ انہیں گھر بھی چھوڑ نے آئے' آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ یہ بہت جتانے والا انداز تھا بلال کا۔

مصافحے کے لیے بڑھا ہاتھ بھی گرم جوشی محض رسمی کر رہا تھا۔

زینب نے ناپسندیدہ نظروں سے بلال کے رویے کو دیکھا۔

''اٹس اوکے!'' موحد عادتاً مصافحہ کرتا ہوا مسکرایا تھا۔

''مجھے اجازت ہے میم۔ میرا ڈرائیور باہر ویٹ کر رہا ہے۔'' وہ اپنائیت بھرے انداز میں دیکھ کر اجازت لیتے ہوئے بولا۔

''ہرگز نہیں موحد بیٹا! میں آپ کو چائے پیے بغیر تو نہیں جانے دوں گی۔ کشف بیٹا جلدی سے اچھی سی چائے تو لے کر آؤ۔'' وہ بشاش لہجے میں بولی۔ کشف نے بلال کو منہ بناتے دیکھا تو منہ نیچا کر کے مسکرا دی۔

''میں لے کر آتی ہوں چائے آنٹی۔'' وہ جانے لگی۔

''پلیز نہیں۔ نو فارمیلٹی میں چائے نہیں لوں گا۔ اس وقت تو بالکل بھی نہیں۔ ان شاء اللہ پھر کبھی میں جب بھی چکر لگا تو آپ کے ساتھ ضرور چائے کا ایک کپ پیوں گا۔ اس وقت مجھے اجازت دیجئے۔''

وہ بہت عاجزی اور اپنائیت بھرے انداز میں زینب کو دیکھتے ہوئے گویا اجازت طلب کر رہا تھا۔

''تو یہ تماشا رہ گیا تھا لگنے کو اس محلے میں۔ ماں صبح منہ اندھیرے کی نکلتی بنی ٹھنی' اللہ جانے کس دھندے میں اور بیٹی کے بھی یہی گن تیار شیار ہو' کبھی کسی لڑکے کے ساتھ' کبھی کسی کے ساتھ جاتی ہے۔ آئی کسی اور کے ساتھ ہے۔ بتا ذرا بی بی تم دونوں کا چلن کیسا ہے یہاں کون سا دھندہ چل رہا ہے۔''

پاٹ دار آواز سے وہاں موجود نفوس کے دم لمحے بھر کو خشک ہو گئے۔۔۔۔ کشف کو لگا دن بھر وہ جس ٹائم بم پر بیٹھی اس کے دل کو سہا دینے والی ٹک ٹک سنتی رہی تھی وہ بم بلاسٹ ہو چکا ہے۔

بتول خالہ اپنی جیسی دو اور حواری عورتوں کے ساتھ صبح والا حساب چکتا کرنے آ پہنچی تھی۔

کشف کا تو کاٹو بدن میں لہو نہیں۔

''آپ ہوش میں تو ہیں بتول خالہ! معلوم بھی ہے آپ کو کچھ کیا بولتی جا رہی ہیں اور کیا طریقہ ہے یہ کسی کے گھر میں بغیر پوچھے داخل ہو کر بات کرنے کا۔ زینب کا مارے طیش کے جسم تو کانپ ہی رہا تھا اس کی آواز بھی اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

''کیا...... طریقہ ہو گا نیک بی بی تم ہمیں سمجھاؤ' ہم تو سیدھے سادے جاہل چٹے ان پڑھ' کیا جانیں دلوں کو لبھانے کے میٹھے میٹھے طریقے جس سے تم اپنے گرد منڈی سجا کر کھڑی ہو۔

بتول خالہ تو جیسے موحد اور بلال کو دیکھ کر انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ چکی تھی۔ اب صرف تھانے سے پولیس بلانا باقی تھی۔

''خاتون! ہوش میں رہ کر بات کریں اور چلتی پھرتی نظر آئیں یہاں سے۔ بلال کسی دیوار کی طرح زینب اور بتول کے درمیان تن کر کھڑا ہوا تھا۔

کشف تو یوں بھی زینب کے پیچھے خوف زدہ سی کھڑی تھی۔

موحد کو اپنی پوزیشن بڑی آکورڈسی لگ رہی تھی' اسے بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ اس سین میں کیا رول پلے کرے۔

وہ کنفیوز سا انہیں دیکھنے لگا۔

''اے تم تو ہٹو بیچ سے۔ میں تمہارے منہ نہیں لگ رہی۔''

بتول نے بلال کو دھکا دے کر ہٹانے کی کوشش کی مگر اس کے فولادی وجود سے صرف اس کے اپنے ہاتھوں کو ضرب آئی۔

''مگر میں آپ کے منہ لگ رہا ہوں نا' بولیں کیا تکلیف ہے آپ کو۔ صبح میں بھی آپ یونہی محفل لگا کر کھڑی تھیں۔ اتنا شوق ہے تو باہر چوک میں چلی جایا کریں یا پھڈا کرنے کو جی چاہتا ہے تو آ جائیں۔ میں لے جاتا ہوں آپ کو کسی بھی چینل پر...... وہیں کام کرتا ہوں میں آپ کا شوق بھی پورا ہو جائے گا اور مشہوری بھی ہو جائے گی بلکہ کوشش کر کے کچھ رقم بھی دلوا دوں گا۔ کیا کہتی ہیں۔'' وہ کمر پر ہاتھ رکھے پوچھ رہا تھا۔

''ہائے اللہ۔ تم چینل پر کام کرتے ہو۔ بتول کے ساتھ آئی عورت ششدر سی منہ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''فون کروں کیمرہ مین کو یہیں سے سب Live دکھا دے گا چینل پر۔ کیا مرضی ہے پھر؟'' وہ نڈر ہو کر بول رہا تھا۔

''تو یہ وجہ ہے زینب بی بی تمہاری اکڑ کی۔ ہلکا ہاتھ تو نہیں مارو گی ناں تم اور یہ مت سمجھنا' بتول ڈر گئی یا بھول جائے گی۔ بتول کے ساتھ جو پنگا لیتا ہے' اس کی نسلیں بھی سر پکڑ کر روتی ہیں۔ بس اتنا یاد رکھنا آج جو تیری لاڈلی نے میرے ساتھ بکواس کی ہے۔ اس کا بدلہ تو چکانا پڑے گا' آج نہ سہی بعد میں سہی۔'' وہ دھمکی دیتی منہ پر ہاتھ

پھرتی چلی گئی۔
لمحہ بھر کو سارے میں سکوت چھا گیا۔
بتول زور سے بڑا دروازہ بند کرتی جا چکی تھی۔
''مجھے اجازت دیں پلیز۔'' موحد شرمندہ سا مزید کوئی بات کیے بغیر سر جھکا کر باہر نکل گیا۔
آیئے۔ میں آپ کو باہر تک چھوڑ کر آتا ہوں ان تنگ گلیوں میں آپ کو راستہ پتا نہیں چلے گا۔'' بلال کو خیال آیا تو کہتا ہوا اس کے پیچھے باہر نکل گیا۔
''کیا ہوا تھا آج، جھگڑا کیا تھا تم نے بتول خالہ کے ساتھ۔'' ان دونوں کے باہر نکلتے ہی زینب نے کشف کو کھینچ کر سامنے کیا تھا۔
''آپ ہی کو شوق ہے نا اس گھٹیا محلے میں رہنے کا تو اب بھگتیں' یہ بڑھیا صبح بھی یہی بکواس کر رہی تھی کہ تمہاری ماں ایک غلط عورت ہے۔ جس کا شوہر اسے چھوڑ کر چلا گیا اور وہ باہر جا کر پتا نہیں کیا کیا بکواس کر رہی تھی تو کیا میں برداشت کرتی رہتی؟
کشف بھی پھٹ پڑی۔
''ہاں کرتی رہتیں برداشت۔ کیا مل گیا کیچڑ میں پتھر پھینکنے سے' تماشا مزید بڑھ گیا ناں'' زینب غصے میں کھول کر بولی۔
''ہاں تو جب گندے جوہڑ کے کنارے رہیں گے تو چھینٹیں تو پڑیں گی آتے جاتے اور آنی! سچ کہوں یہ خالہ بتول کچھ ایسی غلط بھی نہیں۔''
اسے لگا وہ گھڑی آگئی ہے ان سوالوں کو پوچھنے کی جو اس کے دماغ میں پلتے پلتے اس کے ساتھ بڑے ہو چکے تھے۔
''کیا مطلب؟'' زینب کمرے کی چیزیں جگہ پر رکھتے ہوئے چونکی۔
''کون تھا میرا باپ اور کیوں چھوڑ کر چلا گیا آپ کو......کوئی تو وجہ ہوگی ناں۔''
شاید کشف کے سوال اتنے تکلیف دہ اور کٹیلے نہیں تھے جتنا اذیت بھرا اس کا لہجہ تھا۔
زینب نے عجیب ہاری ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔
''اور کتنا مجھے ٹالیں گی اور کب تک؟ اگر مجھے میرے سوال کا جواب نہیں ملا تو میں اسی طرح لوگوں کے ساتھ الجھتی رہوں گی اور پھر شاید کسی ایک دن پتھر لے کر انہیں مارنے بھی لگوں یا کسی پاگل خانے پہنچ جاؤں گی پھر آپ خوش ہو جائے گا۔''
کشف نے دل میں سوچ لیا تھا آج زینب کو ان سوالوں سے بچ کر کہیں بھاگنے نہیں دے گی۔
''تم ٹھیک کہتی ہو شاید ان سوالوں کے جواب دینے کا وقت آ گیا ہے۔ اور میں تمہیں مزید بہلا نہیں سکتی۔ ایسا کروں گی تو شاید تمہارے ساتھ ظلم ہوگا۔ پوچھو کیا پوچھنا ہے؟''
زینب اس کے سامنے بیٹھی تو کشف اسے بے یقینی سے دیکھتی رہ گئی۔ زینب اتنی آسانی سے مان جائے گی کشف نہ جانے کیوں ٹھٹک سی گئی تھی۔

☆☆☆

رات گہری ہو چکی تھی باہر ہر طرف سناٹا تھا۔
سڑک کی طرف کھلتی کھڑکی سے بھی کافی دیر سے کسی گاڑی یا بس کے گزرنے کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔
وہ ہتھوڑی ہاتھ میں لیے دیوار پر لگی کیل کو ہلکی آواز کے ساتھ ضرب لگا رہا تھا۔

UrduBooks.pk

دیوار مضبوط سیمنٹ سے بنی تھی جو مسلسل اس کی ضربوں سے بھی وہ چھوٹی سی کیل اندر نہیں جارہی تھی۔

اس نے آخری دو ضربیں پوری طاقت سے لگائیں تو کیل اس کی مطلوبہ گہرائی تک دیوار کے اندر چلی گئی۔

وہ ابھی ریک پر رکھی فریم شدہ تصویر کو اس کیل پر لگانا ہی چاہتا تھا کہ وہ سیاہ ریشمی گاؤن میں ملبوس غصے سے بھرے تیور کے ساتھ اندر آئی اور اس کے ہاتھ سے فریم چھین کر اس نے کھلی کھڑکی سے باہر اچھال دیا تھا۔

''یو میڈ مین۔'' وہ غصے میں چیخی۔ ''تمہیں خود تو نیند آتی نہیں، دوسروں کی زندگی بھی حرام کر دی ہے تم نے۔''

وہ ساکت سا سامنے کھڑی اس حسن کی دیوی جیسی دودھیا رنگت والی عورت کو دیکھے جارہا تھا جس کے سامنے چاند کا حسن بھی شرما جائے۔

''مت دیکھو مجھے اس طرح، تمہاری ان نظروں سے مجھے اور بھی خود سے نفرت محسوس ہونے لگتی ہے۔''

وہ وحشت بھرے انداز میں چیخی تھی۔

اس نے تھکے ہوئے انداز میں ہتھوڑی ایک طرف رکھ دی۔

پھر ایک طرف پڑی پانی کی بوتل سے گلاس میں پانی ڈال کر اس کے آگے کیا۔

''نیند نہیں آرہی تھی مجھے تو اس لیے۔'' وہ کچھ شرمندہ سے لہجے میں صفائی دیتے ہوئے بولا۔

اس نے اسی غصے میں گلاس پکڑ کر سامنے دیوار پر دے مارا۔

''اور اس کی سزا بھی تم مجھے دو گے اگر تمہیں نیند نہیں آرہی تھی تو۔'' وہ اس کے غصے پر کچھ اور بھی شرمندہ ہو گیا۔

''سوری۔ میں نے سوچا تم کافی گہری نیند میں ہو تو......'' اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، سامنے کھڑی اس شان دار عورت کی دل آزاری کی وہ کس طرح سے معافی مانگے، غلطی تو بہرحال اس کی تھی۔

''میں نے کھائی تھیں ناں سلیپنگ پلز کیونکہ مجھے بھی نیند نہیں آتی اور میں اس کے باوجود کن جتنوں کن مشکلوں سے سوئی تو تم نے یہ ہتھوڑی لے کر میرے سر پر بجانا شروع کر دی۔'' وہ غصے میں پاگل اس کا گریبان پکڑ کر اسے کسی بے جان چیز کی طرح جھٹک رہی تھی۔

اس کی نائٹ شرٹ کے سامنے والے دو بٹن ٹوٹ گئے تھے۔

وہ پاگلوں کی طرح اندر گئی اور دوسرے لمحے پھر آگئی۔

اپنی بند مٹھی اس کے منہ کی طرف کرتے ہوئے وہ جیسے اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

''یہ کھاؤ چار گولیاں نیند کی اور کل دوپہر تک تمہیں بھی سونا ہوگا۔ کھاؤ انہیں۔'' وہ زبردستی اس کا منہ کھول کر گولیاں اس کے حلق میں اتارنا چاہتی تھی۔

وہ اپنا آپ بچا نہیں پارہا تھا۔

اس لمحے باہر کا دروازہ کھلا اور ریما کی پنسل ہیل کی ٹک ٹک سارے اپارٹمنٹ کے لکڑی کے فرش پر بجنے لگی۔

دوسرے لمحے وہ کمرے میں موجود تھی۔

چہرے پر سرخی، آنکھوں میں انوکھی سی چمک لیے سرخ رنگ کا خوب صورت کوٹ پہنے اٹھارہ انیس سال کی خوب صورت لڑکی جو یقیناً اس وقت غصے میں پاگل ہوتی عورت کی بیٹی تھی کہ جوانی میں ہو بہو وہ ریما کی کاپی ہوگی۔

''ہائے مام! ڈیڈ! آپ دونوں ابھی تک جاگ رہے ہیں، سوئے نہیں۔'' وہ ہنسی۔ بلاوجہ کی ہنسی۔ ''کیا میرے لیے جاگ رہے تھے۔''

وہ پھر ہنسی، بلاوجہ کی ہنسی۔

اور جھک کر اپنی نازک بینڈل کے اسٹریپ کھولنے لگی۔

''یہ...... یہ اس نے...... اس نے کیا پہنا ہے۔ یہ ریڈ کلر...... یہ سرخ رنگ۔ خون ہے نا۔ میرو یہ خون ہے نا۔ ریما تم کیسے لہولہان ہو گئیں؟ تمہیں کس نے چھریاں ماریں ریما۔''

وہ میرو کے گلے لگ کر اس کے ٹوٹے بٹنوں والی شرٹ کے گریبان میں منہ چھپا کر کسی خوف زدہ بچے کی طرح گھٹی گھٹی چیخوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

''ریما! تم جانتی ہو ناں تمہاری ماں ریڈ کلر نہیں دیکھ سکتی، اس کے سامنے کیا پورے گھر میں کہیں بھی یہ کلر نہیں رکھتے ہم۔''

میرو ناراض لہجے میں بیٹی سے کہہ رہا تھا۔

''مائی فٹ، شی از ابنارمل۔ کیوں نہیں آپ انہیں کسی مینٹل ہسپتال میں ایڈمٹ کرواتے۔ اگر یہ بیمار ہیں، ابنارمل ہیں تو کیا ہم بھی جینا چھوڑ دیں۔ پاگل ہو جائیں ان کی طرح۔'' وہ بھی جانے کتنے سالوں کا گھٹا ہوا غبار تھا جو اپنے اندر دبا نہیں سکی تھی۔

''ریما! اتارو اس کو...... تم......'' میرو اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا۔ زری ابھی بھی خوف زدہ بچے کی طرح اس کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔

''نیور...... میں اس کوٹ کو کبھی خود سے الگ نہیں کروں گی، اٹس اے ٹوکن آف مائی لو۔ ڈینی نے دیا ہے یہ مجھے۔ میں یہ گھر تو چھوڑ کر جا سکتی ہوں جہاں ریڈ کلر الاؤ نہیں یہ کوٹ نہیں چھوڑ سکتی میں انڈرسٹینڈ'' وہ ننگے پاؤں سینڈل ہاتھ میں پکڑے غصے میں بولتی وہاں سے چلی گئی۔

میرو ششدر سا اسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔

زری کن انکھیوں سے آہستہ آہستہ اوپر جاتے سرخ الاؤ جیسے دہکتے رنگ کو دیکھ رہی تھی پھر اس کے گریبان میں منہ چھپا لیا۔ جو اسے سہارا دیے کرب تک لا رہا تھا

''سنو اسے بلا لو، اسے بلا دو ناں۔'' وہ ملتجی لہجے میں منت کر رہی تھی۔ میرو نے اسے نرمی سے بستر میں لٹایا۔

اسے کمبل اوڑھا کر اس کے بال سہلاتے ہوئے اسے نرمی سے دیکھنے لگا۔

میں اسے بلا لوں گا تم پریشان نہیں ہو بلا لوں گا اسے۔

میرے پاس رہو دور نہیں جانا، سگنل ریڈ ہو گیا تو وہ پھر آجائے گا۔'' اس نے کہہ کر کمبل کے اندر خود کو چھپا لیا تھا۔ میرو ترحم بھری نظروں سے کمبل کے اندر کانپتے اس کے وجود کو دیکھتا رہا۔

☆☆☆

''شائستہ! ہاں بھئی مبارک ہو۔ آزر اور سونیا کو کوئی اعتراض نہیں۔ ردا اور سلیمان کے رشتے پر تم بس اسی ہفتے کی کوئی فلائٹ بک کراؤ اور سلیمان اور اس کے ابا کو لے کر آجاؤ بھئی، میری سانسوں کا کچھ پتا نہیں، کب بلاوا آجائے، میں اپنی ایک پوتی کی خوشیاں تو دیکھ جاؤں۔''

اور دروازے میں کھڑا آزر ساکت رہ گیا۔

''بس تو ٹھیک ہے، بیس دن بعد نکاح رخصتی سب کر لیں گے، بس تم آجاؤ۔'' وہ آزر کو دیکھ کر کچھ اور اونچی آواز میں بولنے لگیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

UrduBooks.pk

کشف بلوچ

یہ جو دروازہ ہے

گھر کا پچھلا دروازہ ابا اماں کی ازدواجی زندگی میں گویا تابوت کی وہ آخری کیل ثابت ہوا، جس کے بعد وہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔

والدین کی پہلی لڑائی تو میری یادداشت کے پنوں پر کہیں محفوظ نہ تھی۔ مگر شعور کی ابتدائی منزلوں پر قدم رکھ کر ایام رفتہ کو آواز دوں تو میرے تصور کی کھڑکی پر ماضی کے چند واقعات کھٹ کھٹ کرتے ہوئے منظر بنانے لگتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ میرا سارا بچپن اماں ابا کی چخ چخ میں ہی گزر گیا۔

اماں گوری چٹی، تیکھے نقوش والی دراز قد، نفاست پسند عورت اور سونے پر سہاگا مذہبی۔

جبکہ ابا پست قد، کند ذہن اور کالے کلوٹے جو صرف آج میں زندہ رہتے، یعنی جو کچھ بھی ہے آج ہے کل کو گولی مارو اور دین کو تو شائد وہ کب کا بھلا چکے تھے۔

”برے مرد کی کمینگی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔“ اماں اکثر یہ الفاظ ابا کے سامنے بڑبڑاتیں اور وہ خجالت سے بڑھی ہوئی بے ترتیب داڑھی کھجاتے ہوئے قہقہے لگاتے۔ اتنا ہنستے کہ مجھے ان کی کیڑا لگی داڑھ تک نظر آنے لگتی اور میں اماں کے کہے الفاظ کے معنی تلاش کرتی رہتی مگر کچھ پلے نہ پڑتا۔

تلخیوں کے چوہے اپنے نوکیلے دانتوں سے شب و روز کو کترتے چلے جارہے تھے۔

رات برآمدے میں پیر پسارے بلی کی مانند کان لپیٹے اونگھتی رہتی اور دن اکھڑے اکھڑے سے دبے پاؤں گزر جاتے۔

میں شعور کی بارہویں سیڑھی پر کھڑی تھی۔ کبھی ابا سے متنفر ہوجاتی اور کبھی اماں سے۔

کبھی اماں روشن دان میں بیٹھی سہمی ہوئی چڑیا لگتیں اور ابا گھات لگائے سانپ کی مانند اور کبھی ابا کھیت میں چپ چاپ کھڑا پتلا اور اماں کھیت اجاڑنے والی فسادی چڑیا۔

”یہ جتنی سیاہی تیرے اس منہ پر ہے، اس سے کہیں زیادہ تیرے اندر ہے۔ تیرے دل پر لگا سیاہ نقطہ بہت پھیل گیا ہے۔ اب تجھ جیسے سیاہ کار کا سدھرنا ناممکن ہوگیا ہے۔“ اماں دانت پیستے ہوئے کہتیں اور سامنے جھلنگا چارپائی پر لیٹا ابا بانہوں کو تان کر اور ٹانگوں کو پھیلا کر ایک طویل انگڑائی لیتے ہوئے ہنس دیتا۔ ابا اینٹوں کے بھٹے پر کام کرتا تھا سارا دن بھٹی کی چمنی میں آگ جلا جلا کر ان کا سیاہ رنگ مزید پختہ ہوگیا۔ میں ابا کی کالی بھجنگ پنڈلی دابتے ہوئے اماں کی بات سن کر کلستی۔

”اب اس میں ابا کا کیا دوش جو وہ کالے ہیں؟“

ایسے جملے اماں، ابا کو تب سناتیں جب وہ بھٹے کے یار دوستوں کو ہمارے گھر لے آتے۔

گھر کیا تھا، کچی پکی اینٹوں کی بوسیدہ سی چار دیواری اور بیچ میں ایک خستہ حال کمرہ جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا نعمت خانہ تھا۔ ویسے تو مجھے سال کے بارہ مہینے اس میں کبھی کوئی نعمت نظر نہیں آئی، مگر اماں کو اسے نعمت خانہ ہی کہنا پسند تھا۔ گھر کی بدحالی کا یہ عالم تھا کہ غسل خانہ تک نہ تھا۔

UrduBooks.PK

ابا کا تو پتہ نہیں کہ کہاں نہاتے تھے مگر میں اور اماں بکائن کے درخت کے نیچے لگے نلکے کے گرد چادر باندھ کر نہا لیتے۔ مگر اس قدر تنگی کے باوجود ابا نے کمرے کے ساتھ چھوٹا سا پردہ باندھ کر مہمان خانہ بنا لیا۔

مہمان خانہ جہاں رات گئے تک غلیظ گالیاں اور اونچے اونچے قہقہے گونجتے۔ ایک ناگوار سی بو پورے گھر میں چکراتی پھرتی۔

ایسے میں اماں مجھے دبوچے اندھیرے کمرے میں پڑی رہتیں۔ مگر ابا بھی کوئی نا کوئی فرمائش لیے اماں کے سر پر آن کھڑے ہوتے۔

"ارے بھئی مہمانوں کے لیے دو پیالی چائے ہی بنا دو۔" جسے سن کر اماں جی جان سے کلستے ہوئے، میرا ہاتھ زور سے پکڑے نعمت خانے چل دیتیں۔

"اماں میں چائے دے آواں؟"

میں لپک کر آگے بڑھتی۔ مگر اماں کی تنبیہی

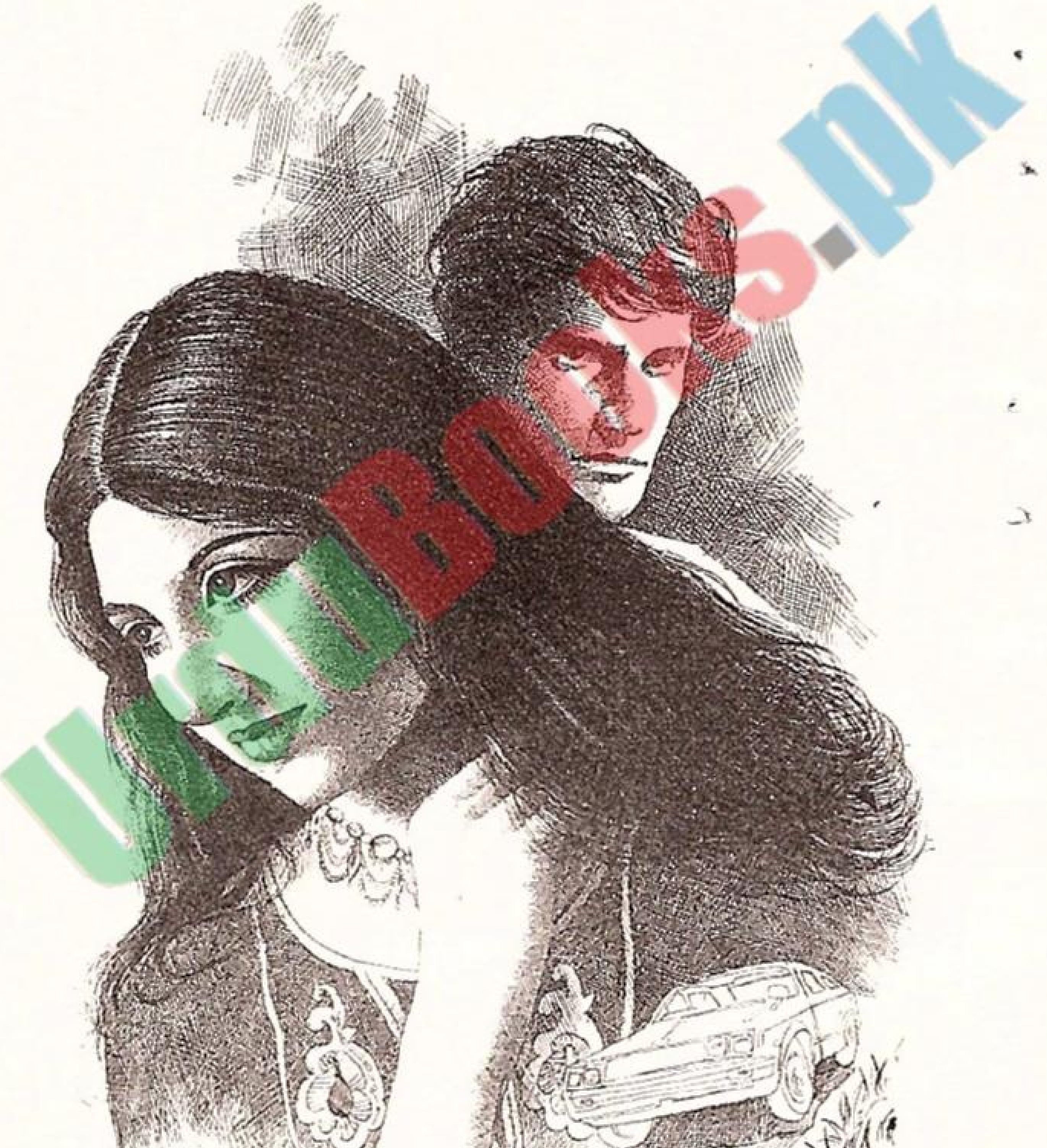

UrduBooks.pk

نظروں سے خائف ہو کر دیوار سے چپک کر بیٹھ جاتی۔ اماں خود ہی سر پر چپکے دوپٹے کو ماتھے تک کھینچ کر لاتیں اور ٹرے اٹھا کر مہمان خانے کے پردے کے پاس ابا کو پکارتیں تو اندر سے ابا کی چہکتی آواز آتی۔

”ارے بھئی چائے اندر ہی لے آ، سب اپنے ہی ہیں۔“ اندر سے سگریٹ کے دھوئیں میں ملفوف دبی دبی ہنسی کواڑ سے نکلتی تو اماں غصے کے مارے بڑبڑاتے ہوئے چائے کی ٹرے وہیں پٹخ کر چلی آتیں۔ نعمت خانے کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھتی میں سوچ میں گم ہو جاتی کہ نجانے اماں ابا کی اس ناچاقی کی وجہ کیا تھی۔

شاید اماں کسی شہزادے کے انتظار میں تھیں اور دیو کے قبضے میں پھنس گئیں یا پھر قرض کی دلدل میں پھنسے والدین نے انہیں ادائیگی کے بدلے بیچ دیا۔

میں فرصت کے لمحات میں پزل باکس جوڑتی رہتی۔

پھر یوں ہوا کہ ایک دن اس ناچاقی کا وہ سرا مل ہی گیا۔ جس کے بعد سارا قصہ جسے سلجھاتے ہوئے میں خود الجھ گئی تھی۔ کسی بوسیدہ سویٹر کی طرح ادھڑتا ہی گیا۔ میں شعور کی سولھویں سیڑھی پر پیر دھر چکی تھی۔

اس دن میں بکائن کے درخت کے نیچے دھلے کپڑے کھنگال رہی تھی۔ جب اندر سے کوئی چیز ٹوٹنے کی آواز آئی جیسے کسی نے کوئی چیز غصے سے دیوار پر دے ماری ہو اور پھر چند ثانیے بعد ہی ابا کے سنہری ارشادات جاری ہو گئے۔

میرے اندر جاتے قدم ان دیکھی زنجیروں سے لپٹ گئے۔

”اب بیٹھی رہو اپنے اس پرنور ماتھے پر شرافت کی مہر سجائے، تجھ جیسی عورتوں کی یہی سزا ہوتی ہے جو ہر وقت حرام حلال کا الاپ جاری رکھتی ہیں۔ کیا ہو جاتا جو تو کبھی میرے یار دوستوں میں آ بیٹھتی۔ وہ تجھے کھا تھوڑی جاتے مگر نہیں، تجھے تو اس گوری چمڑی کا غرور ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور یہاں ابھی تک یہی چل رہا ہے کہ اپنا مرد حلال تو پرایا مرد حرام۔“ ابا کی چنگھاڑ سے جیسے چھوٹی چھوٹی چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ میں نے ڈر کر اپنا دوپٹہ جھاڑا۔ یوں لگا جیسے ایک سرخ چنگاری میری گود میں آن گری ہو۔

یکا یک دماغ کے خلیوں میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ میں جو اکثر سوچتی تھی کہ میں اماں کی طرح بیوی نہیں بنوں گی جو شوہر کو جوتے کی نوک پر رکھتی ہے۔ میرے اندر کہیں ابا کی محبت کا بت ٹوٹ رہا تھا۔

اس دن ابا کے مزاج کا چھلکا اتر گیا۔

ابا کے منہ سے غلیظ گالیاں یوں ابل رہی تھیں جیسے نالی میں کیڑے۔ میں نے بے ساختہ آتی ابکائی پر بند باندھا۔

مگر آج خبر ہوئی کہ ابا اماں کے درمیان سرد جنگ کی اصل وجہ کیا تھی۔

تھوڑی دیر بعد ابا خود ہی بکتا جھکتا دروازے کو ٹھوکر مار کر چلا گیا۔ ابا کی باتوں کا لب لباب یہی تھا کہ اس نے اپنے لیے ایک نئی عورت ڈھونڈ لی ہے۔ جس میں وہ تمام جملہ خصوصیات موجود تھیں جو ابا کو چاہیے تھیں۔

گھر میں ایک دم خاموشی کا احساس ہوا تو میں نے سر گھٹنوں سے اٹھایا۔ اماں کی حالت کا سوچ کر کمرے کی طرف بڑھی۔ اندر کی خاموشی کو محسوس کر کے میرا دل دھڑکا۔

”اماں۔“ میں نے کپکپاتے ہونٹوں سے آواز دی۔ کمرے میں ہر سو سکوت پھیلا ہوا تھا۔ میں دھک سے رہ گئی۔ اماں جائے نماز پر پرسکون چہرہ لیے تسبیحات میں مشغول تھیں۔

زندگی تھکی ہوئی دھن پر بجتے پھیکے بولوں کا ایسا گیت بن گئی جسے سن کر روز بہ روز بے زاری بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ابا کے جانے کے بعد میں صبح ہوتے ہی آنکھیں چوکھٹ سے باندھ آتی اور رات گئے تک خالی آنکھوں سے دیواروں کو گھورتی رہتی، جن پر چڑھے سائے کبھی کبھی پھسل کر دیوار کو باہوں میں بھر

UrduBooks.pk

لیتے اور کبھی لیے ہو کر ان پر سر تا پیر چھا جاتے۔

دیر تک کواڑ بجتے اور دل دھڑکتے رہتے۔

جھریوں سے جھانکتی ان دیکھی آنکھیں وجود کے سربستہ رازوں کو ٹٹولتیں اور میں اماں کے وجود میں مزید سمٹ جاتی۔

نعمت خانے میں باسی خوشبو چکراتی پھرتی اور صاف شفاف برتن ہمہ وقت شیلف میں دم سادھے رہتے۔ چولہے کے پاس بیٹھی پالتو بلی ناک سکوڑے اونگھتی رہتی۔

☆☆☆

اماں میٹرک پاس تھیں۔ اس لیے مجھے پڑھنا لکھنا گھر میں ہی سکھا دیا۔ نا جانے ابا کی بری خصلتوں کا ڈر تھا یا غربت، اماں نے مجھے باقاعدہ اسکول میں داخل نہ کروایا۔ وہ ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہتیں اور شاید اس میں قصور ان ہی کا تھا کیونکہ میں ہو بہو ان کا عکس تھی۔ وہی گوری چٹی چمڑی، تیکھے نقوش اور دراز قد۔

ابا کی تو شباہت تک نہ تھی مجھ میں۔ ابا کے جانے کے بعد بے یقینی سی کیفیت رہی کہ گھر کی گزر بسر کیسے ہوگی؟ یہ سوالیہ نشان ہمیں ہولانے لگا۔ روز بہ روز مسائل بڑھنے لگے اور اماں کی تسبیح کے دانے تیزی سے گرتے جاتے۔

مگر اللہ مسبب الاسباب ہے وہ تو پتھر کے نیچے دبے کیڑوں کو رزق پہنچا دیتا ہے۔ ہمیں کیسے بھول جاتا۔

پھر یوں ہوا کہ گھر کو چلانے کے لیے ہماری واجبی تعلیم ہی کام آ گئی۔ اماں نے صندوق سے سارے پرانے کھانے پکانے کی تراکیب والے رسالے نکالے جو اماں، ابا سے چھپا کر خریدتی تھیں۔

چند روز بعد ہی اماں ان میں موجود نت نئے پکوانوں کی تراکیب آزمانے لگیں۔ حالانکہ اماں کے ہاتھ میں بلا کا ذائقہ تھا مگر گھر کی دال روٹی میں یہ ہنر بھی دب گیا۔ اماں نے ٹرنک میں موجود بچت کو ہوا لگائی اور چند دن بعد ہی گھر کے اندر لذیذ نعمت خانہ کھول لیا۔ یہاں ہر قسم کے لذیذ کھانے جھٹ پٹ آرڈر پر پکوائیں وہ بھی مناسب ریٹ پر۔ گھر کے باہر آویزاں بورڈ پڑھ کر پہلے پہل دو چار ست الوجود خواتین ہی تشریف لائیں مگر اگلے ماہ ہی اماں کے بنے کھانوں کی مہک دور دور تک پہنچ گئی۔

کئی اور حضرات اس خوشبو کے پیچھے ہمارے گھر تک کھنچے چلے آئے۔ شروع شروع میں، میں نے اماں کا ساتھ مارے باندھے ہی دیا۔ مگر بعد میں، میں نے اس کام میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اماں کی طرح روایتی کھانوں کے بجائے میں آج کل کے پسندیدہ اور مقبول کھانے بنانے لگی۔

کچھ محنت اور لگن تھی اور کچھ اماں کی طرح میرے ہاتھ میں بھی ان جیسا ذائقہ تھا کہ دن بہ دن کام بڑھنے لگا۔ کام کے بڑھتے ہی اماں نے محلے کی ایک چھوٹی سی لڑکی ساتھ رکھ لی جو گاہک سے آرڈر دروازے پر ہی وصول کرتی اور تیاری کے بعد دے آتی۔ نا تو اماں نے خود گاہک سے بات کی اور نا ہی مجھے بات کرنے دی۔

☆☆☆

ہمارے چند مستقل گاہکوں میں سے ایک خاتون عذرا بیگم بھی تھیں۔ جنہوں نے ایک دن باتوں باتوں میں اماں کے کھانوں کی تعریف کرتے ہوئے ہمارے ہاں آنے کی اجازت مانگی اور دوسرے دن ہی ہمارے گھر آ پہنچیں۔

اس شام ذائقے سے بات چھڑی اور رشتے پر جا ختم ہوئی۔ اس واقعے کے چند دن بعد انہوں نے تو جیسے ہماری دہلیز پکڑ لی۔

وہ اپنے بیٹے کے دوست کا رشتہ لائی تھیں۔ وہ دونوں ایک ہی کمپنی میں کام کرتے تھے۔ خاندان کے نام پر صرف بوڑھی ماں تھی۔

عذرا بیگم نے اپنے بیٹے کے ساتھ صبح و شام اتنے پھیرے لگائے کہ لڑکے کو دیکھنے کے بعد اماں کو ہاں کرنی ہی پڑی۔ لڑکے نے جہیز کے نام پر تنکا تک

UrduBooks.pk

نہیں لیا ہاں البتہ اپنی ماں کی خدمت کی بار بار تلقین کرتا رہا۔

اماں شکر ادا کرتے نہ تھکتیں کہ گھر بیٹھے بٹھائے ایسا ہیرا لڑکا مل گیا۔ اور یوں ایک مہکتی شام میں اماں کا آنگن چھوڑ کر اپنے گھر چلی آئی۔

شادی کے ابتدائی دن تو جیسے پر لگا کر اڑ گئے۔ میرا تو رنگ روپ ہی نکھر گیا۔ کہاں تو ہاتھوں سے لہسن ادرک کی بساند آتی اور اب ہمہ وقت خوشبو کی لپٹیں اٹھتیں۔

پچھلی زندگی کے تلخ نقش مٹنے لگے۔ البتہ شوہر کے چہرے پر قدرے سرد مہری چھائی رہتی۔ وہ اکثر سیل فون ہاتھوں میں دبائے چھت پر ٹہلتے رہتے۔ میں میاں کے کام پر جاتے ہی اپنی بوڑھی ساس کے پاس بیٹھ جاتی۔

شوہر کی وفات کے بعد اکیلے ہی بیٹے کو پال پوس کر اس مقام پر لے آئیں۔ میں ان کی اس ہمت کو سراہتی تو وہ منہ پھیر کر دیواروں کو تکنے لگتیں۔ وہ اکثر اکیلی بیٹھی پہروں سوچوں میں گم رہتیں۔

میں جی جان سے ان کی خدمت میں جت گئی۔

چند دنوں میں ان کی ظاہری حالت دیکھ کر یہی اندازہ لگایا کہ ان کی بیماری عام خواتین کی طرح نفسیاتی طرز کی ہے۔ مگر چند دنوں بعد ہی ان کے جسم سے ایسے بدبودار بھبکے اٹھنے لگے کہ میں کئی کئی بار سنک میں الٹیاں کرتی رہی۔

میری ساس کے نچلے دھڑ میں ایسا پھوڑا تھا جو ہر وقت رستا رہتا اور اسی سے وہ بدبو اٹھتی۔

میں نے رات کے ایک خوش گوار پہر میں اپنے شوہر سے اس بابت پوچھا تو یک لخت ان کا چہرہ یوں فق ہوا جیسے سر بازار انہیں کسی نے چوری کرتے وقت دھر لیا ہو۔ چند لمحے لگے انہیں چہرے پر ثبت ناگوار تاثرات مٹانے میں اور میں اس دوران ان کے ماتھے پر پھولی ہوئی سبز رگ کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔

"نہیں کوئی بیماری نہیں یہ ان کا اپنا بویا ہوا ہے۔" وہ ترش لہجے میں کہہ کر آئینے کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ میں گومگوں کی حالت میں ان کی بھنچی ہوئی مٹھی کو دیکھتی رہی۔

☆☆☆

چند مہینوں بعد جب مہکتے لمحوں کا جوش مدھم ہوا تو میرے میاں قدرے مصروف ہو گئے۔ ایسے میں، میں اپنی ساس سے بڑے شوق سے بیتے وقت کے بارے میں پوچھتی مگر وہ چپ چاپ اپنے پیروں کو دیکھتی رہتیں۔ میاں کی مصروفیت کا راز بھی بالآخر کھل ہی گیا۔

وہ دوسرے ملک جانے کی تیاری مکمل کر چکے تھے۔ ان کی کمپنی کے مالک اس سلسلے میں ان کی مدد کر رہے تھے۔ میں یہ خبر سن کر بجھ سی گئی۔ ایک ماہ بعد ہی ہزار وعدوں اور تسلیوں کے بعد جانے والے نے اڑان بھر لی۔ میں ان دنوں تخلیق کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ طبیعت بار بار بگڑ جاتی مجبوراً اماں کو میرے پاس رکنا پڑتا۔ میری ساس تو بیٹے سے الوداعی ملاقات کے بعد ہی کمرے میں بند تھیں بھلا پہلے وہ کون سا زندوں میں تھیں۔

وقت دھیرے سے آگے سرکا۔ جانے والے کی کوئی خیر خبر نہیں تھی اور ادھر میرے وجود میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ سانسیں بوجھل ہونے لگیں۔

گھٹن کا احساس بڑھنے لگتا تو میں پہروں جاگ کر کھلی فضا میں ننگے پیر ٹہلنے لگتی۔

گھر کے پچھلے دروازے پر اکثر ایک ہیولہ دکھائی دیتا اور فضا میں گھٹی گھٹی سسکیاں سنائی دیتیں۔

میں گھبرا کر اندر پلٹ جاتی۔

بوجھل دن ڈھلے اور آخر کار وہ کڑا دن بھی آن پہنچا۔

جب ایک عورت زندگی اور موت کی کشمکش میں ہوتی ہے۔

آہ...... میں نے کئی گھنٹوں بعد درد کے مارے سسکی لے کر آنکھ کھولی تو اماں نے ایک نرم گرم لوتھڑا

UrduBooks.PK

میرے ہاتھوں میں تھمایا۔

اپنے لرزتے سرد ہاتھوں میں ننھے وجود کو پا کر میرا دل کیف و نشاط سے لبریز ہو گیا۔

کئی دن تک بچے کے لمس کو اپنی پوروں پر محسوس کرتی رہی مگر دل کے نہاں خانوں میں پھوٹتی سرشاری کو بیان کرنے سے قاصر تھی۔ کیونکہ ان لمحوں کی کیفیات لفظوں سے ماورا تھی۔

مگر عین اسی لمحے شوہر سے جدائی کا دکھ میری روح کی توانائی تک کو چوس گیا۔ ازدواجی زندگی کے اس خوب صورت پل جب عورت کو اپنے ہم سفر کی شدت سے ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی کمی عورت کی ذات کو سوکھے پتے کی مانند بکھیر دیتی ہے۔

میں رات بھر بچے کو سینے سے چمٹائے اس کے نقوش میں اسے یاد کرتی جو شاید اجنبی سرزمین کی تہہ میں اتر گیا تھا۔

پہلے پہل تھوڑی دیر کے لیے سہی مگر بات ہو جایا کرتی تھی مگر بیٹے کی پیدائش کے بعد سے دوسری طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ ہمارے درمیان ایک گہری خلیج حائل ہو گئی۔

ان ہی دنوں اماں کو موسمی بخار نے گھیر لیا۔ میں وقت نکال کر ان کی طرف جاتی مگر دھیان گھر کی طرف اٹکا رہتا۔ مجھے گھر سے نکلتا دیکھ کر میری ساس بچوں کی طرح رونے لگ جاتیں۔ صبح سویرے ان کے کپڑے تبدیل کر کے انہیں نیا پیمپر لگا کر جاتی مگر گھر آتے ہی وہ بے تحاشہ پھولا ہوا ملتا۔

میں نے اماں کو اپنے گھر لانا چاہا تو اماں اپنا گھر چھوڑنے کو تیار نہیں تھیں اور ایسے میں میرا وجود گھن چکر بن گیا۔

موسم نے کروٹ بدلی۔ اماں جو قدرے بہتری کی طرف گامزن تھیں۔ اچانک اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئیں۔ میں حیرانی سے ان کا پرنور چہرہ دیکھتی رہی۔

میں عذرا خالہ کو ساس کے پاس ٹھہرا کر چند دن ہی اماں کے گھر رک سکی۔ کیونکہ عذرا خالہ کے اطلاعی پیغام پہنچنے لگے کہ میری ساس کا پھوڑا پھیلنے لگا ہے۔

آئے روز میرے ہاتھ میں ڈاکٹرز کے نسخے ہوتے اور اوپر سے شوہر نے پچھلے ماہ سے خرچا تک نہ بھیجا تھا۔

بارہا فون کیے مگر ہر بار وہ کاٹ دیتے۔ میں نے عذرا خالہ کے بیٹے کے ذریعے بات کی تو دوسری طرف سے ان کے منہ سے انکشافات کا ڈھیر سن کر میں نے دیوار تھام لی۔

"اس نے کمپنی کا منیجر بننے کے لیے اپنے باس کی بیٹی سے شادی کر لی تھی اور اس نے یہ بات یہاں سے جاتے ہوئے آپ کو بتائی تھی؟"

میں گھر آ کر اپنی ساس پر برس پڑی۔

ان کے کانپتے ہونٹوں کو ہاں میں ہلتا دیکھ کر میں جیسے چیخ اٹھی۔

"تو پھر آپ نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی؟" میں نے غصے کے مارے سامنے تپائی پر ادویات کے ساتھ رکھا گلاس زمین پر دے مارا۔

ان کی آنکھوں سے دو آنسو لڑھک کر جھریوں میں کہیں بہہ گئے اور انہوں نے اپنے کانپتے ہاتھ میرے سامنے جوڑ دیے۔ میں بدک کر پیچھے ہٹی۔

"میں پہلے دن سے ان کی بے زاری دیکھ کر شک میں پڑ گئی تھی کہ آپ کے بیٹے نے مجھ سے شادی آپ سے جان چھڑانے کے لیے کی تھی۔

اپنے باس کی بیٹی سے شادی کرنے کے لیے انہیں اپنی ماں کے لیے ملازمہ چاہیے تھی جو انہیں میری صورت میں مل گئی۔" میں جیسے پھٹ پڑی۔

"مگر میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں آپ کو چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔" میں نے چیخ کر کہا اور دروازہ دھڑام سے بند کر دیا۔

زندگی کھلے پنجرے کا ایسا زنداں بن گئی تھی جس میں تاحیات محبوس کر دی گئی تھی۔

میں آنسوؤں پر ضبط کے بند باندھتی مگر جب شوہر کی باتیں یاد آتیں تو دل درد سے بوجھل ہو جاتا۔

UrduBooks.pk

میں اکثر افسردہ و مغموم رہا کرتی۔

بیمار کی کراہ جیسا اداس موسم عمر بھر کے لیے چھا گیا۔ انسان بھی بہت ڈھیٹ ہے، بڑے سے بڑا غم سہہ کر بھی زندہ رہتا ہے۔

میرے وجود میں ایک ان دیکھا آتش فشاں ابل رہا تھا۔ اس ابلتے ہوئے لاوے نے میرے جسم و جاں کے ذرے ذرے کو اپنی لپیٹ میں لے کر مجھے ایک تڑختی ہوئی زمیں سا کر دیا۔ ایسی بنجر زمین جس پر اب کسی خواہش کی کونپل نہیں پھوٹے گی نہ ہی اس سرزمین پر خوشیوں کے پھول مہکیں گے۔

اب بھی زیر زمیں ایک لاوا سلگتا ہے اور پہلو سلگ اٹھتے ہیں۔

"کسی جیتے جاگتے انسان کو کوئی کیسے کھلونے کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔" یہ خیال رہ رہ کر میری جان جلاتا۔

☆☆☆

اس وقت مجھے لگا کہ شاید اب اگلا پل نصیب نہ ہو مگر چند روز بعد ہی زندگی کی حقیقتوں نے گلا پھاڑ کر رونا شروع کر دیا۔ گھر کے در و دیوار کے ساتھ ہی ہر چیز خالی ہو گئی۔ بھوک سے بلکتے بچے نے نیند میں ایک سسکاری لی تو میں تڑپ کر اٹھی۔

میری آخری پونجی کل رات ختم ہو چکی تھی۔

میرے اندر ویسی ہی آگ جل رہی تھی جیسے بچپن میں اماں کا ہاتھ پکڑے ہوئے ابا کے بھٹے سے گزرتے ہوئے جلتے دیکھی تھی۔ وہ خاموش آگ جس کے شعلے نظر نہیں آتے مگر تپش سے سلگنے والے کی پور پور تک جل جاتی ہے۔

تبھی میں نے زندگی میں پہلی بار وہ دروازہ بھی کھٹکھٹا دیا جس کے بارے میں میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

"مرد ذات جوتی کی نوک پر رکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ جو انہیں سر پر تاج بنا کر رکھ لیں تو پھر یہی انجام ہوتا ہے ان کا۔" پڑوسن نے ادھار دے کر گویا اگلا پچھلا ادھار بھی چکا دیا۔ اس نے اک ذرا تامل کیا اور پھر کہنے لگی۔

"اور سن اگر اور چاہیے تو بتا دینا میں بھیج دوں گی۔" اس نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور سن۔" میں جو اٹھ رہی تھی ہاتھ پکڑنے پر طوعاً کرہاً صوفے پر ٹک گئی۔

"ادھر اکثر عورتیں ایسی ہی رہتی ہیں کہ جن کے شوہر انہیں دور جا کر بھول بیٹھے یا پھر دوسرا گھر بسا لیا۔ مگر سب تیری طرح نہیں ہیں۔ کبھی دائی کی مٹھی گرم کر دی تو کبھی ڈاکٹر کی اور یوں رازداری سے کام نبٹ جاتا ہے۔" اس نے دائیں آنکھ دبا کر اشارے سے کہا۔ اس کی آواز نے تقریباً سرگوشی کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ میں ڈر کر کھڑی ہوئی۔

"نہیں یقین آتا تو پوچھ لو اپنی ساس سے، بن باپ اور روپے پیسے کے کیسے بیٹا جوان کر ڈالا۔ پوچھ تو سہی ان سے آخر تیرے گھر میں بھی پچھلا دروازہ ہے نا؟" وہ کہہ کر اٹھی۔ میز پر پڑا ایک کارڈ میرے ہاتھ میں دبا کر کہا۔

"جب پیٹ کی آگ بڑھ جائے تو اس نمبر پر کال کر لینا۔" میں مٹھی کو مضبوطی سے بند کر کے یوں بھاگی جیسے کچھ دیر اور کھڑی رہی تو شاید اپنے قدموں پر گر پڑوں۔

"نہیں کوئی بیماری نہیں یہ ان کا اپنا بویا ہوا ہے۔"

بھاگتے سے کانوں میں شوہر کے جملے گونجنے لگے۔

"میں نے منیجر کی بیٹی سے شادی کر لی ہے۔"

جملہ کان کے پردے کو چیرتا ہوا دل میں پیوست ہو گیا۔

میں لڑکھڑاتی ہوئی اپنی گلی میں آئی۔

"تم جیسی عورتیں کبھی تنہا نہیں ہوتیں، تم وہی کرنا جو اپنے باپ کے گھر کرتی تھیں۔ تیرے گھر میں بھی پچھلا دروازہ تھا نا؟"

سرپٹ بھاگتے ہوئے میری نظر گھر کے پچھلے

UrduBooks.PK

دروازے پر پڑی تو یوں لگا جیسے دروازے پر کئی آشنا چہرے استہزائیہ انداز میں ہنس رہے ہوں۔

"اب بیٹھی رہو اپنے اس پرنور ماتھے پر شرافت کی مہر سجائے، تجھ جیسی عورتوں کی یہی سزا ہوتی ہے جو ہر وقت حرام حلال کا الاپ جاری رکھتیں ہیں۔" ابا کے کالک میں لتھڑے ہاتھ جیسے میرے چہرے پر پھیلنے لگے۔

"جب پیٹ کی آگ بڑھ جائے تو اس نمبر پر کال کرلینا۔" دروازے پر ہنستے ایک چہرے نے جیسے میرے چہرے پر غلیظ سی گالیوں میں لتھڑی پچکاری دے ماری ہو۔

"بے فکر رہو، بھوکی نہیں مروگی آخر کو اس گھر میں بھی پچھلا دروازہ ہے۔" شوہر کے آخری جملے نیزے کی انی کی طرح دل میں کھب گئے۔ ہنستے چہرے سے جیسے تھوکوں کی بارش برسنے لگی۔ میرا چہرہ تھوک سے اٹ گیا۔

رات کی کالک بڑھنے لگی۔ مگر نیند کوسوں دور تھی۔ دل ودماغ میں ایک جنگ چھڑی تھی۔ اور کان کسی آہٹ کے منتظر تھے۔ مگر گھر کا پچھلا دروازہ چپ چاپ تھا۔

بھوک سے بلکتے بچے نے نیند میں ایک سسکاری بھری تو میں نے تڑپ کر اسے خالی چھاتی سے لگا لیا۔ اچانک دروازے نے ہلکی سی سرگوشی کی۔ میں سرعت سے اٹھی۔ اور ننگے پیر باہر کی طرف بھاگی۔

اف خدایا...... میں جو جلدی جلدی پچھلا دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھی۔ اچانک پیر رپٹا اور میں زمین پر اوندھے منہ جا گری۔ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر چیک کیا تو ہاتھ گیلا محسوس ہوا۔ درد کی ایک ٹیس رگوں میں اتر گئی۔ شاید راہ میں پڑا پتھر تھا۔ جس سے ٹکرا کر میں منہ کے بل جا گری۔

آہ...... آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے اوپر دیکھا، کوئی تھا۔ کوئی تھا جو اس پہر بھی تاروں سے بھرے آسمان سے جھانک رہا تھا۔ ایک خفگی بھری نگاہ جس کی میں تاب نہ لاسکی۔ میں عجیب سی کشمکش میں تھی۔ دل میں وسوسے اٹھتے جو اندھیروں سے ڈرانے لگتے مگر پاس ہی کوئی آواز گونجتی جو جلد سویرا ہونے کی نوید سناتی۔

میں فیصلے کی دہلیز پر سر نہوڑائے بیٹھی تھی۔

حلال کا راستہ جس میں دکھ تھے اور حرام کا راستہ جس میں راحت تھی۔ رات دھیرے دھیرے سرکنے لگی۔ دروازے پر دستک شدت اختیار کرنے لگی۔ پیشانی عرق آلود ہونے لگی۔ سینے پر جیسے ایک سل دھری تھی۔ میں جیسے ندامت کی پستیوں میں اترنے لگی۔

☆☆☆

بند دروازہ اب بھی بج رہا تھا۔

"باہر دروازے پر نظامی صاحب آئے ہیں۔"

میں نے جھٹ پٹ چیزیں سمیٹیں اور اندر آتی لڑکی کے ہاتھ میں نظامی صاحب کا آرڈر پکڑا دیا۔

مزید کباب تیل میں ڈالتے ہوئے ممتا سے لبریز نگاہ اپنے بیٹے پر ڈالی جو پاس ہی اپنی دادی کی گود میں کلکاریاں مار رہا تھا۔

ان کے چہرے پر درد اور بیماری کے اثرات قدرے کم تھے۔ میں اس رات ایک فیصلہ کرکے اٹھی تھی۔

صبح ہوتے ہی گھر کا پچھلا دروازہ اکھاڑ کر دیوار برابر کروادی۔ اماں کا گھر بیچ کر ساس کا علاج کروایا اور حلال کا راستہ چن لیا۔

میں نے جھٹ پٹ کباب فرائی کرکے پلیٹ میں رکھے اور دوسرے آرڈر کے لیے نہاری بنانے لگی۔

باہر اطلاعی گھنٹی پھر سے بجنے لگی جس کے دروازے پر لذیذ باورچی خانے کا بورڈ آویزاں تھا۔

UrduBooks.PK

سویرا فلک

آشیانہ

طاہرہ آپا گھر چھوڑ کر جارہی ہیں۔ سبین نے جب سے یہ سنا تھا بے چین ہو اٹھی تھی۔ طاہرہ آپا نہ اس کی رشتے دار تھیں نہ کوئی سگی سہیلی، وہ — جب بیاہ کر اس محلے میں آئی تھی۔ تو جو سب سے پہلی عورت اس سے ملنے آئی تھی وہ طاہرہ آپا تھیں۔ خوش مزاج، خوش لباس اور وضع دار طاہرہ آپا نے پہلی ہی دفعہ میں اس کے دل میں گھر کرلیا تھا۔ وہ خاصی ملنسار قسم کی خاتون تھیں سو اکثر چکر لگاتی تھیں۔ سبین ایک شہر سے دوسرے شہر بیاہ کر آئی تھی۔ اس کا شوہر حماد تھا تو اس کا پھوپھی زاد کزن، مگر وہ کافی سنجیدہ مزاج اور لیے دیئے رہنے والا آدمی تھا۔ ایسے میں سبین جو بھرے پرے گھر سے آئی تھی اور بولائی بولائی رہتی تھی۔ ایسے میں طاہرہ آپا ہی تھیں۔ جو کبھی ماں بن کر اسے نصیحتیں کرتیں، کبھی بہن بن کر سکھی سنسار کے مشورے دیتیں تو کبھی دوست بن کر شوخیاں اور اٹکھیلیاں کرتیں۔ دونوں قصے، کہانیاں، کھانا پکانے کی ترکیبیں شیئر کرتیں اور پھر جب سبین پہلی بار امید سے ہوئی، تب سے لے کر ننھے احد کے گود میں آنے تک انہوں نے اس کا ایک مسیحا کی طرح خیال رکھا۔ اس کی حالت نازک تھی۔

ڈاکٹر نے اسے سفر سے منع کیا تھا سو وہ میکے نہیں جاسکتی تھی۔ بہنیں بیاہی تھیں اور اماں خود سفر کے قابل نہ تھیں۔ بیٹی کی خاطر کمر کا درد خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ آنے کو تیار تھیں مگر طاہرہ آپا نے انہیں تسلی دے کر منع کردیا۔ سسرال میں تو کوئی تھا نہیں۔ حماد نوکری کی خاطر آبائی گھر چھوڑ کر یہاں شہر میں آباد تھا۔

ایسے میں حماد بہت فکر مند تھا مگر طاہرہ آپا نے اسے سبین کا ساتھ دینے اور خیال رکھنے کی مکمل ڈھارس دی اور اپنے کہے کو پوری طرح نبھایا بھی۔

اور پھر بچے کی آمد پر جب سبین حیران پریشان تھی کہ کیسے سنبھالے، کیسے نہلائے، تب بھی طاہرہ آپا نے اسے بچے کو سنبھالنے کے سارے گر اور ٹوٹکے بتائے۔ خود وہ اور حماد ان کے اس احسان کا ہمہ وقت شکریہ ادا کرتے رہتے مگر وہ ہمیشہ کسر نفسی سے کام لیتیں اور اپنے احسانات کو پڑوسی کا فریضہ کہہ کر انہیں احسانوں کے بوجھ تلے دبنے سے صاف بچالیتی تھیں۔

طاہرہ آپا کے ہمت دلانے پر اب آہستہ آہستہ خود سبین نے بھی باہر نکلنا شروع کیا تھا۔ وہ طاہرہ آپا اور دیگر محلے والوں کے گھر ہفتے میں ایک بار چکر لگا آتی تھی۔ سب سے اس کی اچھی سلام دعا ہوگئی تھی مگر جانے کیوں جیسا دل اس کا طاہرہ آپا کے ساتھ لگا تھا ویسا کسی کے ساتھ نہیں — اب تو وہ جب بھی شام میں احد کو گود میں اٹھائے، حماد کو بتاتی کہ وہ ذرا طاہرہ آپا کے گھر سے ہو کر آرہی ہے تو وہ ٹی وی کے ٹاک شو سے نظر ہٹا کر پہلے اسے غور سے دیکھتا پھر گھڑی دیکھتا اور خوب زوردار قہقہہ لگاتا۔

"اس معاملے میں تو تم شرط لگالو طاہرہ آپا کے گھر سے تمہاری واپسی دو گھنٹے سے پہلے نہیں ہونے کی۔"

"اچھا بس رہنے دیں۔ آپ بھی تو دو گھنٹے اس ٹی وی کی جان نہیں چھوڑنے والے۔ بالکل بہن جیسی لگتی ہیں مجھے وہ، اور احد ان سے اور ان کے بچوں سے بہت ہل گیا ہے۔ طاہرہ آپا کی بیٹی سارہ اور بیٹا

UrduBooks.pk

اشعر تو اس کے ساتھ یوں کھیلتے ہیں جیسے وہ بھی اسی کی عمر کے ہوں جب کہ دس، بارہ سال کا فرق ہے' بہت خوش اور مگن رہتا ہے احد وہاں۔''

سبین سادہ لہجے میں کہتی ہوئی احد کو گود میں اٹھا کر روانہ ہو جاتی۔ حماد تو یوں بھی اپنی دنیا میں گم رہنے کا عادی تھا سوا سے سبین کی وقت گزاری کے اس مشغلے پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہوتا۔ ویسے بھی سبین سگھڑ، سلیقہ شعار اور فرماں بردار بیوی تھی' اس نے بھی حماد کو شکایت کا موقع نہیں دیا اور کبھی جو کوئی چھوٹی موٹی بات ہو جاتی تو طاہرہ آپا ثالثی بن جاتیں اور سبین کو خاص کر سمجھاتیں۔

''سبین! اللہ نے قدرتی طور پر عورت میں مرد سے زیادہ برداشت رکھی ہے اس لیے گھر بنائے رکھنے میں اس کا زیادہ کردار اور حصہ ہوتا ہے۔ بے گھر مرد تو پلیا کے نیچے بھی سو جاتا ہے مگر عورت کی جائے پناہ چھت کے نیچے اور چار دیواری کے اندر ہی ہے۔''

خود طاہرہ آپا اس کی بھرپور مثال بھی تھیں۔ ان کے شوہر نکمے قسم کے آدمی تھے۔ ایسے میں طاہرہ آپا نے اندر باہر دونوں کی ذمہ داریاں سنبھالی ہوئی تھیں۔ ان کے سوشل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چلتا پھرتا میرج بیورو چلاتی تھیں اور بدلے میں ملنے والی فیس ان کے معاشی مسائل میں کچھ نہ کچھ کمی کرنے میں مددگار ثابت ہوتی تھی۔ وہ جب بھی طاہرہ آپا کے گھر آتی' انہیں کسی نہ کسی کام میں مصروف دیکھتی تھی۔ سبین نے کبھی ان کا گھر پھیلا ہوا یا بے ترتیب نہیں دیکھا تھا اور جب سبین ان کے نظم وضبط اور توازن کو دیکھ کر حیران ہوتی تھی۔ تو وہ ہنس کر کہتی تھیں۔

''سبین بے ترتیبی خود میں ہو یا اطراف میں ہمیشہ بے سکونی اور بے برکتی کا سبب بنتی ہے۔''

اور سبین ان کی زندگی میں آتی مثبت تبدیلیوں کو دیکھ کر ان کے اصول کی معترف ہو جاتی تھی۔ میاں کی لاپروائی کے باوجود انہوں نے اپنے سسر کی طرف سے ملنے والے دو کمروں کے مکان کو دو منزلہ گھر میں تبدیل کر دیا تھا۔ ان کے گھر سے امارت نہیں لیکن سلیقہ ضرور ٹپکتا تھا۔ بیٹا ہارڈ ویئر کے کورسز کر کے اب باقاعدہ ایک ٹیکسٹائل مل میں اچھی نوکری پر تھا۔ کیونکہ طاہرہ آپا جانتی تھیں کہ وہ آج کل کی مہنگی تعلیم کے اخراجات نہیں اٹھا پائیں گی میاں تو عرصہ ہوا نوکری ہی چھوڑ بیٹھے تھے سو انہوں نے بیٹے کو ڈگریاں دلانے کے بجائے ہنر سے آراستہ کر کے اس کا مستقبل سنوار دیا۔ بیٹی کو بھی انہوں نے پارلر کے سارے کورسز کروائے تاکہ خدانخواستہ کسی بھی آڑے وقت بھی وہ بے سہارا نہ ہو۔ کنزیٰ کی آمد پر انہوں نے سبین کو بھی یہی سمجھایا تھا۔

''بیٹیاں بوجھ نہیں ہوتیں سبین! ہم خود ان کے لیے سارے کواڑ بند کر کے انہیں زنجیروں سے باندھ کر ان کی حالت ایک اپاہج جیسی کر دیتے ہیں۔ بیٹیوں کا کچھ بننا، سیکھنا اپنے پیروں پر کھڑا ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ بیٹوں کا۔''

اپنی اولاد، اپنی فیملی اپنے گھر کے لیے جیسی ان

کی سوچ تھی ویسا ہی ان کا عمل، وہ دن رات، سردی گرمی کی پرواہ کیے بغیر ان سب کی بہتری کے لیے کوشاں رہتی تھیں۔ انہیں اس قدر ایکٹو دیکھ کر سبین بھی حیرت زدہ ہو کر پوچھ بیٹھتی تھی۔

"اللہ طاہرہ آپا۔ کیا کھاتی ہیں آپ یا کیا پڑھتی ہیں۔ ماشاءاللہ سارا دن مصروف رہتی ہیں مگر ذرا جو تھکن کا شائبہ ہو۔ لگتا ہے سیل لگے ہیں آپ میں، قسم سے حیرت ہوتی ہے مجھے......"

"سیل نہیں بیٹریاں لگی ہیں۔ وہ بھی چارج ایبل۔" وہ ہنس کر کہتیں تو وہ مزید ہونق زدہ ہو کر انہیں دیکھنے لگتی، تب وہ لاؤنج میں لگی سارہ اور اشعر کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہتی تھیں۔

"بچے ماں کے لیے چارجر ہی تو ہوتے ہیں۔"

تب سبین ان کی ممتا سے لبریز آنکھیں دیکھ کر ان کے ہاتھ تھام لیتی۔

"آپ جیسی مائیں بچوں کا فخر ہوتی ہیں۔ کاش میں بھی آپ جیسی بن سکوں۔"

سبین نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس کے نہ نہ کرنے پر بھی طاہرہ آپا نے اسے اپنا پارٹنر بنا لیا۔ وہ طاہرہ آپا سے میرج بیورو چلانے کے سارے گر آہستہ آہستہ سیکھتی چلی گئی۔

سارہ کی رخصتی اور اشعر کی شادی کے بعد ان کے میاں ان کا ساتھ کیا چھوڑ گئے کہ خود طاہرہ آپا نے بھی زندگی کی سرگرمیوں سے خود کو دور کر لیا۔ وہ عبادت کرتیں یا آرام کرتیں۔

سبین کی زندگی لیکن بہت زیادہ رواں ہو گئی۔ بچوں کی بڑھتی عمروں کے ساتھ سبین کی ذمہ داریاں بھی بڑھتی چلی گئیں۔ میرج بیورو کا کام بھی زور پکڑ رہا تھا کیونکہ طاہرہ آپا کے بعد اب محلے میں سب اس سے ہی رابطہ کرتے تھے۔ حماد کی تنخواہ اتنی نہ تھی کہ بڑھتے اخراجات کا مقابلہ کر سکے سو سبین نے اپنی کمر کس لی۔

اس کے ہاتھ گھر کے کاموں میں مصروف ہوتے اور زبان و کان موبائل کے ایئر فون سے جڑے ہوتے۔

اب طاہرہ آپا کی طرف بھی اس کا جانا کم ہوتا تھا۔ آخری بار وہ اشعر کے بچے کی سالگرہ میں ملاقات کر سکی تھی۔ یہ تو اس روز کسی محلے والی نے اسے سبزی مارکیٹ میں بتایا کہ طاہرہ آپا کا گھر اس کے کسی عزیز نے خرید لیا ہے اور وہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہیں تو اسے اپنے لاتعلق رہنے کا شدت سے احساس بھی ہوا اور ندامت بھی۔

گھر آ کر اس نے ہانڈی چڑھانے کا ارادہ ترک کیا۔ خاگینے کے لیے پیاز، ٹماٹر کاٹے اور جھٹ پٹ انڈے ڈال کر خاگینہ تیار کیا۔ اور روٹی واپسی پر بازار سے لانے کا ارادہ کر کے وہ چادر اوڑھ کر دروازے کو تالا لگائے طاہرہ آپا کے گھر کی طرف چلی آئی۔

سامنے ٹرک کھڑا تھا اور سامان لوڈ ہو رہا تھا۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ تیز قدموں سے اس نے طاہرہ آپا کا گیٹ عبور کیا۔ طاہرہ آپا صحن میں رکھے تخت پر بیٹھی تھیں اور کیاریوں میں لگے پودوں کو بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ آہستہ سے ان کے قریب بیٹھ گئی۔

"طاہرہ آپا! آپ نے بتایا ہی نہیں......" سبین اتنا ہی کہہ پائی۔

"بتایا تو تھا بیٹا۔ آشیانہ بنائے رکھنے کے لیے عورت کو ہی قربانی دینی ہوتی ہے اور یہ ہمت ایک ماں ہی کر سکتی ہے۔ اشعر کو لگتا ہے کہ اس پرانے بوسیدہ محلے میں رہنے سے اس کے اسٹیٹس کو ٹھیس لگتی ہے تو وہ حق بجانب ہے آنے والا وقت اس کا ہے۔ اور میرا کیا ہے اس گھر میں رہوں یا کسی اور گھر میں گھر تو گھر ہے۔ چھت اور چار دیواری کا تحفظ تو وہاں بھی ملے گا۔"

طاہرہ آپا نے نم ہوتی آنکھیں چھپانے کے لیے رخ موڑ لیا اور سبین جو طاہرہ آپا کو اپنا گرو مانتی تھی آج "دیوی" جان کے ان کے قدموں میں بیٹھ گئی اور ان کے گھٹنوں سے سر ٹکا دیا وہ جانتی تھی کہ طاہرہ آپا اپنے قول پر عمل کرنے والے لوگوں میں سے ہیں وہ آخر تک لوگوں کو گھر بسائے رکھنے اور گھر کے سکون کو قائم رکھنے کے لیے قربانی کا سبق دیتی آئی ہیں تو وہ خود اپنے آشیانے کے تنکوں کو کیسے بکھرنے دیتیں۔

☆

UrduBooks.pk

فریحہ عبدالرشید

رنگ دے میرے دلدار کو

''اج تو تینوں مجھے بتانا ہی پڑے گا کہ توں نے پڑھنا ہے یا نہیں؟'' تندور گرم کرتی اماں حتمی انداز میں بولی۔ بلال نے ایک نظر ماں کو دیکھا۔ تندور سے زیادہ تپی تو اماں خود لگ رہی تھی۔ اس کا معصوم سا دل پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔

''رات کو تیرا ابا آجائے ذرا...... ایسی پٹائی لگواؤں گی کہ تیری سات پشتیں بھی توبہ کریں گی۔''

اماں نے پرانی دھمکی دہرائی مگر آج اس دھمکی میں غصہ زیادہ تھا۔ بلال روہانسا ہو گیا۔

''اماں نہیں پڑھا جاتا میرے سے، اتنی مشکل

اور گہری پڑھائیاں کر کے میں نے کون سا ادھر لین لارڈ لگ جانا ہے۔ پھر وہی نوکریوں کے دھکے، جوتے گھسیٹ کر بھی کچھ ہاتھ نہیں آنا سوائے ذلت کے۔ اتنے اتنے لائق فائق لڑکے بھی ڈگریاں لے کر ایڑیاں رگڑتے پھر رہے ہیں۔ گھر میں فاقوں کی نوبت آن پڑتی ہے۔ سولہ جماعتیں پاس کر کے بھی لڑکے رکشہ چلا رہے ہیں، پھر اتنی دماغ کھپائی کا کیا فائدہ؟

اماں! میں تو کہتا ہوں کہ سیدھی طرح وقت اور پیسہ ضائع کرنے کے بجائے نا مجھے بھی رکشہ دلا دو۔ وہ جو ماسی زہرہ کے ساتھ کمیٹی ڈالی ہے نا، پہلی والی تم لے لینا اور......"

"وے تے منہ وے تیرا۔ غرق ہونے جوگا۔"

اماں نے اس کی بات کاٹ کر چمٹا ایک طرف رکھ کر جوتا اسے زور سے کھینچ مارا۔ مگر ہائے قسمت کہ جوتا اس نے کیچ کرلیا۔ اب اماں کا غصہ تو سوا نیزے پر تھا۔ اب وہ تھا اور اس کی کم بختی۔

"وے شرم کر تیری نظران چند پیسوں پر ہے۔ اوئے میں نے تو پائی پائی کر کے جوڑا ہے۔ کتنی مشکل سے میں اس گھر کا خرچا چلا رہی ہوں۔ اپنا پیٹ کاٹ کر تیری فیس ادا کر رہی ہوں، تجھے ذرا بھی اس کمزور ماں اور بوڑھے باپ کا احساس نہیں۔

تیری بہن جوان ہونے کو آئی ہے، کیسے تنکا تنکا کر کے اس کا جہیز اکٹھا کر رہی ہوں اور تو ہے کہ ان چند روپوں پر گھات لگائے بیٹھا ہے، تیرے جیسے بے حس بیٹے کو تو مر ہی جانا چاہیے ڈوب کر۔" اماں باآواز بلند بولے جا رہی تھی، اماں کی باتیں سن کر اس کا ذہن نئے منصوبے بنانے لگا تھا۔

☆☆☆

"اور بھئی بلّو! کہاں تک پہنچا تمہارا عشق؟" عدنان نے گنا توڑ کر اسے پکڑاتے ہوئے پوچھا۔

"ادھر کا ادھر ہی اٹکا پڑا ہے۔" بلال مایوسی سے بولا۔

"کیوں ویرے، کل تک تو بڑی بڑھکیں مار رہے تھے، اب کیوں ہوا نکل گئی ہے؟" عدنان نے گنا چوستے ہوئے کہا۔

"بس یار! کیا بتاؤں تمہیں، اماں ہاتھ دھو کر میری پڑھائی کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ اب اماں کو کون سمجھائے کہ نہیں لگتا میرا دل پڑھائی میں، دل تو کوئی اور ہی لے اڑی ہے۔" بلال کے انداز میں بے بسی تھی۔

"ویسے یار بلّو! ایک بات تو بتا، یہ جو تُو نے رکشہ لینے کی ٹھان رکھی ہے، اس سے کیا ہوگا؟ دیکھ بھائی! محنت تو تجھے رکشہ چلانے میں بھی کرنی پڑے گی۔ تُو سیدھے سے پڑھائی کرلے، کوئی ڈھنگ کا کام مل جائے گا تجھے۔ تُو تو خوش قسمت ہے ویرے کہ تیرے اماں ابا تجھے پڑھائی کروانا چاہ رہے ہیں۔ اب مجھے دیکھ اتنا شوق ہونے کے باوجود بھی وہی نسل در نسل گدھا گاڑی پر سبزی بیچنے کا کام کر رہا ہوں۔" عدنان نے اپنے تئیں مفید مشورے سے نوازنے کے ساتھ ساتھ اپنی بپتا سے بھی آگاہ کیا۔

"اونہیں یار! یہ تیری سمجھ سے باہر ہے۔ دیکھ میں رکشہ چلایا کروں گا، یہاں سے سواریاں بھی شہر لے جایا کروں گا اور جس اسکول میں وہ جاتی ہے، میں اسے وہاں بھی چھوڑ آیا کروں گا۔ پروین چاچی کو میں خود قائل کرلوں گا، ویسے بھی بڑا اعتماد ہے، ان کے خاندان کو ہمارے پر۔ اسی بہانے اسے دیکھ تو لیا کروں گا نا۔" بلال تصور میں مستقبل کے سہانے خواب بُن رہا تھا۔ جہاں اس کا رکشہ تھا اور رکشے میں وہ تھی اس کی نورِ نظر، جانِ جگر......!

"واہ جی واہ، شرم تو نہیں آتی تجھے بلّو! پروین چاچی کو تجھ پر اعتماد ہے اور تو اسی کی عزت کو تاڑتا پھرے اور مقصود کو تو جانتا ہی ہے۔ پروین چاچی کا بڑا بیٹا...... پورے پنڈ (گاؤں) کے سامنے تیرا پنڈا ننگا کر کے ایسے چھتر لگائے گا نا کہ یہ عشق معشوقی نہیں ہوا میں ہی اڑنچھو ہو جائے گی۔" عدنان نے ایک دم اس کے مستقبل کا ایسا خوف ناک نقشہ کھینچا

UrduBooks.pk

کہ سہانے خواب واقعی پل بھر کے لیے اڑنچھو ہوگئے۔ جھرجھری سی آنے لگی، مگر یہ وقتی تھا۔ دوسرے ہی پل محبت پھر خوف پر غالب آگئی۔

"اوئے نکیں اوئے...... میں نے منصوبہ ہی ایسا بنایا ہے۔ نہ میری چھترول ہوگی اور "اس" کی عزت تو ویسے بھی مجھے پیاری ہے۔" وہ مسکرادیا۔

"ایک ہمسائی لڑکی کی خاطر اب تو پڑھائی چھوڑ کر رکشہ چلائے گا چہ چہ چہ......" سادہ اور معصوم مزاج عدنان کو افسوس ہو رہا تھا۔

"او کوئی نا...... رانجھے نے بھی تو ہیر کی خاطر بھینسیں چرائی تھیں نا...... اب میں رکشہ چلالوں گا تو کیا حرج ہے۔" بلال مضبوطی سے بولا۔

"پر ڈولی تو کوئی اور لے گئے تھے ہیر کی......" عدنان نے اس کا دل تو کیا حلق بھی مٹھی میں لے لیا تھا۔

☆☆☆

ان کتابوں میں جی نہیں لگتا
ہم کو سجناں کی یاد آئی ہے
بھیگا بھیگا سا یہ دسمبر ہے
بھیگی بھیگی سی تنہائی ہے

ابرار الحق کی آواز میں بجتے گانے پر بلو نے کتاب میز پر پٹخ دی۔

"کیا ہے یار؟" وہ کوفت سے بولا اور کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ اماں وہاں نظر نہیں آرہی تھی۔ شاید وہ کمرے میں تھی، وہ دبے پاؤں باہر نکلا۔ صحن میں چارپائی پر تھیلے میں کچھ کینو پڑے تھے، اس نے کینوؤں کا تھیلا اٹھایا۔ آرام سے لکڑی کی سیڑھی چڑھائی اور اوپر چلا آیا۔

"آج تو اماں کو جیسے تیسے کرکے منا ہی لینا ہے۔ اب آگے وہ ابا کو کیسے قائل کرتی ہے، یہ اس پر ہے۔" وہ مالٹے چھیلتے ہوئے بڑبڑایا۔

"رایان! بیگ اوپر ہی لے آؤ، تمہیں ہوم ورک کروادوں۔" آواز کی سمت پر بلال نے فوراً جھٹکا کھا کر دیکھا۔

پروین چاچی کی بیٹی......
مقصود کی بہن......
شہر کے اسکول کی استانی......

ہاں ہاں وہی تو تھی اس کی نورِ نظر، جو اس کے دسمبر ٹیسٹ کے دنوں میں اس کا دل اڑا کر لے گئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ اس حسینہ کو دیکھتا ہی چلا جائے۔ اسے وہ دن یاد آرہا تھا جب چاچا چوئی کی دکان سے وہ واپس آرہا تھا، اپنے آپ میں اتنا مگن چل رہا تھا کہ سامنے اتنا بڑا ٹرک بھی نظر نہ آیا، وہ تو ہوش میں تب آیا جب پروین چاچی کی بیٹی اساور نے اسے گھسیٹ کر پیچھے کیا۔

"باؤلا ہوگیا ہے کیا بلو؟ چندھیا گئی ہیں آنکھیں تیری۔ ابھی تو ٹرک کے نیچے آجاتا تو کہاں سے لاتے ہم اپنا بلو؟" وہ پرانا منظر یاد کرکے دلکش سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھوگئی۔ اسے ہوش دلانے والی لڑکی تو اس کے سارے حواس ہی لے اڑی تھی۔ وہ اس کی جان تو بچا گئی تھی مگر اس کا سب کچھ لے گئی تھی، اس کی پڑھائی اور اس کا پڑھائی میں لگا دل...... سب کچھ ویران اور اچاٹ سا لگنے لگ گیا تھا۔

"بلو اے بلو...... کیا دیکھے جارہا ہے؟" وہ اسے اتنا بے اختیار ہوکر دیکھ رہا تھا کہ اسے احساس ہی نہ رہا کہ وہ کتنی دیر سے اس پر نگاہ جمائے کھڑا ہے۔ اس کے بولنے پر وہ ہوش میں آیا، دل نے بے اختیار دھڑکنا شروع کیا۔ کتنی حسین لگی تھی نا وہ...... عام سی محلے کی لڑکی سے خاص الخاص ہوکر دل کی رانی بن گئی تھی۔

"کچھ نہیں، وہ تیرا شکریہ ادا کرنا تھا۔ تو نے جان بچائی تھی نا میری۔" وہ اتنی پیاری تھی، بلو نے آج قریب سے دیکھا تھا یا غور سے دیکھا تھا۔ موٹی موٹی آنکھوں پر گھنیری پلکوں کی چادر، بھرے بھرے لال ٹماٹر جیسے گال، گلاب کی پنکھڑی جیسے نرم و ملائم ہونٹ۔ ستواں ناک، چھوٹی سی ٹھوڑی، صاف شفاف بے داغ چہرہ، گالوں پر ڈمپل...... کالے سیاہ بالوں کو چوٹی کی صورت میں قید کیے ہوئے وہ کسی اور ہی دنیا کی شہزادی

UrduBooks.PK

لگ رہی تھی۔ اس سے پہلے تو وہ کبھی اتنی خوب صورت نہ لگی تھی یا شاید بلال نے ہی ایسی نظر سے نہ دیکھا تھا۔

''چل اب...... جانے بھی دے۔ ہمسائے کا حق رشتے داروں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ میں نے تجھ پر کوئی احسان نہیں کیا، اچھا یہ کینو دے ادھر۔'' اس کے ہاتھ سے چھیلا ہوا کینو بے تکلفی سے کھینچ کر وہ لاپروائی سے بولی۔ کتنی پیاری لگ رہی تھی نا وہ...... حق جتاتی ہوئی، کاش! وہ ہمیشہ کے لیے اس کی ہو جائے۔

''پھوپھو! ہوم ورک کرلیا ہے۔'' اتنے میں رایان اس کا بھتیجا آیا۔

''لاؤ، چیک کرواؤ۔'' کہتے ہوئے وہ دیوار سے پرے ہٹ گئی۔

تجھ سنگ لڑے نیناں

دل میرا بس چاہے، تجھے دیکھتے ہی رہنا

وہ ایک دم فریش ہوگیا۔ گنگناتا ہوا وہ پھر سے کینو چھیلنے لگا تھا۔

☆☆☆

''اماں دیکھ نا، تجھے فکر ہے نا چھوٹی کے جہیز کی۔ اماں میں تیرے قدموں میں بیٹھ کر وعدہ کرتا ہوں کہ میں چھوٹی کا سارا جہیز اپنے پیسوں سے بنواؤں گا۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل ہوگی، تجھے میری فیس کا بھی خرچا نہیں کرنا پڑے گا۔ اماں چولہے میں جھونک ایسی پڑھائی، تجھے تو اماں میں سونے میں پیلا کردوں گا۔'' وہ اماں کے گھٹنے دباتے ہوئے منتوں پر اتر آیا۔

''چل ہٹ، کم بخت مارے...... تُو تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے رکشہ نہیں چلائے گا، ولایت جائے گا۔'' اماں نے ڈانٹ پلا کر رکھ دی۔

''اماں! ولایت سے تو اچھا ہے یہ رکشہ چلانا۔

بس اماں میں نے کہہ دیا، ابا کو قائل کرنا تیرا کام ہے۔ یہ کتابیں ساری تندور میں جلیں گی اور اگر مہینے کے اندر اندر مجھے رکشہ نہ لے کر دیا تو میں نہر والے پُل سے چھلانگ لگا دوں گا یا چاچا بوٹے کی دکان سے گولیاں لے کر کھا جاؤں گا۔'' وہ اکتا کر الٹی سیدھی باتوں پر آ گیا۔ اماں نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا، وہ بڑا پھنے خان بن کر میز کو ٹھوکر مارتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

''ماؤں کو منانا کون سا مشکل کام ہے، اب اماں منائے ابے کو کیسے بھی کرکے۔'' ایک باغیانہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھیل گئی۔

☆☆☆

''یہ سب میری ماں کی دعا ہے۔'' رکشے پر موٹے موٹے حروف سے بنی عبارت پر عدنان نے ہاتھ پھیرا تو گرد اس کی انگلی کی پور پر لگ گئی۔ ایک نظر خوشی سے پھولے نہ سماتے بلال کو دیکھا، جیسے اسے رکشہ نہ ملا ہو، کوئی قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔

''کوئی نہ بابا جی! جو ماں کو ستاتا ہے وہ رکشہ ہی چلاتا ہے۔'' عدنان نے اس کی کمر پر تھپکی دے کر طنزیہ انداز میں کہا۔

''اچھا جی، بہت خوب کہی اور تم جو گدھا گاڑی پر روز شہر میں سبزی بیچنے جاتے ہو۔ پھٹے ڈھول جیسی آواز نکال کر، وہ کیا ہے؟ وہ تو پھر پورے ملک کی بددعا لگتی ہے مجھے۔ سارے خاندان کی پھٹکار۔'' بلال حقیقتاً غصے میں آ گیا۔ عدنان کا قہقہہ بلند ہوا۔

''یہ لے ساگ، اماں نے بھیجا ہے۔'' عدنان نے اپنے آنے کا مقصد واضح کیا۔

''دیسی ساگ ہے، تازہ پتوں والا۔'' عدنان نے تھیلا اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

''خالہ سے کہنا تڑکہ لگا کے پکائے۔'' بلال جو مسلسل مصنوعی غصے سے دیکھ رہا تھا، اب اس کی بات پر ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''ہاں اپنی ریڑھی سے اٹھا لایا ہوگا۔ بکا نہیں ہوگا تو......'' بلال نے سو فیصد صحیح اندازہ لگایا تھا۔

''اوئے رکشے والے بابو! آم کھانے سے غرض ہونی چاہیے، پیڑ گننے سے نہیں۔'' عدنان نے ہنس کر کہا۔

☆☆☆

اور پھر وہی ہوا۔ جو اس نے سوچ رکھا تھا۔

UrduBooks.pk

پروین چاچی تو کوئی شش و پنج تو بہت دور، راضی خوشی مان گئیں۔

"وے بلو! میں تو کہتی ہوں کہ میری تے (تو) ساری فکر ہی دور ہوگئی ہے۔ اب اساور تیرے ساتھ ہی آئے جائے گی۔ کہاں میری بچی بسوں پر لٹک کے جاتی تھی، اچھا ہے، بہت پیارا ہے رکشہ تیرا، ماشاءاللہ۔ اللہ تیری کمائی میں برکت ڈالے۔" پروین چاچی کی رضا مندی پر اس کے اندر کئی سو والٹ کے بلب روشن ہوگئے۔ چہرہ جگر جگر کرنے لگا، آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں اور اگلے دن وہ نور نظر اس کے پیچھے رکشے میں بیٹھی تھی۔ بلال کا دل چاہا کہ یہ لانگ ڈرائیو ختم ہی نہ ہو۔ بیک ویو مرر سے وہ وقتاً فوقتاً اسے دیکھ رہا تھا۔

"وے بلو! تم نے اچھا نہیں کیا۔ یہ بھلا کیا تک بنتی تھی، پڑھائی چھوڑ کے رکشہ چلانے کی۔ تجھے عزت کی زندگی راس نہیں ہے نا، یوں سڑکوں کی خاک چھاننے لگا۔ اوپر سے چاچی کو بھی تنگ کیا اور چاچا کو بھی الگ پریشان کیا۔" آخر کار وہ بول ہی پڑی۔ بلال دلکشی سے مسکرا دیا۔

"بس جی کچھ مجبوریاں تھیں۔" وہ نظریں نیچی کر کے بولا۔

"ایسی کیا مجبوری تھی بلو! جو تجھے ماں باپ سے بغاوت کرنے پر مجبور کر گئی۔ دیکھ بلو! کوئی بھی کام ہو، ماں باپ کی دعاؤں اور پیار کے سائے تلے شروع کرنا چاہیے اور تجھے پتا ہے چاچی چاچا کتنے ناخوش تھے پھر بھی تیری ضد کے آگے ہار مان گئے۔" وہ ماسی سکینہ بن کر اسے سمجھا رہی تھی۔

"کل تجھے بتاؤں گا کہ کیا مجبوری تھی۔ پر تو مجھ سے وعدہ کر کہ تو میری پوری بات سنے گی۔" وہ بولا۔

"ہاں ٹھیک ہے تو تو گوانڈی (ہمسایہ) ہے میرا۔ بھلا تیری مجبوری کیسے نہیں سمجھوں گی۔" وہ معصومیت سے بولتی ہوئی بلال کو ساری دنیا سے اچھی لگی تھی، اس نے یوٹرن لیتے ہوئے بیک ویو مرر سے اسے دیکھا تھا۔

☆☆☆

آتشی رنگ کی قمیص کے اوپر ہلکے آسمانی رنگ کی جالی دار جرسی اور اسی کی ہم رنگ شال اوڑھے، سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی وہ رکشے میں بیٹھ گئی۔

"ہائے بلو! بڑی ٹھنڈ ہے آج۔" وہ بیٹھتے ہی ہتھیلیاں آپس میں رگڑنے لگی۔ بلال نے مسکراتے ہوئے اپنا مفلر ٹھیک کیا۔

"اساور! آج کتنے بجے چھٹی ہوگی؟" بلو نے بے اختیار ہی پوچھا۔

"لے بھلا، پندرہ دن ہوگئے ہیں، تجھے چھٹی کا ٹائم نہیں پتا...... اسی ٹائم پر ہی ہوتی ہے۔" اساور لاپرواہ انداز سے بولی۔

"نہیں اساور! وہ تجھے مجبوری بتانی تھی نا اپنی۔ اسی لیے اگر آدھی چھٹی لے لے تو کہیں چل کر بات کر لیتے ہیں نا۔" دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے اس نے رویے اور لہجے کو حتی الامکان نارمل رکھنے کی کوشش کی۔ مبادا کہ اساور کو کوئی شک ہو جائے۔

"ویسے بلو! ایسی بھی کیا مجبوری ہے، میرا مطلب ہے کہ تو یہیں بتا دے۔" اساور کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔" بلال نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"چل پھر مجھے آج بارہ بجے لینے آجانا۔" تھوڑے شش و پنج کے بعد وہ مان گئی۔ بلال کے دل میں جہاں خوشیوں کے باغ کھل اٹھے تھے، وہیں پر یہ پریشانی بھی اس کا دل دہلا رہی تھی کہ اساور بھلا کیا سوچے گی۔

کتنا بھروسا کرتی ہے نا پروین چاچی اس پر، کیا وہ ان کے بھروسے کو توڑ دے گا؟ کیا وہ اساور کے اعتبار کو جو وہ اس پر ہمسایہ ہونے کی حیثیت سے کرتی ہے، کرچی کرچی کر دے گا؟ کچھ سوچ کر اس نے لب بھینچ لیے اور اپنا موبائل جیب سے نکال کر عدنان کو فون کیا اور اسے اپنا مسئلہ بتایا۔

"چل ویرے، بھگت اب۔" عدنان نے بے حسی کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔

"دیکھ یار! بھائی بن کر بتادے۔" بلال بے بسی سے منتوں پر اتر آیا۔ عدنان کا قہقہہ بلند ہوا۔ بلال غصے کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

"دیکھ بھائی! سیدھی اور صاف بات بتا رہا ہوں، اپنی تو اگلی پچھلی سات پشتوں میں سے کوئی عاشق نہ نکل پایا۔ یہ آلو پیاز بیچتے ـــ گھر کی دال روٹی چل پاتی ہے، پیٹ کی پوری پڑ جائے تو یہی عافیت ہے۔ دل کی سننے کی فرصت ہی کہاں ہے؟ بھائی بن کر کہہ رہا ہوں، سیدھے سیدھے ماں باپ کی پسند سے شادی کرنا، گھر بسانا، دو چار بچے پیدا کرنا...... کیوں ان جھمیلوں میں پڑ رہا ہے؟ پہلے ہی تُو نے خالہ، خالو کو اتنا قرض دار کردیا ہے۔ اب انہیں مزید پریشانی مت دے، چل اب......

اے آلو لے، پیاز لے، پالک لے، بھنڈی توری لے، بینگن لے......" عدنان فون بند کرنا بھول گیا تھا شاید، اس لیے اس کی سبزی بیچنے کی آواز فون سے آرہی تھی۔ بلال نے غصے سے فون بند کیا۔

"کمینہ اے تُو اک نمبر دا۔" بلال نے میسج کیا۔

"یار ڈر لگ رہا ہے، کچھ بتادے ورنہ میں تجھے ڈنڈے مار مار کے لنگڑا کردوں گا۔ پھر تو کیسے بیچتا ہے، آلو پیاز اور پوری کرتا ہے دال روٹی۔" بلال نے میسج پر میسج کیے، مگر عدنان سکون سے یہ کہہ کر بری ہوگیا کہ

"جب اوکھلی میں سر دیا ہے تو موصلوں سے کی ڈر؟" بلال کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی اور ڈر کہیں دور بھاگ گیا۔

☆☆☆

"اساور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آپ کو اتنا اچھا لگنے لگ جاتا ہے کہ آپ کا دل چاہتا ہے کہ بس اسی راستے چلتے جاؤ، جہاں وہ ہے، بس وہی منزل ہے۔ اساور میں جھوٹ نہیں بول رہا، میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا ہے اور مجھے اسی احساس نے مجبور کیا ہے کہ میں رکشہ لے کر تمہاری ڈرائیوری کروں۔ تمہیں بسوں میں خوار نہ ہونا پڑے۔ تمہیں میرے علاوہ کوئی نہ دیکھے بس اساور...... جب تم نے مجھے بچایا تھا، تب سے ایسا میٹھا احساس میرے اندر جاگنا شروع ہوا کہ اس نے سلگتے انگارے کی شکل اختیار کرلی۔ پھر دھیرے دھیرے یہ آگ پورے دل کو اپنی لپیٹ میں لینے لگی۔ دیکھو اساور! تم مجھے غلط مت سمجھنا، وہ انگریزی میں کہتے ہیں نا، آئی لو یو...... ہاں وہی' بس آئی لو یو۔" شہر کی چھوٹی سی مارکیٹ میں بنی فاسٹ فوڈ کی دکان پر بیٹھی برگر کھاتی ہوئی اساور کے ہاتھ سے برگر یک دم پلیٹ میں گر گیا۔

"بلو......!" اساور کے انداز میں بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔ بلال ایک دم گھبرا گیا، نہ جانے اگلے ہی پل کیا ہونے والا تھا۔ اساور کے تیور دیکھ کر تو یہی لگ رہا تھا کہ یا تو وہ اپنا جوتا اتارے گی اور اس کے سر پر برسانا شروع کردے گی یا پھر غصے میں یہاں سے چلی جائے گی۔

اساور ایک دم کھڑی ہوگئی، بلال نے اتنی ٹھنڈ میں ماتھے پر آیا پسینہ صاف کیا۔

"تو گھر چل......" اساور نے دانت پیسے۔ وہ آرام سے رکشہ چلا کر گھر تک آیا۔ تب تک ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ خاموشی سے رکشے سے اتری اور گھر میں داخل ہوگئی۔ بلال ساری رات ایک پل کے لیے بھی سو نہ پایا۔

"عدنان ٹھیک ہی کہتا تھا کہ نہ کرو۔" اسے عدنان کی باتیں یاد آئیں۔ نجانے اساور کی خاموشی کے پیچھے کیا طوفان چھپا تھا۔ ڈر، خوف، اندیشے، وسوسے، خدشات...... بلال کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ کچھ بھی کرلیتا، تھا وہ چھوٹے سے گاؤں کا سادہ مزاج اور شریف النفس لڑکا تھا...... جس کے بزرگ بے حیائی کا نہیں، عزت و احترام کا سبق پڑھاتے ہیں۔ وہ کروٹیں بدلتا اس وقت کو کوسنے لگا جب اس نے اماں سے رکشہ لینے کی ضد کی تھی۔

اگلی صبح حسب معمول رکشہ لے کر اساور کو پک کیا۔

"مجھے اسکول مت چھوڑنا۔" اساور کے کہنے پر اس نے ایک دم مڑ کر دیکھا۔

UrduBooks.pk

"او۔ نچے پل سے آگے جو ہاؤسنگ اسکیم بن رہی ہے نا، شہر کے راستے...... وہاں پر رکشہ لے لو۔" اساور نے کہا۔

"کہیں غنڈوں سے مار تو نہیں پڑوانی۔" بلال خاصا ڈر کے پوچھا تو اساور کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"ابھی تو نہیں، البتہ میری کچھ شرائط ہیں اگر وہ نہ مانو گے تو غنڈوں سے نہیں خود اپنے ہاتھوں سے پیٹوں گی تمہیں۔" اساور کا اچھا موڈ دیکھ کر بلال نے شکر کا سانس لیا۔ ورنہ خوف سے تو کل کی سانس بھی اٹکی ہوئی تھی۔

"ہاں ہاں بولو کیا شرائط ہیں؟" ہاؤسنگ سوسائٹی میں رکشہ ایک جگہ کھڑا کر کے وہ دونوں باہر نکل آئے اور قریب بنے چھوٹے سے پارک میں بیٹھ گئے۔ بلال نے مسکرا کر پوچھا۔

"بلو! تم اپنی پڑھائی دوبارہ شروع کرو۔ دیکھو میں نے بی اے کیا ہے، آگے ایم اے میں داخلہ لے رکھا ہے۔ دیکھو تم دل کے اچھے انسان ہو، مگر بلو! کب تک ہم اپنے خاندان کی اپنی فرسودہ روایات کی پیروی کرتے رہیں گے۔

تمہارے ابا مزارعے کا کام کرتے ہیں اور تم رکشہ چلاتے ہو تو یہ کوئی اتنا بڑا کام تو نہیں...... سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمہارے اماں ابا کو بھی تمہیں پڑھانے کا بے حد شوق ہے۔ دیکھو میرے جتنا پڑھ لو، باقی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اساور نے اتنی بڑی بات چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دی۔

"سچ اساور......؟" بلال کی آنکھوں میں خوشی کے دیے جلنے لگے۔ رگ رگ میں طمانیت اتر آئی۔

"ہاں نا شیدائی جھلا۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہے۔ ویسے بھی تُو تو اپنا گوانڈی (ہمسایہ) ہونے کے ساتھ ساتھ میری چاچی کے ابے کے بھائی کے بیٹے کے سالے کا دوست بھی تو ہے نا۔" اساور نے لمبی چوڑی رشتے داری بتائی تو بلال کو ہنسی آ گئی۔

"چل فیر بھلیے لوکے، تُو نے کہہ دیا تو سمجھ تیرے پیچھے آنے والا یہ "ہیر" تجھے بنا کے ہیر دتو بن ہی گیا ہے۔ اب اپنی ماں کا ہیرا بھی بن جائے گا۔" بلال نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔

☆☆☆

بلال کی زندگی کا نہایت خوش گوار موڑ شروع ہو گیا تھا، اساور جیسی معصوم، نیک دل، بے ریا سی، دیسی گڑیا نے اس کی زندگی میں خوشیوں اور مسرتوں کے پھول کھلا دیے تھے۔ صبح وہ اساور کو رکشے میں اسکول چھوڑ کر آتا۔ اب شہر کے اسکول میں جانے والے کئی بچے بھی اس کے رکشے پر جانے لگے تھے۔ پک اینڈ ڈراپ کے دورانیے میں وہ کئی لوکل سواریاں بھی اٹھا لیتا تھا۔ اس طرح اچھا خاصا کرایہ ہو جاتا۔ لوکل سواریوں کا کرایہ لا کر وہ اماں کو دیتا اور ماہانہ کرایہ وہ جمع کر لیتا۔

اساور کے کہنے پر اس نے نزدیکی کالج میں انجینئرنگ میں ایوننگ کلاسز میں اپلائی کر دیا تھا۔ ذہین تو وہ پہلے سے تھا...... وہ الگ بات کہ اساور کی وجہ سے اس کا دھیان پڑھائی سے ہٹ گیا تھا۔ مگر اب اساور کے کہنے پر اس نے پڑھائی دوبارہ شروع کر لی۔ اساور اب اس کا سب کچھ تھی۔ اس کو زندگی کا صحیح روپ سمجھانے اور صحیح مطلب بتانے والی......

اسے یوں لگتا تھا جیسے اساور اس کی کسی نیکی کا صلہ ہے۔ نہ کوئی ظالم سماج بیچ راستے میں آیا، نہ کوئی مسلک برادری کا پھڈا تھا۔ اساور اس کی نورِ نظر تھی اور وہ اساور کا منظورِ نظر بننے لگا تھا۔ بس اب انتظار تھا تو اس کا کہ اساور کا ماسٹرز مکمل ہو جائے اور اس کی انجینئرنگ......

☆☆☆

دو سال بعد......

اساور کے دل پر بلال کی محبت اور سچائی کا رنگ بہت پکا ہو گیا تھا اور بلال کے انگ انگ میں اساور کی پاکیزہ اور عقیدت سے بھری محبت کا چڑھا ہوا رنگ ساری دنیا کو دکھ رہا تھا۔ وہ دونوں اپنے دل کی اس رنگین رنگ میں رنگی دنیا سے بہت خوش تھے۔ اوپر بیٹھے کاتب تقدیر نے مسکرا کر اس مبارک گھڑی کو دیکھا تھا۔

☆

میری ناکامی کا افسانہ بھی کیا افسانہ تھا
بجھ رہی تھی شمعِ محفل، رقص میں پروانہ تھا

ملتی جلتی داستاں وجہِ غلط فہمی ہوئی
آپ شرمندہ نہ ہوں یہ میرا ہی فسانہ تھا

کشمکش کی زد میں تھا انسان کا ذوقِ بندگی
ایک جانب تیرا کعبہ، اک طرف بت خانہ تھا

میرے غم انگیز نغمے جانِ محفل بن گئے
ورنہ تیرا سازِ مطرب سوز سے بیگانہ تھا

ان کی آنکھوں نے کبھی بخشا تھا کیفِ بے خودی
زندگی مسرور تھی اور وجد میں مے خانہ تھا

آبدیدہ ہو گئے اہلِ ستم بھی اے شکیب
ہائے کتنا سوز میں ڈوبا ہوا افسانہ تھا

شکیب جلالی

یہ وصال ہے کہ فراق ہے دلِ مبتلا کو بتا رہے
جو یہ پھول ہے تو کھلا رہے، جو یہ زخم ہے تو ہرا رہے

ترے انتظار کے سلسلے ہیں میانِ دشت و در کہیں
یہ آس ہے تو بندھی رہے یہ چراغ ہے تو جلا رہے

یوں ہی بھولے بھٹکے جو آ گئے ہیں ادھر تو آتی ہوا نہ دے
کہ غبارِ کوئے ملامتاں کوئی واقعہ تو چھپا رہے

کسی چشمِ وعدہ کی لہر ہے بڑا دل گرفتہ یہ شہر ہے
سو ہوائے محرمِ دوستاں ترے سلسلوں کا پتا رہے

یہ سرائے صبح کے ساتھ ہی مجھے چھوڑتی ہے غزالِ شب
تری چشمِ رمز و کنایہ میں کوئی خواب ہے تو سجا رہے

سلیم کوثر

UrduBooks.pk

حال ہمارا پوچھا ہم سے چلتے چلتے تو نے بھی
سیکھ لیے ہیں بیگانوں کے طور طریقے تو نے بھی

شکوہ شکایت کیا دُنیا سے دُنیا پیارے دُنیا ہے
دُکھ تو فقط اس بات کا ہے الزام تراشے تُو نے بھی

اپنی زباں سے بھی کچھ باتیں نکلی ہوں گی جھوٹ نہیں
کچے ایک ہمیں نہیں نکلے، بھید بتائے تُو نے بھی

میں نے بھی یہ بات نہ سوچی کون پڑوس میں رہتا ہے
کچھ کچھ بے پروائی برتی پہلے پہلے تُو نے بھی

چاہے اب تُو بُرا منائے صاف کہیں گے ہم تو بشیرؔ
لکھ لکھ کر خط اپنی راہ میں کانٹے بوئے تُو نے بھی

بشیر احمد بشیرؔ

طلب کریں بھی تو کیا کوئی مدّعا بھی نہیں
ہمارے چاہنے پر کچھ یہاں ہوا بھی نہیں

ہمارا حال کسی پر کُھلے بھلا کیسے
غمِ فراق ہے پر ضبط سے سوا بھی نہیں

سبھی کو بھولے ہوئے کام یاد آنے لگے
ہمارے ساتھ کوئی دو قدم چلا بھی نہیں

سُنے گا کون کہ سب اپنے آپ میں گم ہیں
سُنائیں کیا کہ سُنانے کو کچھ رہا بھی نہیں

ثواب کیا کوئی اپنے حساب میں نکلے
یہ عشق تھا، سو سلیقے ڈھنگ کیا بھی نہیں

علی اکبر عباس

UrduBooks.pk

اسے ساتھ رکھیں

اقبالِ جرم

ایک جیل میں ہر ہفتے ایک مشہور کلاسیکل استاد بلائے جاتے تھے اور قیدیوں کو ان کے سامنے بٹھا کر گانا سنایا جاتا تھا۔ ایک دن محفلِ موسیقی کے اختتام پر استاد نے خوش ہو کر جیلر سے پوچھا۔

"قیدیوں کے لیے کلاسیکل موسیقی اچھی تفریح ہے۔"

"تفریح کا تو علم نہیں۔" جیلر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"البتہ آپ کے گانے کی وجہ سے تین خطرناک قیدیوں نے اقبالِ جرم کرلیا ہے۔"

عینک

امپائر نے ایک کھلاڑی کو ایل بی ڈبلیو قرار دے دیا، کھلاڑی بہت خفا ہوا۔ پویلین کی طرف واپس جاتے ہوئے سفید کوٹ والے شخص سے مخاطب ہوا۔

"جس طرح تم نے مجھے ایل بی ڈبلیو دیا ہے۔ اس سے مجھے یقین ہوگیا ہے کہ تمہیں عینک کی ضرورت ہے۔"

"عینک کی ضرورت مجھے نہیں تمہیں ہے۔" سفید کوٹ والے نے جواب دیا۔ "کیونکہ میں امپائر نہیں آئس کریم والا ہوں۔"

خواہش

ایک بزرگ کسی گاؤں میں گئے اور دیکھا کہ ایک خاتون بیٹھی رو رہی ہے۔

انہوں نے اس سے رونے کی وجہ پوچھی تو خاتون نے بتایا کہ......

"اس کی شادی کو دس سال ہوگئے ہیں مگر ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہوئی۔"

بزرگ نے کہا "تم پریشان مت ہو میں مزار پر جا کر تمہارے نام کا چراغ جلاؤں گا۔"

وہ بزرگ دس سال بعد اسی گاؤں میں دوبارہ آئے تو دیکھا کہ اس خاتون کے اردگرد دس بچے کھیل رہے تھے۔ بزرگ نے پوچھا کہ "یہ بچے کس کے ہیں؟"

خاتون نے جواب دیا۔ "یہ سب میرے بچے ہیں۔"

بزرگ نے پوچھا کہ "تمہارا شوہر کہاں ہے؟"

خاتون بولی "وہ مزار ڈھونڈ کر چراغ بجھانے گیا ہے۔"

(نیہا کاکڑ۔ لاہور)

کیمرے

دادا: "ایک زمانہ تھا جب میری جیب میں صرف دو روپے ہوتے تھے اور میں اسٹور سے دودھ، دہی، گھی، دالیں اور سبزیاں لے آتا تھا۔"

پوتا: "اب یہ حرکتیں نہیں چلتیں اب وہاں کیمرے لگ گئے ہیں۔"

(رومان احمد...... اسلام آباد)

طریقہ

رات کمرے کا لاک خراب ہوگیا تو بیوی نے ٹارچ لی اور مجھے ساتھ لے جا کر ٹھیک کرنے چلی۔

Monthly Shuaa October 2018
UrduBooks.pk

بیوی نے ٹارچ مجھے تھمائی اور خود لاک کھولنے میں مصروف ہوگئی۔
خاصی دیر گزر گئی لیکن لاک کھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔
بیوی کا پارہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا۔
پھر اس نے ٹارچ خود پکڑی اور مجھ سے کہنے لگی۔
''تم ٹرائی کرو'' میں نے کوشش کی تو لاک فوراً کھل گیا۔

بیوی مجھ پر برس پڑی اور کہنے لگی۔
''اب پتا چلا کہ ٹارچ کیسے پکڑتے ہیں۔''

خوشی

''یہ ریوالور کی نال جو تمہاری پسلیوں میں چبھ رہی ہے۔ کیا تم اس کا مطلب سمجھتی ہو؟'' ڈاکو نے غراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔
''اوہ میرے خدا۔'' ڈاکا زنی کا شکار عورت نے خوشی سے چیخ کر کہا۔
''اس کا مطلب ہے کہ میں اپنا وزن کم کرنے میں کامیاب ہوگئی ہوں۔''

پریشانی

ایک مشہور بزنس مین نے پوسٹ آفس فون کیا
''کچھ عرصے سے مجھے نہایت دھمکی آمیز خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ کیا آپ یہ سلسلہ بند کرانے میں میری مدد کر سکتے ہیں؟''
''کیوں نہیں! کچھ اندازہ ہے کہ خطوط کہاں سے آ رہے ہیں؟'' پوسٹ ماسٹر صاحب نے پوچھا۔
''جی ہاں! انکم ٹیکس ڈپارٹمنٹ سے۔'' بزنس مین نے جواب دیا۔

اظہار رائے

''تم نے ٹی وی پر وہ پروگرام دیکھا تھا جس میں گاجر کی کھیر بنانا سکھائی گئی تھی۔''
ایک لڑکی نے اپنی سہیلی سے پوچھا۔
''ہاں دیکھا تھا مگر مجھے پسند نہیں آیا۔'' سہیلی نے جواب دیا۔
''لیکن کیوں؟ میں نے تو کھیر بنا بھی لی تھی اور بہت مزے کی بنی تھی۔'' لڑکی کھیر کے ذائقے کو یاد کر کے بولی۔
''ارے دفع کرو۔ کھیر تو سب کو بنانا آتی ہے۔ مزا تو تب ہے جب وہ گاجر بنانا سکھاتی۔'' سہیلی بے زاری سے منہ بناتے ہوئے بولی۔

شیخ صاحب

ایک شیخ نے اپنے دوست کو کھانے پر مدعو کیا۔
دسترخوان بچھا دیکھا تو صرف ابلے ہوئے چاول تھے۔ کھانا شروع ہوا تو تھوڑی دیر بعد شیخ کی بیوی نے دستک دی اور بولی۔ ''مرغی لے آؤں؟''
شیخ نے کہا۔ ''ابھی نہیں۔''
دوست کو بہت برا لگا لیکن مروت کے مارے خاموش رہا۔ تھوڑی دیر بعد پھر شیخ کی بیوی بولی۔
''مرغی لے آؤں؟'' دوست سے اب رہا نہ گیا، اس نے شیخ سے کہا ''آنے دو یار!'' لیکن شیخ خاموش رہا۔
جب چاول ختم ہوگئے تو شیخ نے خود آواز لگائی کہ ''مرغی لے آؤ۔'' جب مرغی لائی تو دوست نے دیکھا مرغی زندہ ہے۔ اس نے حیران ہو کر کہا، کیا ماجرا ہے؟''
شیخ صاحب بولے۔ ''جناب یہ دسترخوان سے گرے ہوئے چاول، چگنے کے لیے رکھی ہے۔ آپ جو سوچ رہے ہیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔''

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... فرینہ اعجاز
میک اپ ... روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ..... موسیٰ رضا

UrduBooks.pk

شگفتہ جاہ

یادوں کے خزانے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے (اس کے گناہوں کی) سزا جلد ہی دنیا میں دے دیتا ہے (یعنی تکلیفوں اور آزمائشوں کے ذریعے اس کے گناہوں کی معافی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔)

اور جب اپنے بندے کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے اس کے گناہ کی سزا (دنیا میں) روک لیتا ہے۔ یہاں تک کہ قیامت والے دن اس کو پوری سزا دے گا۔"

خود احتسابی،

یہ ہر کوئی جانتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو زندگی کس طرح بسر کرنی چاہیے لیکن یہ کوئی نہیں جانتا اسے خود اپنی زندگی کس طرح بسر کرنی چاہیے۔

(پاؤلو کوئیلو)

عمل،

ہر عمل سوچ سمجھ کر کرو، کیونکہ ہر عمل کے اندر اس کا انجام یوں چھپا ہوتا ہے جیسے بیج کے اندر درخت۔

اقرأ، نمرہ۔ کراچی

غور طلب،

- بیدار کر دینے والا غم، غافل کر دینے والی خوشی سے بدرجہا بہتر ہے۔
- کوئی گزرا ہوا لمحہ دوبارہ نہیں آتا، کوئی گزرا ہوا دن دوبارہ نہیں آسکتا، نہ یوم پیدائش دوبارہ آتا ہے نہ یوم وصال۔ کسی یوم کو منانے کا تصور۔ غور طلب ہے۔
- سب سے بڑی خواہش ہر انسان کو خوش کرنے اور اسے متاثر کرنے کی خواہش ہے اور اس کی سزا یہ ہے کہ انسان نہ متاثر ہوں گے نہ خوش۔
- بہتر ہے کہ گناہ نہ کرو، اور اپنے کسی گناہ کو ہرگز کسی انسان کو نہ بتاؤ۔

(واصف علی واصف)

طٰہٰ مصطفیٰ۔ فاروق آباد

جھوٹ کی نشانیاں،

- جھوٹ بولنے والا نظریں نہیں ملاتا۔
- پلکیں زیادہ جھپکاتا ہے۔
- اس کی آنکھوں کی پتلیاں زیادہ پھیلی ہوتی ہیں۔
- اس کی آواز خواہ مخواہ تیز ہو جائے گی۔
- وہ اچانک بات شروع کرتا ہے اور جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
- سوالات کا سامنا کرنے سے کتراتا ہے۔
- بات کرتے وقت ہاتھ ملے گا، انگلیاں چٹخائے گا اور چہرے پر ہاتھ پھیرے گا۔

نورے محمد۔ بورے والا

دنیا سے محبت،

- آنسوؤں کا جاری نہ ہونا دل کی سختی کی وجہ سے ہے۔
- دل کی سختی گناہوں کی کثرت کی وجہ سے ہے۔
- گناہوں کی کثرت موت کو بھولنے کی وجہ سے ہے۔
- موت سے غفلت لمبی امیدوں کی وجہ سے ہے۔
- لمبی امیدیں دنیا سے محبت کی وجہ سے ہیں۔

نتیجہ۔ دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔

نادیہ یاسر۔ کراچی

تکبر

تکبر چاہے دولت کا ہو، طاقت کا ہو، نہ تبے کا ہو، حیثیت کا ہو، حسن کا ہو، علم کا ہو، حسب ونسب کا ہو، حتیٰ کہ تقویٰ کا ہی کیوں نہ ہو، انسان کو رسوا کر کے ہی چھوڑتا ہے۔

عذرا ناصر، اقطی ناصر۔ کراچی

لفظ باتیں کریں

دکھ صرف بچھڑنے کا نہیں ہوتا بلکہ کبھی کسی سے ملنے کا بھی ہوتا ہے۔ جب کوئی بہت پرانا ہمدم ساتھی برسوں بعد لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں سردمہری سجا کر ملے تو یہ فیصلہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ اس دوست سے بچھڑنے کا دکھ زیادہ تھا یا ملنے کا۔

(خلیل جبران)

نوال افضل گھمن۔ کراچی

اہل ایمان کی حق گوئی

خلیفہ مہدی ایک بار حج کرنے گیا تو اس نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ امام سفیان ثوریؒ کو اس کے سامنے حاضر کیا جائے۔ انہوں نے رات کے وقت امام سفیان کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور انہیں گرفتار کر کے مہدی کے پاس لا کر حاضر کیا۔

خلیفہ مہدی نے آپ کو اپنے پاس بٹھایا اور عرض کیا۔

”امام صاحب! آپ ہمارے پاس کیوں تشریف نہیں لاتے کہ ہم آپ سے اپنے معاملات میں مشورہ کیا کریں۔ آپ جس بات کا حکم دیں گے ہم اسے اختیار کریں گے اور جس بات سے آپ روکیں گے، اس سے باز رہیں گے۔“

آپ نے دریافت فرمایا۔ ”اس سفر میں تم نے کتنی رقم خرچ کی ہے؟“

خلیفہ مہدی بولا۔ ”اس سلسلے میں میرے خزانچی اور سیکریٹری بتا سکتے ہیں، میں کچھ نہیں جانتا۔“

یہ سن کر آپ نے فرمایا۔ ”جب کل قیامت کے دن تم اللہ کے حضور حاضر ہو گے اور وہ تم سے ان اخراجات کے بارے میں باز پرس کرے گا تو کیا جواب دو گے؟ حضرت عمرؓ بن خطاب نے جب حج کیا تھا تو انہوں نے اپنے غلام سے پوچھا کہ اب تک اس سفر میں کیا خرچ ہوا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ اٹھارہ دینار خرچ ہوئے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

”ستیاناس ہو، ہم نے مسلمانوں کے بیت المال پر بہت زیادہ بار ڈال دیا ہے۔“

امام ثوریؒ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تجھے وہ روایت تو معلوم ہی ہو گی جو منصور بن عمار نے ہم سے بیان کی ہے، بلکہ تو خود اس مجلس میں موجود تھا اور اس روایت کو قلم بند کر رہا تھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ اور رسول کے مال کو اپنی خواہشات کے مطابق خرچ کرنے والے قیامت کے دن نارِ جہنم میں ڈالے جائیں گے۔“

خلیفہ مہدی کے ایک حاشیہ بردار سیکریٹری ابوعبید نے امام ثوریؒ کو مخاطب کر کے کہا۔

”آپ امیرالمومنین کے سامنے ایسی باتیں کر رہے ہیں؟“

امام ثوریؒ نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔

”چپ رہ! فرعون کو ہامان نے اور ہامان کو فرعون نے اسی طرح برباد کیا تھا۔“

یہ کہہ کر امام ثوریؒ اٹھے اور اٹھ کر باہر چلے گئے۔ خلیفہ صرف انہیں دیکھتا رہا مگر کچھ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

اللہ کا ذکر

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ”اللہ کا ذکر پابندی سے کرو کیونکہ یہ تو سراسر شفا ہے اور انسانوں کے تذکرے سے بچو کیونکہ یہ سراسر بیماری ہے۔“

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

”اگر ہمارے دل پاک ہوتے تو اللہ کے ذکر سے کبھی نہ اکتاتے۔“

حضرت علیؓ کا زہد

حضرت ہبیرہ رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں جب علی ابن ابی طالبؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا۔

"اے لوگو! آج رات ایسی ہستی دنیا سے اٹھا لی گئی ہے جن سے پہلے لوگ آگے نہیں جا سکے اور جنہیں پچھلے لوگ پا نہیں سکیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کسی جگہ بھیجتے تو انہیں دائیں طرف سے حضرت جبرائیلؑ اور بائیں طرف سے میکائیلؑ اپنے گھیرے میں لے لیتے اور جب تک اللہ انہیں فتح نہ دے دیتے یہ واپس نہ آتے۔ یہ صرف سات سو درہم چھوڑ کر گئے ہیں۔ آپ اس سے ایک خادم خریدنا چاہتے تھے۔ آج ستائیس رمضان کی رات میں ان کی روح قبض کی گئی ہے۔ اسی رات میں حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو آسمانوں کی طرف اٹھایا گیا۔ ایک روایت میں ہے وہ سونا چاندی کچھ نہیں چھوڑ کر گئے صرف سات سو درہم چھوڑ کر گئے ہیں۔ جو ان کے بیت المال میں سے ملنے والے وظیفے میں سے بچے ہیں۔"

خیر خواہی کرو

حضرت یزید بن اصم رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ شام کا ایک آدمی بہت طاقت ور اور خوب لڑائی کرنے والا تھا۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا کرتا تھا۔ وہ چند دن حضرت عمرؓ کو نظر نہ آیا تو اس کے متعلق پوچھا۔

لوگوں نے کہا۔ "اے امیر المومنین! اس نے تو شراب پینی شروع کر دی ہے اور مسلسل پی رہا ہے۔"

حضرت عمرؓ نے اپنے منشی کو بلا کر فرمایا۔ "خط لکھو۔"

یہ خط عمر بن خطاب کی طرف سے فلاں کے نام۔

سلام علیک!

میں تمہارے سامنے اس اللہ کی تعریف کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ گناہوں کو معاف کرنے والا، توبہ قبول کرنے والا۔ سخت سزا دینے والا اور بڑا انعام و احسان کرنے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔"

پھر حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا۔

"تم لوگ اپنے بھائی کے لیے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کے دل کو اپنی طرف متوجہ فرما دے اور اس کو توبہ کی توفیق عطا فرما دے۔"

جب اس کے پاس حضرت عمرؓ کا خط پہنچا تو وہ اسے بار بار پڑھنے لگا اور کہنے لگا "وہ گناہوں کو معاف کرنے والا، توبہ کو قبول کرنے والا اور سخت سزا دینے والا ہے۔ (اس آیت میں) اللہ نے مجھے اپنی سزا سے ڈرایا ہے اور معاف کرنے کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔"

ابو نعیم کی روایت میں مزید یہ بھی ہے کہ وہ اسے بار بار پڑھتا رہا پھر رونے لگا — پھر اس نے شراب پینی چھوڑ دی۔ اور مکمل طور سے چھوڑ دی۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کی یہ خبر پہنچی تو فرمایا۔

"ایسے کیا کرو جب تم دیکھو کہ تمہارا بھائی پھسل رہا ہے اسے راہ راست پر لاؤ اور اسے اللہ کی معافی کا یقین دلاؤ اور اللہ سے دعا کرو کہ اسے توبہ کی توفیق عطا فرمائے اور تم اس کے خلاف شیطان کے مددگار نہ بنو (اور اسے اللہ کی رحمت سے نا امید نہ کرو۔)

(کذا فی التفسیر۔ ابن کثیر۔ 70)

اقوال زریں

☆ مسکراتا چہرہ معمولی کھانے کو بھی دعوت بنا دیتا ہے۔

☆ اپنے رب پر توکل کرو۔ اگر تم اپنے رب پر توکل کرتے ہو تو یہ بھی جان لو تمہارا رب اس توکل کو کبھی ٹوٹنے نہیں دے گا وہ بہت بے نیاز ہے۔

☆ محبت کی تاثیر عادتوں کو بدل دیتی ہے۔

☆ تم لوگوں کی توقع بے شک پوری کرو مگر کبھی کسی سے توقع مت رکھو۔

لیلیٰ رب نواز۔ ودھے والا بھکر

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

عذرا ناصر ــــــــــــ کراچی

ہمیں بھی آگیا ہنر اس ضبطِ گریز کا
کبھی دامن کو کسی کے سامنے بھگویا نہیں کرتے
محبت جرم ٹھہری، عشق دامن کا داغ لیکن
اہلِ وفا اس داغ کو دھویا نہیں کرتے

مدیحہ نورین مہک ــــــــــــ گجرات

طولِ غمِ حیات سے گھبرا نہ اے جگر
ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہیں

نادیہ اشرف ــــــــــــ راولپنڈی

بہت خاموش لوگوں سے
بہت الجھا نہیں کرتے

رضوانہ شکیل ــــــــــــ لودھراں

اک کرب کا موسم کہ جو دائم ہے ابھی تک
اک ہجر کا قصہ کہ مکمل نہیں ہوتا

فرحانہ مہناز ــــــــــــ گوجرہ

پھر دن تیری یاد کی منڈیروں پہ گزرا
پھر شام ہوئی آنکھ سے آنسو نکل آئے
بے چین کیے رہتا ہے دھڑکا یہی جی کو
تجھ میں نہ زمانے کی کوئی خو نکل آئے

کوثر خالد سودا ــــــــــــ جڑانوالہ

چراغِ دل کو محفل میں جلا کر دیکھ لیتے ہیں
محبت کے تقاضے کو نبھا کر دیکھ لیتے ہیں
لہو میں ڈوبی آنکھیں شہرِ غم میں کون دیکھے گا
ہم اپنے آپ سے خود کو چھپا کر دیکھ لیتے ہیں

آسیہ جاوید ــــــــــــ علی پور چٹھہ

وقت یونہی سب کو آئینہ دکھاتا ہے
کوئی یاد رکھتا ہے کوئی بھول جاتا ہے

جے، آئی، اے ــــــــــــ ڈیرہ غازی خان

وہ جو کہتے تھے محبت ہے تم سے
وہی آج نا آشنا ہوئے بیٹھے ہیں

ریحانہ چوہدری ــــــــــــ مدوکے

اپنے بالوں کی سفیدی سے سہم جاتا ہوں
زندگی اب تیری رفتار سے ڈر لگتا ہے

حمدہ خان ــــــــــــ کراچی

زندہ ہوں ابھی تو مات کیسی
وہی جاں کے عذاب ہیں وہی ہیں
دنیا کے سوال اور دنیا!
وہی میرے جواب ہیں وہی ہیں

شازیہ سعید ــــــــــــ شاہ نکڈر

ترکِ تعلق کی وجہ کچھ تو بتا کر جاتے!
اب کون کون سی میں خود میں برائی ڈھونڈوں

فریحہ شبیر ــــــــــــ شاہ نکڈر

ساتوں دکھ دی قیمت دا کی پتا بلھیا
ساتوں یار منت جو دے دیتے

حمزہ، اقرأ ــــــــــــ کراچی

دعا ہے کہ خدا مجھے پھر سے عروج دے
کہ میں بدلے ہوئے چہروں کو پھر سے بدلتا دیکھوں

فردوس رانی ــــــــــــ ملتان

طے کیا ہے تو کر ہی جانا ہے
دل نے حد سے گزر ہی جانا ہے
ایسا کرتے ہیں تم پہ مرتے ہیں
ہم نے یوں بھی تو مر ہی جانا ہے

ایس این شہزادی کھرل ــــــــــــ چک نمبر 357 جڑانوالہ

اس سے پہلے کہ ثابت ہو جرمِ خاموشی
ہم اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہتے ہیں
کسی کو کیسے بتلائیں بھلا کہ ہم خود بھی اے دوست
تیرے بچھڑنے کے اسباب کم ہی جانتے ہیں

UrduBooks.pk

آسمان کے ستارے

واصفہ سہیل

کی......؟) میرے اپنوں نے مجھے سنبھالا۔(وہی ناں کسی — اپنے) اس لیے میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے دکھ درد بانٹ لینے چاہئیں۔

پسند

ریچل مویکا جی ایک مشہور برانڈ کے میوزک اسٹوڈیو کے حوالے سے تو پہچان رکھتی ہی تھیں۔اب اداکاری کے میدان میں بھی اپنا نام بنانے آ گئی ہیں۔فلم پرواز ہے جنون میں انہوں نے پاک فضائیہ کی کیڈٹ کا کردار کیا ہے۔ریچل کا اس بارے میں کہنا ہے کہ ”مجھے اداکاری پسند ہے (تو گلوکاری؟ کیا ناپسند ہے......؟) میں تھیٹر ڈرامے کر چکی ہوں۔(ہیں......!) میں نے ان کی ہدایت کاری بھی کی ہے۔(اچھا!) لیکن میں نے کبھی فلم میں کام نہیں کیا۔(اب تو کر لیا ناں) اس لیے میں نے سوچا کہ ایسا کر کے بھی دیکھنا چاہیے (پھر......رزلٹ کیا آیا؟) اس

کمزوری

مومنہ مستحسن کہتی ہیں کہ ”اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے خود کو مضبوط بنانے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ہم سب کی زندگی میں کمزور لمحے آتے ہیں۔ہمیں چاہیے کہ ہم دنیا کو یہ بتائیں کہ کسی کی زندگی کبھی مکمل نہیں ہوتی (اس کا فائدہ......؟) میں ہمیشہ اپنے مسائل سے خود نمٹنا چاہتی ہوں لیکن جب کوئی حل نہیں ڈھونڈ پاتی تو ان لوگوں سے رابطہ کرتی ہوں جو میرے قریب ہیں۔(اپنے ہی تو ایسے وقت میں کام آتے ہیں دوسرے تو......؟)

مدد مانگنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔کسی سے مدد مانگنے سے آپ کمزور نہیں ہوتے (پردہ ”کسی“ کون ہے......؟) بلکہ یہ آپ کے انسان ہونے کی نشانی ہے۔(یعنی اگر کوئی مدد نہیں مانگتا تو وہ انسان...... مطلب کیا نشانی پیش کرے اپنے انسان ہونے

لیے جب یہ کردار آفر ہوا تو میں نے فوراً قبول کرلیا کیوں کہ لڑکیوں کے لیے یہ الگ سا کردار تھا۔ اس کی شوٹنگ کے دوران کافی مزا آیا۔ وادیٔ نلتر میں ہماری ٹیم پر بندروں نے بھی حملہ کر دیا تھا۔ (ناراض ہو گئے ہوں گے کہ......؟) ریچل کا کہنا ہے کہ وہ اس کے علاوہ بھی آپ کو دوسری فلم میں نظر آئیں گی (اور گلوکاری کا کیا ہوگا......؟)

دھن

بڑی بڑی آنکھوں والی ایک اداکارہ تھی مونا لیزا۔ اس نے کئی ٹی وی ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ اچانک وہ گم ہو گئی اور کچھ عرصے بعد سارہ لورین کے نام سے پھر آ گئی۔ سارہ لورین کا کہنا ہے کہ ”کامیابی ہمیشہ ان ہی لوگوں کے قدم چومتی ہے جو اپنی منزل کو پانے کی دھن میں رہتے ہیں۔ (کبھی کبھی قسمت بھی کام کر جاتی ہے مونا اوہ سارہ) وہ ہر طرح کی مصیبتوں اور پریشانیوں کا مقابلہ (نام بدلنے کا......؟) کرتے ہوئے ایک دن اپنی منزل پر پہنچ ہی جاتے ہیں (پر آپ تو......؟)

انہوں نے کہا کہ میں ہمیشہ اپنی زندگی میں کچھ

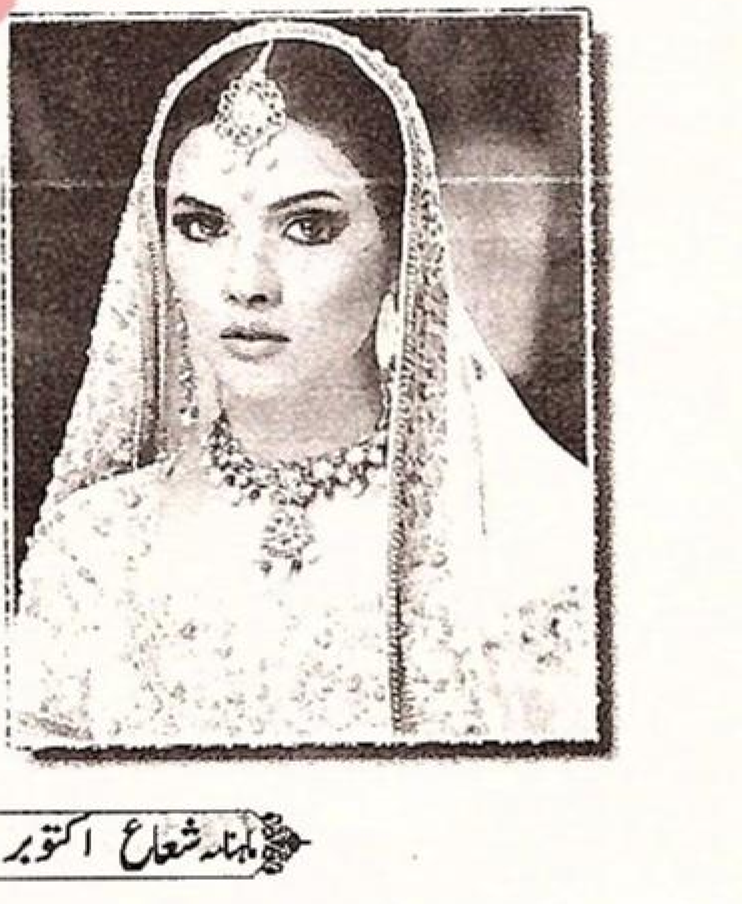

ایسا کرنا چاہتی ہوں جس سے میرا نام تو ہو ہی میرے ملک کا نام بھی ہو۔ (جی آپ کی انڈین فلم دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے) میں جب اس انڈسٹری آئی تو سوچا نہیں تھا کہ اس مقام تک پہنچ جاؤں گی۔ (کس مقام تک......؟) لیکن ذہن میں تھا کہ اپنا کام محنت (آہم) اور ایمان داری سے کرنا ہوگا جو کسی بھی شعبے میں کامیابی کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے۔

تبدیلی

اداکارہ کبریٰ خان برطانوی نژاد پاکستانی ہیں۔ پاکستان آنے سے قبل کے بارے میں وہ کہتی ہیں کہ ان کے ذہن میں یہاں آنے سے پہلے پاکستان کے متعلق بہت سے منفی خیالات موجود تھے۔ (جی یہ المیہ ہے) پاکستان آنے کے بعد میں حیران رہ گئی کہ پاکستان میں ایک عورت کی زندگی اس سے آدھی فیصد بھی بری نہیں ہے جتنی ٹی وی پر دکھائی جاتی ہے۔ (جی کاش یہ بات شرمین عبید چنائے اور ان جیسے لوگ بھی سمجھ لیں، جو ہمیشہ پاکستان کا بدصورت چہرہ دکھا کر آسکر میں پہنچ جاتی ہیں۔)

انہوں نے مزید کہا کہ میں نے اپنی پوری زندگی

UrduBooks.PK

برطانیہ میں گزاری ہے اور میں سمجھتی تھی کہ پاکستان میں بہت تنگ نظر لوگ رہتے ہیں۔ (ٹی وی چینل یہی تو دکھا رہے ہیں) لیکن یہاں آکر اندازہ ہوا کہ میں غلط سوچتی تھی یہاں کے لوگ تو بالکل تنگ نظر نہیں بلکہ ماڈرن ذہنیت کے لوگ ہیں (جی آپ کے برطانیہ سے بھی زیادہ......؟)

مداح

حمزہ فردوس نے رنگریزا کے ذریعے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا۔ حمزہ فردوس اس بارے میں کہتے ہیں کہ اس حقیقت کو تسلیم کرنا ان کے لیے ضروری ہے کہ ہدایت کاری ان کی دوسری ترجیح ہے (یہ آپ کے بتا رہے ہیں ہمیں یا اپنے آپ کو......؟) جب کہ اداکاری ان کا پہلا اور بڑا جنون ہے۔ (یہ بڑا جنون ......مطلب،......؟)

حمزہ فردوس کا کہنا ہے کہ ''کوئی بھی فلم اس نیت سے نہیں بنی چاہیے کہ عید یا بقر عید پر ریلیز ہو کر سو کروڑ کا بزنس کرے۔ (پاکستان میں سو کروڑ کے بزنس کے بارے میں کوئی فلم ساز سوچ بھی نہیں سکتا) کچھ فلمیں فن کو پروموٹ کرنے کے لیے بھی ضروری ہیں۔ (کون سا فن؟)

حمزہ نے مزید کہا کہ وہ اپنی مقبولیت کا ناجائز فائدہ ہرگز نہیں اٹھائیں گے۔ (ہیں ...... مقبولیت ......کون سی ......؟) تاکہ اپنی اہلیت کا سو فیصد اس سیریل کو دے سکیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ انہیں جو کردار ملے اس پر بھرپور توجہ دے سکیں۔ (اس دوران چڑیاں کھیت چگ جائیں گی تو......؟) انہوں نے ان تمام لوگوں کا شکریہ ادا کیا جو ان پر اعتبار کرکے انہیں اچھے (ہیں جی......؟) کرداروں میں کاسٹ کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی وہ اپنے مداحوں کے بھی شکر گزار ہیں جو ان کو پسند کرکے ان کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ (جی! ......کون سے مداح؟)

اِدھر اُدھر سے

☆ کتابیں پڑھے بغیر بھی زندگی گزاری جاسکتی ہے اور کروڑوں لوگ گزار رہے ہیں مگر ایسی زندگی میں کوئی نظریہ ہوتا ہے نہ کوئی سوچی سمجھی رائے، کھوکھلی دانش اور جملے بازی پر گزارا کرتے ہوئے اگر کوئی شخص، کسی ڈنگر کی طرح زندہ رہنا چاہتا ہے تو یہ اس کی مرضی ہے۔ ایسے بندے کا کچھ نہیں بگاڑا جا سکتا۔ (ذرا ہٹ کے۔ یاسر پیرزادہ)

☆ شیخ رشید صاحب اپنی بے ساختہ زبان کے باعث ٹی وی کی ریٹنگ میں سب سے آگے جاتے ہیں۔ ان کے شگفتہ لہجے کے باعث میں نے بھی نوکری سے ریٹائرمنٹ لے لی تھی اور اب پھر یہ سلسلہ ہر وزارت میں چل نکلا ہے۔

(بہت کام رفو کا نکلا...... کشور ناہید)

☆ ٹیلی وژن پر خبر چلی کہ برطانیہ کے وزیراعظم دلی میں بھارت کے وزیراعظم سے ملنے ان کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ ہم سنبھل کر بیٹھ گئے اور اگلے منظر کی راہ تکنے لگے۔ دیکھا کہ ایک عام سے مکان میں ایک معمولی سے کمرۂ ملاقات میں دونوں وزرائے اعظم بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ بیٹھنے کے لیے وہاں بید کی بنی ہوئی کرسیاں رکھی تھیں۔ جن پر شہر کے بازار سے خریدے گئے کشن رکھے تھے۔ وہی بید کی کرسیاں جو عام طور پر چھوٹی صنعتوں سے بن کر نکلتی ہیں۔ وہی کشن جن پر بیٹھا جائے تو وہ دب جاتے ہیں اور ہر بار انہیں پھلانا پڑتا ہے۔ (دوسرا رخ...... علی رضا عابدی)

☆ میرے حساب سے آج اسلام کو جتنے چیلنجز کا سامنا ہے ان میں سرفہرست میڈیا کی یلغار ہے۔ جس پر سو فیصد صیہونیت کا قبضہ ہے۔ یہ میڈیا کے مافیا ہیں جو یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کس قسم کے میڈیا پر کون سی خبریں یا مناظر دکھائے جاتے ہیں اور کن واقعات سے دنیا کو اندھیرے میں رکھنا ہے۔

(حکایتیں نہ شکایتیں۔ اسد مفتی)

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

اکتوبر 2018
کے شمارے سالگرہ نمبر کی ایک جھلک

- ”الف“ عمیرہ احمد کا ناول،
- سمیرا حمید کا مکمل ناول،
- ”جمال زہرہ“ سائرہ رضا کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- ”حالم“ نمرہ احمد کا مکمل ناول،
- فریدہ سیفی اور عفت سحر طاہر کے ناولٹ،
- عطیہ خالد، ربیعہ طارق، میمونہ صدف، عندلیب زہرا اور شازیہ الطاف ہاشمی کے افسانے،
- ”ڈاکٹر شاہد علی زیدی“ سے ملاقات،
- گلوکارہ ”آئمہ بیگ“ سے باتیں،
- ”کرن کرن روشنی“ احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا اکتوبر 2018 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

UrduBooks.pk

امت الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

دنیا کا پہلا طبیب

طب، انسانی زندگی کے لوازمات میں سے ہے اور یہ بھی طے ہے کہ انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کی ابتدا بھی ہوگئی ہوگی، لیکن اس کے باوجود یہ سوالات آج بھی حل طلب ہے کہ دنیا کا پہلا طبیب کون تھا اور یہ فن کس زمانے میں ایجاد ہوا؟ اس سلسلے میں محققین واضح طور پر دو گروہوں میں تقسیم ہیں۔

ایک گروہ کے نزدیک طب اور انسان کا آغاز ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ کیوں کہ اجسام زندگی کا اعتدال، طب کے بغیر مشکل تھا۔ دوسرے گروہ کے ہاں ایجاد طب، خلق انسان کی پیدائش کے بعد کا واقعہ ہے۔

اسی طرح فن طب کی ابتدا پر بھی دو علیحدہ آرا موجود ہیں۔ ایک طبقہ اس امر کا حامی ہے کہ طبابت کا علم بذریعہ وحی انسان کو منتقل ہوا، جب کہ دوسرے طبقے کے خیال میں انسان نے خود ہی اپنے ساتھ بیتنے والے واقعات وحوادث سے یہ علم حاصل کیا۔

علمائے قدیم نے اللہ کے نبی حضرت ادریس علیہ السلام کو بالا تفاق دنیا کا پہلا حکیم قرار دیا ہے، جب کہ ایجاد طب کا سہرا اسقل بیوس کے سر پہنایا ہے۔ ان کے خیال میں ہر دو حضرات کو یہ علوم بذریعہ وحی دیے۔

اب سوال یہ ہے کہ اسقل بیوس پیدا کب ہوا۔ تاریخ الحکما کے مطابق اسقل بیوس یا اسقلا بیوس ان چار بادشاہوں میں سے ایک تھا جنہیں ہرمس اول (حضرت ادریس علیہ السلام) نے چوتھائی زمین کا بادشاہ مقرر کیا تھا۔ اسقل بیوس نے سب سے زیادہ حکمت سیکھی اور پھیلائی۔ یہ اس ربع کا بادشاہ تھا جس پر طوفان نوح کے بعد یونانی قابض ہوگئے تھے۔

حضرت ادریس علیہ السلام کا سن ولادت، یہودیوں کے مطابق تین ہزار دو سو بہتر قبل مسیح، جب کہ جدید تحقیق کے مطابق چالیس ہزار چھ سو اڑتیس قبل مسیح ہے، لیکن دونوں صورتوں میں اسقل بیوس کا تعلق حضرت ادریس سے ثابت نہیں ہوتا۔

صاحبان علم نے مجموعی طور پر آٹھ طبیبوں کو اس زمرے میں شمار کیا ہے جنہوں نے اپنے کمالات سے دنیا کو حیرت زدہ کیا۔ اسقل بیوس اس قبیلے کا سرخیل اور سربراہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ باقی سات اطبا میں غورس، مینس، برمانیدس، افلاطون، اسقل بیوس ثانی، بقراط اور جالینوس شامل ہیں۔

ان تمام اطبا کا عرصہ حیات 613 سال تھا۔ ان 613 سالوں کو 5.011 سال میں جمع کیا جائے تو کل 5.624 سال بنتے ہیں۔ اسقل بیوس اول کی عمر نوّے سال تھی۔ پچاس سال کی عمر میں اس پر علم وعرفان کے دروازے کھلے اور باقی چالیس سال تعلیم وتدریس میں گزارے۔

غورس سینتالیس سال زندہ رہا۔ سترہ سال تک تعلیم حاصل کی اور باقی چالیس سال تدریس میں بسر کیے۔ مینس، چوراسی سال جیا۔ چونسٹھ سال کی عمر تک متعلم رہا، پھر معلم بنا۔ برمانیدس کا عرصۂ حیات چالیس سال تھا۔ پچیس سال تک پڑھتا رہا اور پھر پڑھانا شروع کردیا۔ اسقل بیوس ثانی ایک سو دس سال زندہ رہا۔ ابتدائی پندرہ سال علم کے حصول میں اور باقی نوّے سال نشر علم میں گزارے۔

بقراط نے پچانوے سال کی عمر پائی۔ سولہ

UrduBooks.pk

برس سیکھنے اور اناسی برس سکھانے میں بسر کیے۔ جالی نوس کا عرصۂ حیات ستاسی برس تھا۔ سولہ برس تک علم تلاش کرتا رہا اور اکہتر برس علم بانٹتا رہا۔

کہا جاتا ہے کہ جب ہرمس (حضرت ادریس) کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کی خبر اسقل بیوس کو ملی تو اسے بے حد صدمہ ہوا۔ چنانچہ اس نے ایک معبد میں ہرمس کی باوقار اور پُر عظمت تصاویر بنائیں۔ جن میں انہیں آسمان کی طرف محو پرواز دکھایا گیا تھا۔ اسقل بیوس ان تصاویر کے سامنے یوں باادب ہو کر بیٹھتا گویا کہ خود ہرمس کے سامنے بیٹھا ہو۔ مرتے دم تک وہ ان تصاویر کی تعظیم کرتا رہا۔

روایت ہے کہ بت پرستی کی ابتدا اسقل بیوس کی اسی تصویر پرستی سے ہوئی۔ ادریس کے بیٹے صاب اور بہ قول بعض، ایک شہزادے نے بتوں کو محض اس لیے خدائی درجہ دے دیا تھا کہ اسقل بیوس ان کی تعظیم کرتا تھا۔ جب طوفان نوح کے بعد یونانیوں نے اس خطے پر قبضہ جمایا جہاں اسقل بیوس حکومت کیا کرتا تھا تو ان لوگوں نے شاہی معبد میں وہ تصاویر دیکھیں جن میں سے ایک چوکی پر بیٹھی ہوئی تھی اور دوسری آسمان کی طرف جا رہی تھی تو انہوں نے انہیں اسقل بیوس کی تصاویر قرار دے دیا اور اسی کو پہلا حکیم سمجھنے لگے۔

بقراط اور جالی نوس سمیت متعدد حکما نے اپنی تصنیفات میں اسقل بیوس کا تذکرہ نہایت ادب و احترام سے کیا ہے۔ جالینوس یہ تمنا بھی کرتا ہے کہ کاش میں اسقل بیوس بن سکتا۔

وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ عوام کو علم طب کی طرف مائل کرنے کا بہترین طریقہ طب الٰہی یا طب روحانی ہے جو ہیکل اسقل بیوس سے متعلق ہے۔ بقراط کا کہنا ہے کہ اسقل بیوس، نور کے ایک عمود میں بیٹھ کر آسمان کی طرف اڑ گیا۔

ہروسیس (صاح القصص) بیان کرتا ہے کہ شہر رومیہ کے ایک گھر میں ایک تصویر تھی جو سوالوں کا جواب دیتی تھی۔ قدیم علما کا خیال ہے کہ وہ اسقل بیوس کی تصویر تھی۔ رومیہ کے مجوسیوں کا کہنا تھا کہ تصویر ستاروں کے حساب سے نصب کی گئی تھی اور اس میں سات ستاروں میں سے کسی ایک ستارے کی روح داخل تھی۔ واضح رہے کہ عیسائیت سے پہلے اہل رومیہ (روم) کا مذہب ستارہ پرستی تھا۔

ابن جلجل کی روایت کے مطابق اسقل بیوس، حکیم ہرمس مصر کا شاگرد اور سرزمین شام کا باشندہ تھا۔ جب کہ بقراط کا کہنا ہے کہ فن طب، اسقل بیوس کا خاص علم تھا، جس کے حصول کی اجازت صرف ایسے لوگوں کو تھی جن میں اسقل بیوس کی پاکیزگی، عفت و پرہیزگاری پائی جاتی تھی۔ بدطینت و بداعمال نفوس کو اسے دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔

اسقل بیوس کے متعلق کئی قصے مشہور ہیں جنہیں صاحبان علم نے بے ہودہ قرار دیا ہے۔ افلاطون اپنی کتاب نوامیس میں لکھتا ہے کہ ایک دفعہ اسقل بیوس معبد میں محو عبادت تھا کہ ایک مرد اور عورت اس بچے کے متعلق جو ابھی عورت کے رحم میں تھا، جھگڑا لے کر آئے۔ اسقل بیوس نے اس عورت سے کہا۔

”کہ تمہارا خاوند آفتاب پرستوں کے معبد میں تمہاری سلامتی و بقا کی دعائیں مانگ رہا تھا اور تو فلاں قبیلے کے ایک غلام کے ساتھ تھی۔ یہ بچہ اسی غلام کا ہے اور تو چار ماہ کے بعد ایک بدشکل بچہ جنے گی۔ چنانچہ جب وہ بچہ پیدا ہوا تو اس کے ہاتھ سینے کے اندر تھے۔ اس کے بعد مرد سے کہا کہ تجھے ایسی عورت سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

افلاطون نے اسی کتاب میں ایک اور چھوٹی سی حکایت درج کی ہے کہ ایک آدمی اپنا مال اِدھر اُدھر چھپا کر اسقل بیوس کے پاس آیا اور شکایت کی۔

”کہ میرا مال ضائع ہوگیا ہے، دادرسی فرمائیے۔“

اسقل، بیوس اس کے ہمراہ گیا اور جہاں مال

UrduBooks.pk

چھپا ہوا تھا، وہاں پہنچ کر کہنے لگا۔
"تمہارا مال یہ ہے اور یاد رکھو کہ جو شخص اللہ سے اللہ کی نعمتوں کے متعلق تمسخر کرتا ہے، اس سے اللہ وہ نعمتیں چھین لیتا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ تم سے یہ سب مال چھین لیا جائے گا۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

بقراط کہتا ہے کہ اسقل بیوس کی لاٹھی خطمی پودے کی تھی اور اس پر سانپ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ جالی نوس لکھتا ہے کہ خطمی کی تاثیر سرما و گرما ہر دور میں معتدل رہتی ہے۔ چونکہ اسقل بیوس، رنج و راحت میں اعتدال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا، اس لیے خطمی (یہ ایک جھاڑی ہے جو دلدل کے قریب اُگتی ہے، جب کہ اس کی جڑ سے مٹھائی بنتی ہے۔) کی لاٹھی اسے زیب دیتی تھی۔

سانپ کی تصویر اس لیے کہ سانپ کی عمر باقی تمام حیوانات سے لمبی ہوتی ہے۔ یہ اشارہ تھا اس وقت کی طرف کہ علم کی دولت غیر فانی ہے جو ضائع ہوسکتی ہے، نہ مٹ سکتی ہے۔

جالینوس نے اسقل بیوس کی تصویر جو اس کے معبد میں موجود تھی، کا حلیہ یوں بیان کیا ہے کہ ایک مرد، داڑھی اُگی ہوئی، گھنے اور لمبے بال، آستینیں چڑھائی ہوئی۔ (یہ اشارہ تھا اس امر کی طرف کہ طبیب، فلسفہ سیکھنے کے لیے ہر وقت تیار رہیں۔) ہاتھ میں خطمی کی ٹیڑھی اور گرہ دار لاٹھی ہے۔ یہ اشارہ ہے، اس حقیقت کی طرف کہ طب کے صحیح استعمال سے انسان لمبی عمر پاتا ہے۔ یہاں تک کہ عصا کا محتاج ہوجاتا ہے۔ نیز عصا سے اہل غفلت کو ہوشیار کرنا بھی مطلوب ہے۔ خطمی کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ یہ تقریباً ہر مرض کا علاج ہے۔

اسقل بیوس کے سر پر غار کی پتیوں کا تاج تھا۔ درخت غار کی تاثیر یہ ہے کہ غم کو دور کر دیتا ہے۔

یونانی المیہ نگار سوفوکلیز

کہا جاتا ہے کہ آج کی دنیائے ادب میں صرف تین عظیم المیہ نگار گزرے ہیں۔ یہ ان میں سے ایک ہے

وہ آج سے تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل پیدا ہوا یعنی 496 قبل مسیح میں۔ یونان کے شہر ایتھنز سے چند میل کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں کولونس ہے۔ وہ نہایت خوب صورت آدمی تھا اور بہترین ایتھلیٹ تھا مگر اسے موسیقی سے بہت دلچسپی تھی۔ اس زمانے میں ڈرامے کے باوا آدم ایسچیلس کا بڑا شہرہ تھا۔ اس نے چھبیس سال کی عمر میں اپنا پہلا ڈراما لکھا اور ایسچیلس کے مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا۔

اس نے کوئی سو ڈرامے لکھے اور اس زمانے میں منعقد ہونے والے انعامی مقابلوں میں اٹھارہ مرتبہ اس کے ڈرامے اول انعام کے مستحق ٹھہرے۔ اس کی آواز کچھ نسوانی سی تھی۔ اس نے اپنے ڈرامے میں ایک نسوانی کردار کا پارٹ خود ادا کیا اور اپنی اداکاری سے لوگوں کو ششدر کر دیا۔ اس زمانے کی دو مشہور شخصیتیں جن کے ناموں سے آج بھی دنیا آگاہ ہے، اس کے دوستوں میں سے تھیں۔ یعنی مشہور سیاست داں پیری کلیز اور مشہور مورخ ہیروڈوٹس۔

اس کی عمر لمبی تھی۔ نوے سال کی عمر میں اس کی زندگی کی جھیل میں ایک بھاری پتھر گرا۔ پتھر پھینکنے والا خود اس کا اپنا بیٹا تھا جس کا نام لوفور تھا۔ وہ خود بھی ڈراما نویس تھا اور اپنے باپ سے بے حد حسد کرتا تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ اس کا باپ اب بہت ضعیف ہو چکا ہے اور اب اچھے ڈرامے لکھنا اس کے بس کی بات نہیں۔ تب بوڑھے باپ نے ایک آخری ڈراما لکھا۔ اس کے لکھے اس ڈرامے کا نام تھا "ایڈی پس ایٹ کولونس" یہ اس کا بہترین ڈراما سمجھا جاتا ہے۔ یونانی دیومالا سے لیے ہوئے کردار ایڈی پس کی کہانی کو اس نے کچھ اس طرح ڈرامائی شکل دی تھی کہ یہ کردار یادگار بن گیا ہے۔ یہ وہی ایڈی پس ہے، جس نے نادانستگی میں اپنے باپ کو قتل کردیا تھا اور اپنی ماں سے شادی کرلی تھی۔ جب اسے حقیقت معلوم ہوئی تو اس نے حکومت چھوڑ دی اور اپنی آنکھیں پھوڑ

لیں اور گھر سے ٹھوکریں کھانے کے لیے نکل گیا۔ اگر آپ نے نفسیات پڑھی ہے تو آپ اس ”کامپلیکس“ سے ضرور واقف ہوں گے‘ جسے اصطلاحاً ”ایڈی پس کامپلیکس“ کہا جاتا ہے۔ تقدیر کا مرتب کیا ہوا یہ المیہ اس کا عظیم ترین شاہکار ہے‘ جو ارسطو کی نظر میں ایک ”ماڈل المیہ“ ہے۔

نقادوں نے اس کی زندگی کے گہرے شعور‘ زبانی ڈکشن اور اسلوب کی بنا پر اسے ”قدیم شیکسپیئر“ کا خطاب دیا ہے۔ ان کا خیال ہے اسی کی روح تھی جو شیکسپیئر کی شکل میں دوبارہ اس دنیا میں ظاہر ہوئی تھی۔ یہ ایک الگ بات ہے‘ ایک آدھ ڈراما نقادوں نے اس کے بارے میں کچھ مختلف رائے دی ہے۔ مثلاً ایڈتھ ہملٹن نے...... وہ لکھتی ہے۔

”بے شک اس کے پاس خوب صورت کاریگری اور شاعرانہ اظہار کی زبردست صلاحیتیں موجود تھیں مگر پھر بھی وہ عظمت کی ان بلندیوں پر نہیں کہا جاسکتا جو ایسچیلس اور شیکسپیئر کو حاصل تھیں۔“ لیکن اسی رو میں ”ورلڈ ڈراما“ کے مشہور نقاد ”الارڈائس نیکول“ کا کہنا ہے...... ”اگر ایسچیلس کو مارلو کے ہم پلہ کہا جائے تو اسے بھی شیکسپیئر کے برابر کہنا پڑے گا۔“

کچھ بھی ہو‘ یہ وہی تھا جس نے ایڈی پس کا المیہ لکھ کر ایک پرانے یونانی لیجنڈ کو اپنے فنکارانہ اسلوب سے شاہکار اور لافانی بنادیا۔ اس عظیم ڈراما نگار کا نام ہے ”سوفوکلیز!“

چنگیز خان اور سکندر اعظم کی قبریں

تاریخ اسلام میں ہے کہ چنگیز خان کا انتقال ہونے لگا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

”جب میں مرجاؤں تو مجھے فلاح درخت کے نیچے دفنا دینا‘ انتقال ہوا‘ درخت کے نیچے دفنا دیا گیا‘ اتفاق سے دوسرے روز سے بارش شروع ہوئی اور چھ ماہ تک بارش ہوتی رہی۔ وہ جگہ جنگل میں تبدیل ہوگئی اور وہ درخت جنگل میں گھر گیا‘ لوگوں کو یاد نہ رہا کہ چنگیز خان کو کس درخت کے نیچے دفنایا گیا ہے۔

وہ ظالم قوم جنہوں نے بیک وقت بیس لاکھ انسانوں کو قتل کیا‘ جو گھوڑے کی پشت سے تین‘ تین روز تک نہیں اترتے تھے۔ پیاس لگتی تو گھوڑے کی پشت پر خنجر مارتے‘ کٹورا ساتھ ہوتا کٹورے کو خون سے بھرتے اور پی جاتے یہ ان کا پانی تھا۔ آج ان کے سردار کی قبر کا ٹھکانہ نہیں ہے۔

خطبات حکیم الاسلام میں مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمتہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ ”سکندر کی قبر عراق کے بابل کے کھنڈرات میں ہے‘ لیکن قبرستان میں کوئی صحیح قبر نہیں بتا سکتا۔“

جب کوئی سیاح سیر وتفریح کو جاتا ہے تو وہاں کے گائیڈ کچھ قبروں کی طرف اشارہ کرکے بتاتے ہیں‘ انہی قبروں میں سے ایک قبر سکندر اعظم کی ہے۔

(عینی سحر...... کانگڑہ کالونی‘ ہری پور)

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

حلیم

اجزاء:۔

گائے کا گوشت	ایک کلو
گیہوں	آدھا پاؤ
جو	آدھا پاؤ
گندم	آدھا پاؤ
چنے کی دال	ایک کپ
مونگ کی دال	ایک چوتھائی کپ
مسور کی دال	ایک چوتھائی کپ
ماش کی دال	ایک چوتھائی کپ
گھی	دو کھانے کے چمچے
پسا ہوا ادرک لہسن	دو کھانے کے چمچے
پیاز (تلی ہوئی)	آدھا کپ
نمک	دو کھانے کے چمچے
پسی لال مرچ	تین کھانے کے چمچے
ہلدی	ایک کھانے کا چمچہ
پسا دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
دہی	ایک کپ
تیل	دو کھانے کے چمچے
گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب:۔

گیہوں اور جو کو رات بھر کے لیے کسی کھلے برتن میں پانی میں بھگو کر رکھیں اور صبح ابال لیں، پھر اسے پیس لیں۔ اب تمام دالوں کو چار سے پانچ گلاس پانی کے ساتھ پکائیں، یہاں تک کہ دالیں گل جائیں۔ ٹھنڈی ہونے پر انہیں پیس لیں یا گھونٹ لیں۔ دیگچی میں ایک کپ تیل گرم کرکے اس میں پیاز ڈال کر کچا پکا کرلیں پھر اس میں ادرک لہسن کا پیسٹ ڈال کر دو منٹ پکائیں اور گوشت ڈال کر بھونیں۔ پھر نمک، پسی لال مرچ، ہلدی، پسا دھنیا اور دہی ڈال کر اچھی طرح ملا کر پانی ڈال دیں۔ جب گوشت گل جائے تو ہاون دستہ سے گوشت اچھی طرح کچل لیں اور اس میں پسی ہوئی دالوں کو ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے کے لیے رکھ دیں اور چمچہ چلاتی رہیں تاکہ گوشت اور دالیں یکجان ہوجائیں۔ جب حلیم گاڑھا ہوجائے تو چولہا بند کردیں۔ پیاز کا بگھار، لیموں، ہری مرچ اور دھنیا کے ساتھ پیش کریں۔

کڑاہی پسندے

اجزاء:۔

پسندے	ایک کلو
پپیتا	ایک کھانے کا چمچہ
پسی لونگ	آٹھ عدد
پسی ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
پسی کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
دہی	ایک پاؤ
پیاز	تین عدد
پسی مرچ	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:۔

پسندوں پر ادرک، پپیتا اور نمک لگا کر دو تین گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اس کے بعد تمام مسالے پیس کر اس میں شامل کریں۔ پیاز کو باریک کاٹ کر تل لیں اور چورا کرکے اس میں ملا دیں۔ کڑاہی میں تھوڑا سا تیل ڈال کر پسندوں کو ایک ایک کرکے تل لیں۔ جب دونوں طرف سے سنہری ہوجائیں تو اتار کر گرما گرم پیش کریں۔

UrduBooks.uk

کھٹا سالن

اجزاء:۔

مرغی	ایک کلو
پسے ٹماٹر	دو کپ
املی کا رس	آدھا کپ
تیز پات	دو عدد
رائی	ایک چائے کا چمچہ
نمک	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
پسا ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
پسی پیاز	ایک کپ
پسا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت
ہرا دھنیا	حسب ضرورت
ہری مرچیں	حسب ضرورت

مرغی میں پسی ہوئی پیاز، نمک، ہلدی، ادرک لہسن ڈال کر بھون لیں۔ جب چکن گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو چولہا بند کر دیں۔ اب پین میں تیل گرم کر کے اس میں کڑی پتا، تیز پات، رائی، پسا گرم مسالا، املی کا رس اور ٹماٹر ڈال کر دو سے تین منٹ کے لیے بھون لیں اور اس میں مرغی ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ آخر میں ہرا دھنیا اور ہری مرچیں ڈال کر پیش کریں۔

چکن بھنا مسالا

مرغی	ایک کلو
ٹماٹر	دو عدد
پیاز	ایک عدد
دہی	آدھا پاؤ
کٹی لال مرچ	دو کھانے کے چمچے
پسی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی	ایک کھانے کا چمچہ
زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
ہرا دھنیا	ایک چوتھائی گٹھی
نمک	حسب ذائقہ
پسا لہسن ادرک	دو کھانے کے چمچے
تیل	آدھا کپ

چکن کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ دیگچی میں گھی گرم کر کے ادرک اور لہسن ڈال دیں، جب سنہرا ہونے لگے تو اس میں چکن شامل کر کے بھوننا شروع کر دیں۔ دوسری جانب پیاز، ٹماٹر اور پودینہ ڈال کر آمیزہ تیار کر لیں۔ پھر دہی اور تیار شدہ آمیزے کو آپس میں اچھی طرح ملا دیں اور اس میں چکن شامل کر دیں اور ساتھ ہی پسی ہوئی لال مرچ، ہلدی، زیرہ، کٹی ہوئی لال مرچ اور نمک کو شامل کر دیں۔ پھر اس میں ایک کپ پانی ڈال کر دوبارہ بھونیں۔ جب پانی خشک ہو جائے تو آخر میں ہرا دھنیا چھڑک کر پیش کریں۔

فالودہ

اجزاء:۔

دودھ	ایک گلاس
چائنیز نوڈلز	حسب ضرورت
تخم بالنگا	نصف چائے کا چمچہ
پستہ قلفی یا سادہ آئس کریم	حسب پسند

ترکیب:۔

تخم بالنگا کو ایک گھنٹے کے لیے پانی میں بھگو دیں۔ نوڈلز کو پندرہ منٹ تک پانی میں ابال لیں۔ پھر کچھ دیر خشک کرنے کے بعد دھیمی آنچ پر دودھ میں پانچ سے دس منٹ تک ابال لیں۔ اب چولہا بند کر دیں اور نوڈلز کو ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ چاہیں تو جلد ٹھنڈا کرنے کے لیے ان میں برف بھی ڈال سکتے ہیں۔ ٹھنڈے نوڈلز گلاس میں ڈالیں۔ پھر حسب پسند سرخ یا ہرا شربت، دودھ اور کٹی ہوئی برف ڈال کر مکس کر لیں۔ آخر میں ایک یا دو چمچے آئس کریم ڈال دیں، مزے دار فالودہ تیار ہے۔

UrduBooks.pk

ادارہ

حسین ضرور بنیے

آپ کے ہاتھ اور پاؤں کی جلد آپ کی توجہ چاہتی ہے

خواتین اکثر تقریبات میں اپنے چہرے پر توجہ دیں گی لیکن ہاتھ، پاؤں کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتی ہیں۔

ہم نے خود اکثر لوگوں کو اپنے ہاتھ پاؤں کو چھپاتے دیکھا ہے لیکن آپ انہیں کیوں چھپائیں، جب ذرا سی محنت ان کو قابل توجہ بنا سکتی ہے۔

اب اگر آپ کچن میں کام کرتی ہیں تو موئسچرائزر کو کچن میں کسی نمایاں جگہ پر رکھ لیں تاکہ حسب ضرورت اسے لگا سکیں۔

اگر آپ جاب کرتی ہیں تو اپنی میز کی دراز میں موئسچرائزر رکھ لیں۔

خاص کر باورچی خانے میں کام کرنے والی خواتین غسل کے بعد ضرور موئسچرائزر استعمال کریں۔

غسل کرتے وقت جس صابن سے جسم دھوئیں اسی سے کلائیاں بھی اچھی طرح دھوئیں، ہو سکے تو برتن دھونے کے لیے دستانے استعمال کریں۔

دھوپ میں جاتے وقت دستانے ضرور استعمال کریں کیونکہ سورج کی تپش آپ کی جلد کو جھلسا دیتی ہے۔

لیموں کا رس ہاتھوں کے لیے بے حد مفید ہے۔ اسے کہنی، ایڑی پر مسلسل لگاتے رہنے سے نہ صرف جلد نرم ہوتی ہے، بلکہ نکھر بھی جاتی ہے۔

ناخن پندرہ دن بعد ضرور کاٹیں، ہاں اگر دانتوں سے کاٹنے کی عادت ہے تو فوراً ترک کریں کیونکہ یہ نہ صرف آپ کے ہاتھوں کو بدصورت کرتی ہے بلکہ آپ کی شخصیت کو کنفیوز ظاہر کرتی ہے۔ ناخن کاٹنے کے لیے نیل کٹر استعمال کریں۔

ناخنوں پر ہر وقت نیل پالش کا استعمال ان کو خراب کرتا ہے، اس لیے اس کے بے جا استعمال سے گریز کریں، نہ صرف یہ بلکہ ہلکے رنگوں کی اور اچھی کمپنی کی نیل پالش استعمال کریں۔

نیل پالش کا استعمال ہاتھوں پیروں کے لیے ہمیشہ اپنی جلد کی مناسبت سے استعمال کریں کیونکہ ضروری نہیں کہ ایک رنگ جو آپ کی دوست کے ہاتھوں پر اچھا لگ رہا ہے وہ آپ کے ہاتھوں پیروں پر بھی اچھا لگے۔

ناخن کو صابن ملے گرم پانی میں ڈبوئیے اور چار پانچ منٹ تک ناخن ڈبوئے رکھیے، اس طرح ناخن ٹوٹنے سے محفوظ رہتے ہیں۔

چمک دار جلد

صحت مند جلد نہ تو خشک ہوتی ہے اور نہ ہی چکنی۔ دیکھنے میں وہ صاف ستھری، روشن اور تنی ہوئی نظر آتی ہے۔ روزانہ دو لیٹر پانی پینے، تازہ سبزیاں، پھل، دہی، چھاچھ اور مچھلی کھانے سے آپ کی جلد بھی صحت مند رہے گی اور جسم بھی۔ اس طرح پریشان کن کیفیت، جنک اور فاسٹ فوڈ، مزاج کی تلخی اور راتوں کو دیر تک جاگنے سے بھی ب ہوتی ہے۔ خاطر خواہ گہری نیند سونا بھی ہے۔

اگر آپ چار ہفتوں تک گہری نیند نہ سو سکیں تو ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔ جب بھی وقت ملے، دوپہر کے کھانے کے بعد ایک گھنٹہ سو لیں۔

URDUBOOKS.PK